حماقتیں

شفیق الرحمٰن

ماورا

نیلی جھیل

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب رُوفی کے دانت پر بجلی گری۔ رُوفی (جن کو بعد میں شیطان کا نام ملا)، بجلی سے بہت ڈرتے تھے۔ جب بادل آتے تو وہ بستروں میں چھپتے پھرتے۔ سب کہتے کہ اگر بجلی کو گرنا ہے تو ضرور گرے گی۔ روفی جواب دیتے۔ بے شک گرے، لیکن اس طرح کم از کم اسے مجھ کو ڈھونڈنا تو پڑے گا۔ ہوا یوں کہ بارش ابھی ابھی تھمی تھی۔ روفی صوفے کے پیچھے سے نکل کر دبے پاؤں برآمدے تک گئے۔ یہ دیکھنے کہ بادل چھنٹ گئے یا نہیں۔ اتنے میں زور سے بجلی کوندی اور ایک عظیم الشان دھماکا ہوا۔ جب وہ ہوش میں آئے تو ان کا ایک دانت ہل رہا تھا۔ انہوں نے آئینہ دیکھا تو دانت کا کچھ حصّہ سیاہ نظر آیا۔ اگلے روز آس پاس مشہور ہو گیا کہ رات روفی میاں کے دانت پر بجلی گری ہے۔ وہ دو دن تک بستر پر پڑے رہے۔ لیکن اس طرح ہم اپنے آنے والے سہ ماہی امتحان سے نہ بچ سکے۔ اس کم بخت امتحان نے ہماری نیند اُڑا رکھی تھی۔ ماسٹر صاحب نے ہمارے ساتھ خاص رعایت کی اور از راہِ کرم امتحان چند دنوں کے لیے ملتوی کر دیا۔

ہمارے ماسٹر صاحب بڑے خونخوار قسم کے آدمی تھے۔ یوں تو وہ بیچلر آف آرٹس تھے، لیکن ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ شادی شدہ ہیں اور کئی بچّوں کے باپ ہیں۔ وہ اُن حضرات میں سے تھے جو آپ سے سوال پوچھیں گے، آپ کی طرف سے خود جواب دیں گے۔

اور پھر آپ کو ڈانٹیں گے بھی کہ جواب غلط تھا۔ ان کے نوکر کی زبانی معلوم ہوا کہ انہیں نیند میں بولنے اور چلنے پھرنے کی بیماری تھی اور وہ سوتے ہوتے پیدل چلا کرتے تھے، حالانکہ ان کے پاس ایک تانگہ تھا اور ایک سائیکل۔ انہیں کھیل کود کا شوق بھی تھا لیکن فقط اتنا کہ ریفری بن کر خوش ہو لیا کرتے۔ ایک مرتبہ وہ فٹ بال کے میچ میں ریفری تھے کہ یک لخت جوش میں آ گئے اور گیند لے کر خود گول کر دیا۔ رُونی کے ابا ہمیشہ ان سے کہا کرتے تھے کہ ماسٹر صاحب آپ اس علاقے میں فٹ بال کے نمبر دو کھلاڑی ہیں، ایک روز ماسٹر صاحب نے ان سے پوچھا کہ نمبر ایک کھلاڑی کون ہے؟ وہ بولے، پتہ نہیں۔

ساری کلاس کا امتحان ہو چکا تھا۔ صرف میں اور رونی رہتے تھے۔ نچلی جماعتوں میں رُونی کے چھوٹے بھائی ننھے میاں باقی تھے، کیونکہ اس بجلی کے گرنے کے سلسلے میں وہ بھی بطور تیمار دار شریک تھے۔

میں اور رونی مجرموں کی طرح کمرے میں داخل ہوئے۔ ماسٹر صاحب نے ہمیں بتایا کہ وہ ہمارا فقط زبانی امتحان لیں گے اور بالکل آسان سے سوال پوچھیں گے۔ گھبرانے یا ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

انہوں نے رُونی سے پوچھا "تمہیں کس نے بنایا؟"

رُونی ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولے "جناب اتنا تو مجھے خدا نے بنایا تھا۔ اس کے بعد میں خود بڑھا ہوں۔"

"اس وقت تم ایک چھوٹے سے لڑکے ہو، جب بڑے ہو گے تو کیا بنو گے؟"

"میں انسان بنوں گا۔"

"تم نے ایسی عجیب آنکھیں کہاں سے پائیں؟"

"جی — یہ چہرے کے ساتھ ہی آئی تھیں۔"

اب ماسٹر صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے "بتاؤ ہاتھی کہاں پائے جاتے ہیں؟"

"جناب ہاتھی اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ان کے کھوئے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"میرا مطلب ہے کہ ہاتھی ملتے کہاں ہیں؟"

"جہاں اور ہاتھی ہوں — وہاں۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ ہاتھیوں کا حافظہ بے حد تیز ہوتا ہے اور وہ کبھی نہیں بھولتے؟"

"جی ہاتھیوں کے پاس یاد رکھنے کے لیے باتیں ہی کون سی ہوتی ہوں گی۔"

"اچھا! — لومڑی کی کھال کا کیا فائدہ ہے؟"

"لومڑی کو گرم رکھتی ہے۔"

ماسٹر صاحب کا چہرہ رونی کی طرف پھر گیا "اگر ایک شخص نے ایک اُلو پندرہ روپے تین آنے ایک پائی میں خریدا اور سات روپے دس آنے ساڑھے گیارہ پائی میں بیچ دیا۔ تو اسے کتنا نقصان ہوا؟"

"جناب میں نے آج تک اُلو اتنا مہنگا بکتا نہیں دیکھا۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"اور تم نے؟"

"میں نے کبھی اُلو دیکھا ہی نہیں۔" رُونی بولے۔

"غضب خدا کا۔ تو آج تک تم نے اُلو نہیں دیکھا۔ (چلا کر) میری طرف دیکھو۔ نیچے کیا دیکھ رہے ہو۔ اچھا میں سوال پھر دوہراتا ہوں۔"

ماسٹر صاحب نے سوال دوہرایا۔ "بتاؤ کتنا نقصان ہوا؟"

"جی روپوں میں نقصان ہوا اور آنے پائیوں میں نفع۔" رُونی بولے۔

"اچھا، آج تم نے جو سب سے عجیب واقعہ دیکھا ہو بیان کرو۔"

"جناب، آج میں نے چند آدمیوں کو ایک گھوڑا بناتے دیکھا۔"

"لکڑی کا گھوڑا؟"

"جی نہیں اصلی گھوڑا، جیتا جاگتا گھوڑا۔ لیکن جب میں نے دیکھا تو وہ تقریباً اسے مکمل

کر چکے تھے اور اس کے کھُروں میں میخیں ٹھونک رہے تھے۔"

"ثابت کرو کہ قلم تلوار سے اہم ہے۔"

"جناب۔ تلوار سے چیک پر دستخط نہیں کیے جا سکتے۔"

ماسٹر صاحب کچھ کچھ خفا ہو چلے تھے۔ اُنہوں نے میری طرف دیکھا اور بولے:

"آسٹریلیا کہاں ہے؟"

"جی جغرافیے کے پچاسویں صفحے پر۔"

"جغرافیے میں نہیں، ویسے کہاں ہے؟"

"جناب آسٹریلیا کرۂ ارض پر ہے۔"

"تربوز کے فوائد بیان کرو۔"

"تربوز ایک ایسا پھل ہے جسے کھا بھی سکتے ہیں، پی بھی سکتے ہیں ـــ اور اس سے ہاتھ منہ بھی دھو سکتے ہیں۔"

"اور ناریل؟"

"جی ناریل پر ٹکٹ لگا کر اور پتہ لکھ کر بطور پارسل کے بھیج سکتے ہیں۔"

"اچھا حروفِ اضافت کیا ہوتے ہیں؟"

"جناب حروفِ اضافت وہ ہوتے ہیں جو اضافہ کرتے ہیں اور جنہیں پڑھ کر کچھ اور حروف یاد آجاتے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً گھڑی ساز یوں معلوم ہوتا ہے جیسے زمانہ ساز ہو۔ پالتو، فالتو معلوم ہوتا۔ مجرّد، مجرّب اور طبلہ نواز، بندہ نواز معلوم ہوتا ہے اور۔"

"بس بس۔" ماسٹر صاحب بالکل خفا ہو گئے۔

اب ننھے میاں کو بلایا گیا۔

"ننھے گنتی گن کر دکھاؤ۔" ماسٹر صاحب بولے۔

"ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، دس، غلام، بیگم اور بادشاہ۔" ننھے نے فاتحانہ انداز سے کہا۔

اس میں غریب ننھے کا بھی قصور نہیں تھا۔ ان دنوں گھر میں تاش خوب ہوتی تھی۔ شام کو ماسٹر صاحب ہمارے ہاں آتے۔ رُونی کے ابّا سے دیر تک باتیں ہوتی رہتیں۔ سونے کے وقت ہمیں سنایا گیا کہ ہماری تعلیمی حالت بہت کمزور ہے۔ چنانچہ ماسٹر صاحب ہمیں گھر پر پڑھانے آیا کریں گے۔ اس خبر نے ہمیں اُداس کر دیا۔

اگلے روز اتوار تھا۔ علی الصبح ہم نے مچھلیاں پکڑنے کا سامان لیا اور جھیل کا رُخ کیا۔ اس ٹیوشن کی نئی مصیبت نے ہمیں غمگین کر دیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جو رہی سہی آزادی میسّر تھی وہ بھی چھن گئی ہے۔

جھیل کے شفاف اور نیلے پانی پر ہلکی ہلکی دُھند چھائی ہوتی تھی۔ دُور بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوا میں تیر رہے تھے۔ کناروں پر پھُولدار بیلیں اور پودے جھکے ہوئے تھے اور اور بے شمار تتلیاں اُڑ رہی تھیں۔ جھیل کے کنارے دُور دُور تک چلے گئے تھے۔ دُوسرا کنارہ بہت دُور تھا اور کبھی کبھار ہی دکھائی دیتا۔ جب بارش تھمی ہو یا دن بالکل صاف ہو تو ہر بار کسی نئی شکل میں دکھائی دیتا۔ کبھی دُور دُور تک محل اور قلعے دکھائی دیتے۔ کبھی گھنے اور سرسبز باغ، اور کبھی ریت کے ٹیلے اور نخلستان نظر آتے۔

ہم ہر اتوار جھیل کے کنارے گزارتے۔ بڑے اہتمام سے مچھلیاں پکڑنے کا پروگرام بنتا۔ مچھلیاں بھُوننے کا سامان بھی ساتھ ہوتا۔ ہمارے مچھلیاں پکڑنے کے طریقے بھی صحیح تھے، لیکن ہم نے کبھی وہاں ایک بھی مچھلی نہیں پکڑی۔ انجینئر صاحب اور ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا

کہ اس جھیل میں مچھلیاں بالکل نہیں ہیں جھیل کے پانی میں کوئی خرابی تھی ۔معدنیات کے کچھ ایسے اجزا شامل تھے جن میں مچھلیاں زندہ نہیں رہ سکتی تھیں لیکن ہمیں اس پر بالکل یقین نہ آیا۔ ایسی خوشنما جھیل میں تو مچھلیاں دُور دُور سے آکر رہیں گی۔

ہم اُداس ہوتے یا ہمیں دھمکایا جاتا تو ہم سیدھے جھیل کا رخ کرتے۔ بنسیاں پانی میں ڈال کر گھاس اور پھُولوں میں بیٹھ جاتے۔ بادشاہوں، پریوں اور بحری ڈاکوؤں کی کہانیاں پڑھتے۔ ذرا سی دیر میں ہم بھول جاتے کہ اس خوبصورت گوشے کے علاوہ دُنیا کے اور حصے بھی ہیں جہاں سکول بھی ہیں۔ سکول کا کام ہے۔ ماسٹر صاحب کی ڈانٹ ہے، گھر والوں کی گھُرکیاں ہیں۔

ہم دوسرے کنارے کی باتیں کرتے جسے دیکھنے کا ہمیں بے حد شوق تھا ـــــ ہم قیاس آرائیاں کرتے کہ وہاں کیا کچھ ہوگا۔ شاید وہاں کسی اور قسم کی دنیا ہوگی۔ کس طرح کے لوگ ہوں گے۔ ہم نے کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ کہیں سے ایک کشتی لے کر چپکے سے نکل جائیں اور جھیل کو عبور کرکے دوسری طرف جا پہنچیں لیکن ہمیں کشتی نہ مل سکی۔ ہمیں تیرنا نہیں آتا تھا۔ کنارے کنارے چل کر دوسری طرف جانا ناممکن تھا کیونکہ راستے میں کئی رکاوٹیں تھیں۔

جب ہم چاندنی رات میں جھیل کے کنارے بیٹھ کر ایک دوسرے کو پریوں کی کہانیاں سناتے تو جیسے سارے کردار ہماری آنکھوں کے سامنے چلنے پھرنے لگتے۔ چاندنی کچھ یُوں بدل جاتی اور دوسرا کنارا ایسا پُرسحر خطہ معلوم ہونے لگتا کہ ہم سچ مچ پریوں کے مُلک میں پہنچ جاتے۔

دن میں جب سمندری لُٹیروں کی کہانیاں پڑھی جاتیں تو ہمارا لباس بھی لُٹیروں جیسا ہوتا۔ سر پر سیاہ رومال باندھے جاتے۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں بنا کر جھیل میں چھوڑی جاتیں، ہوائی بندوقوں اور پٹاخوں سے جھوٹ موٹ کی جنگ ہوتی۔ ایک فرضی جزیرے پر قبضہ کیا جاتا۔ وہاں سے خزانہ برآمد ہوتا۔ جب تیز دُھوپ نکلتی، بھونرے گانے لگتے، ہوا رُک جاتی اور طرح طرح کی خوشبوئیں فضا میں رچ جاتیں تو ہم آنکھیں بند کئے غنودگی میں رنگ برنگے

خواب دیکھتے رہتے۔

اگر وہ جھیل وہاں نہ ہوتی تو نہ جانے ہمارے دن کیونکر گزرتے۔ کیونکہ گھر میں ہر ایک ہم دونوں کا دشمن تھا اور ڈانٹنے پر تلا ہوا تھا۔ ان کا رویّہ یہ تھا کہ اگر کچھ کیا ہے تو کیوں کیا ہے اور اگر نہیں کیا تو کیوں نہیں کیا۔ ان دنوں سب کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ ہم دونوں نہایت نالائق ہیں اور بالکل نہیں پڑھتے۔ ابّا کا تبادلہ حسبِ معمول آبادی سے دُور کسی ویرانے میں ہوا اور مجھے رُوفی کے ہاں بھیج دیا گیا۔ گھر سے ہر خط میں تاکید آتی کہ لڑکے کی پڑھائی کا خاص خیال رکھا جائے۔ چنانچہ خاص سے بھی زیادہ خیال رکھا جاتا۔ گیہوں کے ساتھ گھُن باقاعدہ پستا اور ننھے میاں کی بھی خوب تواضع ہوتی۔ ننھے میاں سونے سے پہلے بڑے خشوع وخضوع سے دعا مانگتے کہ یارب العالمین ہمارے کنبے والوں کو نیک ہدایت دے اور انہیں بتا کہ چھوٹے بچوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا ہے کیونکہ اب تک یہ لوگ اس سے بے بہرہ ہیں۔

گھر میں کئی نوکر تھے جن میں سب سے سینیئر رستم تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا تھا۔ اس کا تکیہ کلام "رکھی ہے" تھا۔ کوئی پوچھتا۔ "میاں رستم میری عینک کہاں گئی؟" جواب ملتا۔ "جی فرش پر رکھی ہے۔" "میرے کاغذات یہاں تھے کہاں گئے؟" "جی ردّی کی ٹوکری میں رکھے ہیں۔" "میرا بٹوہ کہاں گیا؟" "جی حوض کی تہہ میں رکھا ہے۔ ننھے میاں پھینک آئے ہیں۔"

اسے ریڈیو کا بے حد شوق تھا۔ جب دیکھو ریڈیو سے کان لگائے سُن رہا ہے۔ ایک مرتبہ کھانا کھاتے وقت کسی نے رکابی کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔ "یہ کیا چیز ہے؟" رستم فوراً بولا۔ "بہاگ کا خیال ہے، بلمپت لئے ہیں۔" ویسے اس وقت ریڈیو پر پکا گانا بھی ہو رہا تھا۔

ہمیں باورچی نے بتایا کہ صبح اُٹھ کر رستم یوں دعا مانگتا ہے۔ کہ اے خدا اس وقت دن کے سوا چھ بجا چاہتے ہیں۔ اب آپ اردو میں دعا سنیئے۔ یہ دعا دوپہر کو ایک بجے

اور رات کے نو بجے پھر مانگی جائے گی۔ اس دعا کی خاص خاص سرخیاں یہ ہیں ...... ڈھیر دعا مانگ چکنے کے بعد، کل پھر میں اسی وقت دعا مانگوں گا۔ اچھا، اب اجازت دیجیے۔ آداب عرض۔

اور بعض اوقات تو رستم دعا کے بعد خدا کو موسم کا حال بھی بتایا کرتا۔

باورچی بے حد موٹا تھا۔ اتنا کہ تصویر کھینچتے وقت اس کی کئی تصویریں لینی پڑتی تھیں تاکہ وہ مکمل آجائے۔ وہ ہر وقت ہنستا رہتا تھا۔ اکثر اس سے پوچھا جاتا کہ ہنستے کیوں ہو؟ جواب ملتا "جناب شکل ہی ایسی ہے۔"

اس کی گفتگو سن کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ریڈیو پر دیہاتی پروگرام ہو رہا ہو۔

بعض اوقات وہ جان بوجھ کر بہرہ بن جاتا۔ ہم آوازیں دیتے رہتے اور وہ بالکل نہ سنتا۔ ایک مرتبہ رُونی چلاتے رہے اور ساتھ کے کمرے میں چُپ چاپ سُنتا رہا۔ ہم کھڑکی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس سے جب پوچھا گیا کہ اتنی آوازیں اسے کیوں سنائی نہیں دیں تو بولا۔ میں نے آپ کی پہلی آوازیں نہیں سُنیں، صرف چوتھی آواز سُنی تھی۔

ایک مرتبہ ہمارا گھوڑا کھو گیا۔ سب نے باری باری ڈھونڈا، کسی کو نہ ملا۔ باورچی گیا اور گھوڑے کو پکڑ لایا۔ پوچھا کہ یہ تمہیں کیسے مل گیا؟ بولا۔ سب سے پہلے میں نے یہ سوچا کہ اگر میں گھوڑا ہوتا اور کھو جانے کی نیت ہوتی تو کہاں جاتا۔ بس میں سیدھا اسی جگہ گیا اور گھوڑا وہیں کھڑا تھا۔

گھر میں بہت سے پالتو جانور اور پرندے تھے۔ ایک طوطا تھا جو رونی کے ابا کے دفتر میں رہتا تھا۔ اسے چند فقرے یاد تھے۔ جب کوئی آتا تو "ہلو" کہتا۔ پھر کہتا۔ "دروازہ بند کر دیجیے۔" وہ اندر آجاتا تو اسے رونی کے ابا کے متعلق بتاتا کہ باہر گئے ہوئے ہیں یا گھر میں ہیں۔ جاتے وقت پھر کہتا۔ "دروازہ بند کر دیجیے۔"

ہمیں خاص طور پر کہا گیا تھا کہ ہم اس طوطے کے ساتھ باتیں کیا کریں اور اسے اچھے

اچھے فقرے سکھائیں، لیکن ہم کو دیکھ کر نہ جانے اسے کیا ہو جاتا۔ بس وہ ایک فقرے کا جاپ کرنے لگتا۔ 'میاں مٹھو ہوں'، 'میاں مٹھو ہوں'، 'میاں مٹھو ہوں'۔ ہم اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ بولو مٹھو، شاباش، باتیں کرو۔ یہ کہو، وہ کہو۔ نئے نئے فقرے سکھاتے، لیکن اس کی میاں مٹھو ختم نہ ہوتی اور ساتھ ساتھ وہ ہماری طرف اس انداز سے دیکھتا جیسے جواب کا منتظر ہو۔

ہر مرتبہ کچھ اس قسم کی گفتگو ہوتی:

"ہلو"۔ وہ کہتا۔

"ہلو بھئی طوطے، سناؤ کیا حال ہے؟"

"میاں مٹھو ہوں"۔ بڑے پیار بھرے لہجے میں جواب ملتا۔

"ہاں ہو۔"

"میاں مٹھو ہوں"۔ چلا کر۔

"درست کہتے ہو۔"

"میاں مٹھو ہوں؟" اس مرتبہ لہجہ سوالیہ ہوتا۔

"ہو گئے!"

"میاں مٹھو ہوں"۔ بڑی حیرانی کے ساتھ۔

"تو پھر کیا کریں؟"

"میاں مٹھو ہوں۔ میاں مٹھو ہوں۔" غصے میں۔

"مان لیا بابا، مان لیا، عجب نامعقول طوطا ہے۔"

"میاں مٹھو ہوں، میاں مٹھو ہوں۔ میاں۔"

اور ہم وہاں سے چلے آتے۔

کچھ سفید رنگ کی موٹی موٹی ایرانی بلیاں بھی تھیں جو اس قدر مغرور تھیں کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ البتہ ایک چھوٹی سی بلی بڑی ذہین اور سمجھدار تھی۔ وہ صبح صبح ہمیں جگانے

آتی۔ چپکے سے پلنگ پر چڑھ کر پاؤں میں ہلکی سی گدگدی کرتی ۔۔ جگا کر ایک کونے میں انتظار کرتی کہ کہیں ہم دوبارہ نہ سو جائیں۔

بڑے کمرے میں کچھ قالین تھے، اتنے خوبصورت کہ انہیں فرش پر دیکھ کر ہمیں بڑا افسوس ہوتا۔ وسط میں جو بڑا قالین تھا اس کا کچھ حصہ جل گیا تھا، اس طرح کہ وہاں پر نہ صوفہ رکھا جا سکتا تھا نہ کوئی میز۔ جب کبھی مہمان آتے تو وہی عقل مند بلی اس جلے ہوئے حصے پر بٹھا دی جاتی۔ وہ کچھ اس انداز سے وہاں بیٹھتی جیسے اسے کسی کی بھی کچھ پرواہ نہیں ہے۔ اسے لاکھ بلاتے، بہلاتے پھسلاتے، پیار کرتے، لیکن وہاں سے تب تک نہ ہلتی جب تک وہ سب چلے نہ جاتے۔ باہر والوں میں سے کسی کو پتہ تک نہ تھا کہ ہمارا خوبصورت قالین جلا ہوا ہے۔

ان دنوں روفی اور میں اُوپر کے کمرے میں رہتے تھے کیونکہ روفی کا خیال تھا کہ سطح سمندر سے زیادہ بلندی کی وجہ سے اس کی آب و ہوا بہتر ہے۔

ٹیوشن شروع ہوگئی۔ دن بھر سکول میں رہتے۔ شام کو ماسٹر صاحب تشریف لاتے جو چلتے وقت فالتو کام دے جاتے جس کے لیے دیر تک جاگنا پڑتا۔ بعض اوقات روفی کے ابا ہمیں سیر پر لے جاتے اور راستے بھر انواع و اقسام کی ہدایتیں ملتیں ۔۔۔ یہ کرو، یہ مت کرو، اگر یوں کرو تو یوں ضرور کرو اور اگر یوں نہیں کرتے تو یوں بھی مت کرو۔ ایک روز انہوں نے ہمیں کلب جانے کو کہا۔ بولے: اس طرح تمہاری معلومات میں اضافہ ہوگا اور گفتگو کرتے وقت اب جو جھجک محسوس ہوتی ہے وہ دور ہو جائے گی۔ چنانچہ ہم کلب گئے۔ جا کر دیکھتے کیا ہیں کہ ایک بہت بڑی سجی سجائی عمارت سنسان پڑی ہے اور ایک لمبے سے کمرے میں بہت سے معمر حضرات بالکل بیزار بیٹھے ہیں۔ ہم ایک کونے میں چوروں کی طرح کھڑے تھے کہ انجینئر صاحب نے بلایا اور پاس بٹھا لیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر انہوں نے کہا "بھئی لڑکو! کچھ بات چیت کرو۔" میں نے روفی کی طرف دیکھا۔ اُنہوں نے میری طرف اشارہ کیا۔

میں نے گلا صاف کیا اور سوچنے لگا کہ کیا کہوں۔ چند روز پہلے ہم نے سنا تھا کہ شاہ امان اللہ خاں نے تخت چھوڑ دیا ہے۔ چلو اسی سے گفتگو شروع کرتے ہیں۔

"وہ سنا آپ نے۔ امان اللہ خاں نے تخت چھوڑ دیا۔"

"اچھا، کب؟" انجینئر صاحب نے پوچھا۔

"کچھ دن ہوتے۔"

ان کی بغل میں جو صاحب بیٹھے تھے بولے "کس نے تخت چھوڑ دیا؟"

"جی امان اللہ خاں نے۔"

"افوہ!" کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

"کیا ہوا، کون تھا؟" ایک صاحب جو ان کے بالکل قریب بیٹھے تھے، کہنے لگے۔

"جی امان اللہ خاں نے تخت چھوڑ دیا۔"

"اوہ!"

ان کے سامنے بیٹھے ہوئے صاحب کچھ دیر کے بعد چونک کر بولے۔

"یہ کن صاحب کا ذکر ہو رہا ہے؟"

"جی امان اللہ خاں کا۔"

"ہم نہیں کیا ہوا؟"

"اُنھوں نے تخت چھوڑ دیا۔"

"اچھا۔"

"بھئی یہ اکیلے ہی اکیلے کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ ہمیں بھی تو بتاؤ"۔۔۔ ایک طرف سے آواز آئی۔

"جی امان اللہ خاں نے تخت چھوڑ دیا۔"

"افوہ، بڑا افسوس ہوا۔ کون تھے وہ؟"

"جی بادشاہ تھے۔"

"کہاں کے؟"

"افغانستان کے۔"

"اچھا۔"

میرے داہنے ہاتھ بیٹھے ہوئے صاحب یک لخت اچھل پڑے۔" کیا کسی نے تخت چھوڑ دیا؟"

"جی ہاں۔"

"کس نے؟"

"امان اللہ خاں نے۔"

"اوہ، امان اللہ خاں نے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر سامنے کے صوفے پر ایک صاحب ہڑبڑا کر اُٹھے۔

"یہ کوئی کسی کے کچھ چھوڑ دینے کا ذکر کر رہا تھا۔ کیا ہوا؟"

"جی، امان اللہ خاں نے تخت چھوڑ دیا۔"

"ارے۔"

غرضیکہ اسی طرح باری باری ہر شخص نے پوچھا کہ کیا ہوا اور مجھے کوئی پچاس مرتبہ بتانا پڑا کہ امان اللہ خاں نے تخت چھوڑ دیا۔ ہم نہایت بیزار ہو کر واپس لوٹے گھر میں سب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ جھیل کی باتیں شروع ہو گئیں۔ مچھلیوں کے متعلق ان کے شبہات بدستور موجود تھے۔ ہم نے بڑے وثوق سے کہا کہ وہاں بڑی بڑی مچھلیاں ہیں۔ ہم اکثر پکڑتے رہتے ہیں۔ ہم نے کئی مرتبہ انہیں بھونا بھی ہے۔ بولے اچھا اس مرتبہ پکڑ کر تو گھر لانا ہم بھی چکھیں گے۔

اگلے اتوار کو ہم صبح سے شام تک پانی میں بنسیاں ڈالے بیٹھے رہے لیکن کچھ نہ ملا۔

واپسی پر بازار میں مچھلی والے سے بڑی بڑی مچھلیاں خریدی گئیں اور باورچی کے حوالے کی گئیں۔ اتفاق سے اس شام کو سب کہیں باہر مدعو تھے۔ گھر میں صرف میں اور روفی تھے اور ایک بزرگ جو ننھے میاں کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا کرتے۔ رات کے وقت بزرگ کو اچھی طرح دکھائی نہ دیتا تھا۔ ننھے میاں پہلے تو دسترخوان پر بیٹھتے پھر چپکے سے اُٹھ جاتے۔ اُدھر بلیاں قطار باندھے، کیو، لگائے منتظر ہوتیں اور بڑے اطمینان سے ساتھ آ بیٹھتیں۔ وہ یہی سمجھتے کہ ننھے میاں ساتھ بیٹھے ہیں، چنانچہ وہ بار بار بلیوں سے کہتے۔ برخوردار بھوکے مت رہنا۔ چیزیں اٹھا اٹھا کر ان کے سامنے رکھتے۔ یہ چکھو برخوردار۔ یہ بھی کھاؤ برخوردار۔ ادھر بلیاں بڑے سکون سے کھاتیں۔

چنانچہ ہماری خریدی ہوئی مچھلیاں اس رات بلیوں نے کھائیں۔ اگلی مرتبہ ہم جھیل پر گئے اور واپس آتے وقت مچھلیاں خرید کر لائے تو نہ جانے کس کے مشورے سے مچھلیاں ڈاکٹر صاحب کے ہاں بھیج دی گئیں۔ اس سے اگلی مرتبہ انجنیئر صاحب کے ہاں۔ پھر ایک روز کیا ہوا کہ سب کے سامنے مچھلی والا حساب لے کر آ گیا۔ ہمارا جیب خرچ ختم ہو چکا تھا اور مچھلیاں اُدھار آ رہی تھیں۔ سب کو پتہ چل گیا۔ ہمارا خوب مذاق اڑا۔ ہمیں ہدایت کی گئی کہ آئندہ جھیل پر نہ جایا کریں۔ ہم وہاں محض وقت ضائع کرنے جاتے ہیں۔ جب وہاں مچھلیاں ہیں ہی نہیں تو جانا بالکل بے سُود ہے۔

ہم سکول کا کام کر رہے تھے۔ رستم ہمارے پاس بیٹھا تھا۔ ہمارے دل میں بار بار یہی خیال آتا تھا کہ وہاں جانا بے سود کیوں ہے۔ رستم کہہ رہا تھا۔ لڑکو جب تم بڑے ہو جاؤ گے تب تمہیں معلوم ہو گا کہ دنیا میں جس کام سے کسی فائدے کی امید نہیں ہے وہ بے سود ہے۔ دنیا میں لوگ صرف وہی کام کرتے ہیں جس میں نفع ہو۔ صرف ان لوگوں سے ملتے ہیں جو فائدہ پہنچا سکیں۔ صرف وہ باتیں سوچتے ہیں جو سُود مند ہوں۔ باقی کے سب کام، سب انسان اور سب باتیں بے کار ہیں۔

اگلے اتوار کو سب کہیں باہر جا رہے تھے۔ ہمیں حکم ملا کہ ہم دن بھر گھر کی رکھوالی کریں گے۔ چھوٹے ننھے، ننھے میاں ٹیلیفون اور ملاقاتیوں کا خیال رکھیں گے اور ماسٹر صاحب نے ہمیں گھوڑے پر جواب مضمون لکھنے کو کہا تھا۔

میں اور رونی کمرے میں کاپیاں لیے بیٹھے تھے۔ ایک کونے میں ننھا کھیل رہا تھا۔ ننھے میاں پڑوس کے بچّوں کے ساتھ تھے۔ رستم پوچھنے لگا "کیا لکھ رہے ہو؟" ہم نے بتایا "گھوڑے پر جواب مضمون۔" وہ بولا "یوں بھی کبھی مضمون لکھے گئے ہیں۔ سوال مضمون ہو یا جواب مضمون، جس چیز پر لکھنا ہو اُسے دیکھ کر لکھو۔ میں ابھی گھوڑا لاتا ہوں۔" وہ گھوڑا لے آیا۔ "اب اس پر سوار ہو کر لکھو۔ تمہیں گھوڑے 'پر' جواب مضمون لکھنا ہے۔"

وہ گھوڑا بہت اُونچا تھا۔ ہم زینے پر کھڑے ہو گئے۔ رستم گھوڑے کو کھینچ کر دیوار کے ساتھ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے گھوڑا نزدیک آیا۔ ابھی رونی نے اپنا پاؤں اس پر رکھا ہی تھا کہ وہ آگے چل دیا۔ کئی مرتبہ اسی طرح ہوا۔ آخر طے ہوا کہ گھوڑے پر سیڑھی لگا کر چڑھا جائے۔ رستم بولا۔ اگر تم دونوں نے اس گھوڑے پر چڑھ کر مضمون لکھا تو دونوں کا مضمون ایک سا ہوگا۔ میں ایک اور گھوڑا لاتا ہوں۔ ہم نے کہا نہیں یہی کافی ہے۔ بمشکل رونی گھوڑے پر سوار ہوئے۔ وہ اس قدر ڈرے ہوئے تھے کہ رستم کو بھی ساتھ بیٹھنا پڑا۔ میں نے انکار کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے گھوڑا بدک کر سرپٹ بھاگا۔ رستم نے چار یا پانچ نہایت اعلیٰ درجے کی نفیس قلابازیاں کھائیں اور رونی نے کسی کہنہ مشق نٹ کی طرح تماشا دکھایا۔ کپڑے جھاڑتے ہوئے رونی رستم سے بولے "گھوڑے پر ان دونوں سواریوں کا شکریہ۔"

"دو سواریاں کیسی؟"

"میری پہلی اور آخری سواری۔"

باورچی کو کہا گیا تھا کہ وہ ننھے کا خیال رکھے چنانچہ وہ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد باورچی خانے کی کھڑکی سے سر نکال کر ننھے کی طرف دیکھے بغیر چلّاتا تھا "ننھے یوں مت کرو!" "خبردار ننھے جو یہ کیا ہے تو!"

پھر یکایک ننھے کے رونے کی آواز آئی۔ ہم بھاگے بھاگے پہنچے۔ "ننھے کو چوٹ کیونکر لگی؟" ہم نے باورچی سے پوچھا۔

"وہ سامنے سیڑھیاں دیکھیں آپ نے؟"

"ہاں۔"

"بس وہ ننھے نے نہیں دیکھیں۔"

ہم نے اُسے چپ کرانے کے لیے بہتیرے جتن کیے۔ آخر رستم نے مشورہ دیا کہ اسے گائے کا دودھ پلایا جائے۔ باورچی دودھ لایا۔ ہم نے اس سے پوچھا "یہ تازہ تو ہے نا؟"

"تازہ؟ چند گھنٹے پہلے یہ سبز گھاس تھا۔" اُس نے فوراً جواب دیا۔

ننھے نے چکھا لیکن پینے سے انکار کر دیا۔ معلوم ہوا کہ دودھ پھیکا تھا۔ باورچی سے شکّر ملانے کو کہا گیا۔ اُس نے گھر چھان مارا لیکن شکّر نہ ملی۔ رستم نے کہا "ابھی صبح پانچ سیر شکّر آئی تھی۔ باورچی خانے میں میں نے خود دیکھی ہے۔"

باورچی مسکرایا اور بولا "اوہ! مجھے یاد آیا۔"

اندر گیا۔ خالی ہاتھ لوٹا۔ "وہاں تو نہیں ملی۔"

"تو پھر کہاں گئی؟"

"کسی کتّے بلّی نے کھالی ہوگی۔" وہ بولا۔

اندر جا کر دیکھتے ہیں تو ایک بالکل چھوٹا سا کتّا خوابِ خرگوش سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اسے جگانے سے پہلے میں نے پوچھا "کیا کتّے شکّر کھاتے ہیں؟"

"اور کتوں کا تو مجھے پتہ نہیں، یہ کتا بیحد چٹورا ہے۔ میٹھی چیز تو یہ کبھی نہیں چھوڑتا۔ ضرور اسی نے شکر کھائی ہے۔ اسے تول کر دیکھ لیجیے۔"

کتے کو جگایا گیا۔ ترازو منگائی گئی۔ اسے تولا گیا۔ وہ پورا پانچ سیر تھا۔

"شکر کا وزن تو پورا ہو گیا۔" رُوفی نے باورچی سے پوچھا۔ "اب کتا کہاں گیا؟"

باورچی سے جب کئی اور سوال پوچھے گئے تو وہ بولا۔ "میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں جتنا کہ دکھائی دیتا ہوں۔"

"کاش کہ تم ہوتے۔" رستم نے کہا۔

اتنے میں ننھے میاں آ گئے۔ ننھے میاں خود ساڑھے چار سال کے تھے اور چھوٹے ننھے سے دو سال بڑے تھے۔ ہم نے ان کی خوشامد کی کہ چھوٹے ننھے کے ساتھ کھیلو۔ انہوں نے بڑی حقارت سے ننھے کی طرف دیکھا اور بولے:

"اس کے ساتھ؟ اونہہ، یہ تو بچہ ہے۔"

ننھا خوب رو رہا تھا۔ آخر ہم نے تنگ آ کر ریڈیو لگا دیا اور اُسے اتنا بلند کر دیا کہ ننھے کی آواز دب کر رہ گئی۔ دفتر سے اس طوطے کو نکال کر ریڈیو کے سامنے بٹھا دیا۔ سیاہی سے ننھے میاں کی داڑھی اور مونچھیں بنائی گئیں۔ بلیوں کے منہ پر پاؤڈر، سرخی اور لپ سٹک لگائی گئی۔ کتے کے گلے میں سفید کالر اور نہایت بڑھیا ٹائی باندھی گئی، سر پر ہیٹ اُڑھایا گیا۔ گھوڑے کے سر پر کلاہ رکھ کر صافہ باندھا گیا۔

فون آیا۔ رُوفی نے ریسیور اٹھایا اور ننھے کے منہ کے سامنے کر دیا۔ ننھا خوب مزے لے لے کر رو رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد پھر فون آیا۔ روفی نے پوچھا "کون صاحب بول رہے ہیں؟"

آواز آئی "انعام علی، اکرام علی، الہام علی اینڈ کمپنی۔"

"اوہ۔ آداب عرض، آداب عرض اور آداب عرض!" اور ریسیور رکھ دیا۔

گھر میں خوب اودھم مچایا گیا۔ صندوقوں اور الماریوں کی تلاشی لی گئی۔ بندوق نکال کر چلائی گئی، دو گھڑے پھوٹ گئے۔ پھر فون کیا گیا۔

"کون سا نمبر چاہیے؟" آپریٹر نے پوچھا۔

"کوئی سا نمبر دے دیجیے۔" روفی بولے۔

"آپ بتائیے۔"

"آپ خود کوئی اچھا سا نمبر دے دیجیے۔"

"نہیں آپ۔"

"واللہ آپ۔"

"آپ بتاتے ہیں یا نہیں؟"

رُوفی نے ڈائل پر لکھا ہوا نمبر پڑھا۔ "مجھے یہ نمبر چاہیے۔"

"یہ تو آپ کا نمبر ہے۔"

"تو پھر میں اپنے آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

جب شام کو سب آئے تو ہم بڑی سنجیدگی سے سوال نکال رہے تھے۔ ننھا رونے کے شغل سے تنگ آ کر سو چکا تھا۔ ننھے میاں کے متعلق پوچھا گیا کہ وہ کہاں ہیں؟ کچھ دیر میں وہ سب کے سامنے سے گزرے۔ وہ کچھ چیزیں چرائے لیے جا رہے تھے۔ منہ سفید کریم سے لپا ہوا تھا۔ انہیں پکڑا گیا۔ معلوم ہوا کہ آپ نے وینشنگ کریم (VANISHING CREAM) لگائی ہے اور آپ کا خیال ہے کہ آپ سب کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ اور آپ کو چوری کرتے ہوئے کوئی نہیں دیکھ رہا۔

صبح صبح باہر آہٹ ہوئی۔ ہم نے پوچھا کون ہے۔ باورچی تھا۔ "مجھے چھ بجے جگا دینا۔" روفی بولے۔

"چھ تو بج گئے۔" اُس نے بتایا۔

"تو مجھے جگا دو۔"

ہم باہر نکلے۔ چپکے سے گائے کا موٹا تازہ اور بیل نما بچھڑا کھولا۔ اس پر زین کسی گئی۔ ایک سینگ پر سائیکل کا لیمپ لگایا گیا۔ دوسرے پر ہارن اور گھنٹی فٹ کیے گئے۔ ہم دونوں سوار ہو کر سیر کے لیے نکلے۔ روفی نے دونوں سینگ یوں پکڑے تھے جیسے موٹر چلا رہے ہوں۔ لیمپ روشن تھا۔ ہم ہارن بھی بجاتے تھے اور گھنٹی بھی۔

ماسٹر صاحب بالکل ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ انہوں نے مرغیاں بطخیں خرگوش اور نہ جانے کیا کیا الابلا پال رکھی تھی۔ راستے میں طے ہوا کہ آج دوپہر کو چھت پر چڑھ کر آئینے کی مدد سے ان کے پرندوں اور جانوروں پر سورج کی شعاعیں پھینکی جائیں۔ دوپہر کو روفی اندر سے ایک بڑا آئینہ اُٹھا لائے۔ ہم نے شعاعیں پھینکیں۔ مرغیاں اور بطخیں اُڑ کر سڑک پر چلی گئیں۔ کچھ ہمارے ہاں آ گئیں۔ خرگوش اندر جا چھپے۔ اور پھر رُوفی کے ہاتھ سے جو آئینہ پھسلا ہے تو چُور چُور ہو گیا۔ ہم نے رستم کو بتایا۔ وہ بولا غضب ہو گیا۔ یہ آئینہ تو بہت پرانا تھا۔ کئی نسلوں سے آپ کے خاندان میں چلا آتا تھا ہم بہت ڈرے وہ بولا۔ "اچھا میں موقعہ پا کر صاحب سے کہہ دوں گا کہ وہ آئینہ جو نسلاً بعد نسلاً آپ کے ہاں چلا آتا تھا۔"

"ہاں ہاں اسے کیا ہو گیا؟" ہم نے بے صبری سے پوچھا۔

"اسے اس نسل نے توڑ دیا ہے۔"

ہم منتیں کرنے لگے کہ کسی کو مت بتانا۔ ہم دوسرا خرید لائیں گے، بالکل ایسا ہی۔

مصیبت یہ تھی کہ ہم ان دنوں مفلس تھے۔ میری سائیکل میں اتنے پنکچر لگے ہوتے تھے کہ سائیکل والا عاجز آ چکا تھا۔ آخری مرتبہ جب میں ایک اور پنکچر لگوانے گیا تو اُس نے مجھے ٹیوب دکھائی۔ پنکچروں پر پنکچر اور ان پر اور پنکچر لگے ہوتے تھے۔ وہ بولا۔ "اب میں صرف یہ کر سکتا ہوں کہ اس ٹیوب پر ایک نئی ٹیوب چڑھا دوں، بس۔"

اُدھر روفی کے پاس بھی کچھ نہیں تھا۔ ہم نے رستم سے ادھار کے لیے کہا۔ وہ بولا مجھے تو پڑوسیوں نے کنگال کر رکھا ہے۔ سب کچھ ادھار لے جاتے ہیں بعض اوقات جو چیزیں میں خود ادھار لاتا ہوں وہ انہیں بھی ادھار لے جاتے ہیں میری تنخواہ میرے برتن، کپڑے، صندوق، سب کچھ ان کے ہاں رہتا ہے۔ ان کے ہاں میری اتنی چیزیں ہیں کہ اپنے گھر کے مقابلے میں ان کے ہاں میرا زیادہ جی لگتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک روز وہ میرے مصنوعی دانت اور عینک بھی ادھار لے گئے تھے۔"

ہم بڑے گھبرائے۔ آخر طے ہوا کہ باورچی سے روپے مانگے جائیں اور مانگتے وقت اسے باورچی نہ کہا جائے بلکہ خانساماں کہا جائے۔ مشکلوں نے اس نے وعدہ کیا کہ وہ کسی سے ادھار لے کر ہمیں کل روپے دے گا اور ہم اسے گیارہ بجے بڑے بازار میں ملیں۔

ہم سکول سے بھاگ کر بازار پہنچے۔ دیر تک انتظار کرنے پر بھی وہ ہمیں نہ ملا۔ ادھر یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں کوئی ہمیں بازار میں دیکھ نہ لے۔ آخر ہم ایک دکان میں جا گھسے اور یونہی قیمتیں پوچھنے لگے۔

روفی نے ایک مفلر کی قیمت پوچھی۔ دکاندار بولا "پچاس روپے۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ اور اس قلم کی کیا قیمت ہے؟"

"دو لاحول ولاقوتیں۔"

"یعنی؟"

"یعنی سو روپے۔"

"اچھا کولٹوں کا کپڑا تو دکھا دیجیے۔"

ہم کپڑوں کو بھی دیکھ رہے تھے اور سڑک کی طرف بھی۔ تھوڑی سی دیر میں ہم نے سارے تھان اُلٹ پلٹ کر رکھ دیے۔ دکاندار بولا "تو کون سا کپڑا پسند آیا آپ کو؟"

"جناب معاف فرمائیے۔ ہمیں کپڑا نہیں خریدنا تھا۔ دراصل ہم اپنے باورچی کی

تلاش میں ہیں۔"

"تو اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ آپ کا باورچی ان دو باقی ماندہ تھانوں میں لپٹا ہوا ہے تو میں وہ بھی دکھاتے دیتا ہوں۔"

وہ بقیہ تھان لینے مڑا اور ہم وہاں سے بھاگے۔

آخر ہمیں باورچی مل ہی گیا۔

"اتنی دیر لگادی؟ پتہ بھی ہے اب کیا بجا ہے؟" ہم نے اس سے شکایتاً کہا۔

میں مختلف آدمیوں سے وقت پوچھتا رہا ہوں۔ کوئی کچھ بتاتا ہے کوئی کچھ۔

"وہ سامنے دیکھو۔" ایک کلاک میں پورے بارہ بجے ہوتے تھے۔

"ارے!" وہ چونک پڑا۔ "یہ کلاک کی دوسری سوئی کہاں گئی؟"

ہم نے بالکل ویسا ہی آئینہ خریدا۔ واپسی پر اس نے بتایا "میں ڈاک لانے کا بہانہ کر کے آیا ہوں اس لئے ڈاک خانے ہو کر چلیں گے۔" اور ہم راستے بھر ڈرتے آئے کہ کہیں کوئی ہمیں اور آئینے کو دیکھ نہ لے۔

"کوئی ڈاک تھی؟" اس سے پوچھا گیا

"ڈاک تو نہیں تھی، فقط ایک خط تھا۔" وہ بولا۔

آئینہ رستم کو دکھایا گیا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اس کے سامنے وہی آئینہ دو مرتبہ پہلے بھی ٹوٹ چکا ہے۔ دونوں مرتبہ نیا خریدا گیا لیکن شکر ہے کہ وہ آئینہ جو نسلاً بعد نسلاً چلا آرہا تھا بالکل صحیح سلامت ہے۔

رات کو ہم نے دیکھا کہ روفی کے ابا دفتر میں کام کر رہے ہیں۔ ان کے ڈیپارٹمنٹل امتحان ہو رہے تھے۔ روفی اندر گئے۔ سلام کیا اور پوچھا۔

"سنائیے ابا جان پرچے کیسے ہو رہے ہیں؟"

"اچھے ہو رہے ہیں۔ شکریہ۔"

"امتحان مشکل تو نہیں لگ رہا؟"

"نہیں۔ آسان ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"پھر بھی آپ اتنی محنت نہ کیا کریں۔ اتنی دیر تک جاگا بھی مت کریں، ورنہ صحت پر برا اثر پڑے گا اور اپنی عینک سنبھال کر رکھا کریں۔ نوکر اکثر اسے لگا لیتے ہیں۔"

روفی کے ابا کی عینک کچھ ایسی تھی کہ جو اسے لگاتا چند قدم چل کر دھڑام سے گرتا۔ ہم نے کئی مرتبہ تجربہ کیا تھا۔

روفی کے ہاں ان کے کئی رشتہ دار ملنے آئے جن کے ساتھ بے شمار بچے تھے۔ نہایت شوخ اور شریر قسم کے بچے۔

روفی کی امی نے ننھے میاں سے کہا۔ "ننھے دادی جان کو پیار کرو۔"

"امی۔ میرا قصور؟" انہوں نے ٹھنک کر پوچھا۔

"اچھا انہیں اپنا سبق پڑھ کر سناؤ۔ یا چلو کوئی ضرب المثل ہی سنا دو۔"

"کل کا کام آج پر مت چھوڑو۔" ننھے میاں سینہ تان کر بولے۔

"غلط ہے۔ سوچ کر پھر بتاؤ۔" ان کی امی نے ڈانٹا۔

"آج کا کام پرسوں پر مت چھوڑو۔"

"چلو رہنے دو۔" ان کی دادی جان بولیں۔ "اچھا یہ بتاؤ تم صبح کتنے بجے جاگتے ہو؟"

"جب سب جاگتے ہیں۔"

"بچوں کو تو مرغ کی اذان کے ساتھ اٹھنا چاہیے۔"

"جی ہمارے ہاں مرغ ہیں ہی نہیں۔"

"تو سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اٹھنا چاہیے۔"

"جس کمرے میں ہم سوتے ہیں اُس کا رُخ مغرب کی طرف ہے۔"

اُدھر بچّوں نے ہمیں پریشان کر دیا۔ ایک پوچھتا تھا۔ بھائی جان! چڑیا گھر کو چڑیا گھر کیوں کہتے ہیں؟ دوسرا یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ چیتے اور شیر وغیرہ سرکس سے پہلے کیا کیا کرتے تھے؟ ایک کا غبارہ اُڑ گیا۔ وہ یہ دریافت فرما رہے تھے کہ کششِ ثقل نے غبارے کو روکا کیوں نہیں۔ کششِ ثقل سے ان کا اعتبار اُٹھ چلا تھا۔

ایک بچّے نے بتایا کہ اُس نے ایک شخص کو دیکھا تھا جس کا نصف چہرہ بالکل سیاہ تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" روفی نے پوچھا۔

"اس کا بقیہ نصف چہرہ بھی سیاہ تھا۔"

دوسرا بولا۔ "ہمارے ماسٹر صاحب بارش میں چھتری استعمال نہیں کرتے۔"

"تو پھر کیا کرتے ہیں؟"

"بس بھیگ جاتے ہیں۔"

تیسرا بھاگا بھاگا آیا۔ "امّی جان میں نے باغ میں خرگوش دیکھا ہے۔"

"وہم ہو گا۔"

"اچھا تو کیا وہم کی ایک سفید دُم اور دو لمبے لمبے کان ہوتے ہیں؟"

ہم تنگ آ گئے۔ عجب گستاخ اور ہونق بچّوں سے واسطہ پڑا تھا۔ آخر روفی اور مَیں اُٹھے۔

"کہاں جا رہے ہو؟" کسی نے پوچھا

"باغ میں پھل توڑنے۔"

"لیکن پھل تو ابھی کچّے ہیں۔ کل ہی تو دیکھے تھے۔"

"شاید کچھ پک گئے ہوں۔"

"بیٹھے رہو۔ پھر کبھی دیکھ لینا۔"

اور ہمیں بیٹھنا پڑا۔

ایک بزرگ فرما رہے تھے۔ "جب میں چھوٹا سا تھا تو اس قدر نحیف تھا، اتنا کمزور تھا کہ میرا کل وزن چار پونڈ تھا۔ مجھے دنیا بھر کی بیماریوں نے گھیرے رکھا۔"

"تو کیا آپ زندہ رہے تھے؟" ایک ننھے نے دریافت کیا۔

ایک خاتون فرما رہی تھیں۔ "اس وقت اپنے ملک میں ہم جاگ رہے ہیں لیکن امریکہ کے بعض حصّوں میں لوگ سو رہے ہوں گے۔"

"سُست الوجود کہیں کے۔" ایک اور ننھے نے بات کاٹی۔

"آئس کریم جلدی سے کھا لو، ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی۔" ایک طرف سے آواز آئی۔

"یہ کافی تو جلی ہوتی ہے۔"

دادی جان ننھے میاں سے پوچھ رہی تھیں۔ "کیوں ننھے یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟"

"جی جاتی واتی تو کہیں نہیں، ہر صبح مجھے یہیں ملتی ہے۔ اگر رات کو کہیں چلی جاتی ہو تو پتہ نہیں۔"

"مگر یہ وہی سڑک تو ہے جو جرنیلی سڑک سے جا ملتی ہے اور پشاور جاتی ہے۔"

"تو پشاور سے واپس کون سی سڑک آتی ہے؟" ایک ننھے نے پوچھا۔

"ہمارے ماسٹر صاحب کی سالگرہ ہے۔ انہیں کیا تحفہ دیا جائے؟" آواز آئی۔

"ایک کتاب دے دو۔"

"مگر ان کے پاس ایک کتاب ہے۔"

دادی جان نے پھر ننھے سے سوال کیا۔ "وہ جو سامنے جانور چر رہے ہیں، کتنے ہیں؟"

"بائیس"۔ کچھ دیر کے بعد جواب ملا۔

"شاباش۔ اتنی جلدی تم نے کیونکر گن لیے؟"

"بالکل آسان ہے۔ پہلے جانوروں کی ٹانگیں گن لیں پھر چار پر تقسیم کر دیا۔"

ایک صاحب جو غالباً شکاری تھے اپنی آپ بیتی سنا رہے تھے کہ کس طرح وہ جنگل میں چھپتے پھر رہے تھے اور ایک شیر ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ بچے طرح طرح کے سوال پوچھ رہے تھے۔ شیر کا رنگ کیسا تھا؟ آپ کی شیر سے دشمنی تھی کیا؟ شیر موٹا تھا یا دبلا؟ آپ نے شیر کی کمر پر لٹھ کیوں نہیں مارا؟ کیا آپ ڈرپوک تھے جو شیر سے ڈر رہے تھے؛ وہ تھوڑی سی بات کرتے اور سب بچے چلا کر پوچھتے، پھر کیا ہوا؟ اور ساتھ ہی بے تُکے سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی۔ وہ بالکل تنگ آ چکے تھے۔

ایک مرتبہ بچوں نے پھر پوچھا کہ پھر کیا ہوا؟

"پھر کیا ہونا تھا" وہ اپنے بال نوچ کر بولے۔ "پھر شیر نے مجھے کھا لیا۔"

اور بچوں نے تالیاں بجائیں۔ ہپ ہپ ہُرّا کیا۔ ایک ننھا اپنا ڈھول اُٹھا لایا اور ساتھ ہی لکڑی کا نصف گھوڑا جسے آری سے کاٹا گیا تھا۔ گھوڑے کا نام لوئی ساڑھے تین تھا۔ اُنہوں نے وجہ بتائی کہ پہلے اُنہوں نے اسے کسی دوست کے ساتھ مل کر خریدا تھا۔ تب اس کا نام لوئی ہفتم تھا۔ دونوں دوستوں کی لڑائی ہوئی تو گھوڑے کو آری سے آدھا آدھا تقسیم کیا گیا، چنانچہ اس کا نام لوئی ساڑھے تین رکھ دیا گیا۔

ہم پھر اُٹھے۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"جی باغ میں۔ شاید اب پھل پک گئے ہوں۔"

لیکن ہمیں پھر بٹھا لیا گیا۔ دوسرے کمرے سے ایک بچے نے صدائے احتجاج بلند کی اور نعرہ لگایا۔ ہم بھاگ کر پہنچے تو دیکھا کہ دو بچے لڑ رہے ہیں۔ بڑا چھوٹے کی خوب تواضع کر رہا تھا۔ مشکل سے دونوں کو علیحدہ کیا۔ دادی جان کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ لڑائی کی تفصیل بیان کی جا رہی تھی۔ چھوٹا بچہ ڈینگیں مار رہا تھا کہ میں نے یہ کیا، میں نے وہ کیا۔ وہ کہہ رہا تھا "میں نے اس کو پکڑ کر اپنے اُوپر گرا لیا اور اپنی ناک اس کے

دانتوں میں دے دی۔ پھر مَیں نے اس کی کہنی اپنی پسلیوں میں چبھو دی اور دھڑام سے اس کا مُکّا اپنی کمر میں رسید کیا۔ پھر زور سے اس کا تھپڑ اپنے مُنہ پر مارا۔ پھر میں نے جو اس کی ٹھوکر اپنے گھٹنے میں لگائی ہے تو بس۔"

ہم پھل توڑنے کے بہانے سے بمشکل وہاں سے نکل سکے۔ باغ میں روفی اور مَیں دیر تک سوچتے رہے کہ دُنیا میں کیسے کیسے نامعقول اور بے ہودہ بچے بستے ہیں۔

رُوفی نے کمرے کے دروازوں پر اندر کی طرف "خوش آمدید" لگایا تھا۔ اس طرح کہ جو شخص کمرے میں بیٹھا ہو، اسے یہ ہر وقت نظر آتا رہے۔ یہ ماسٹر صاحب کے لیے تھا۔ روفی کے لیے نئی رضائی تیار ہوئی تھی۔ انہیں رضائی کے نقش و نگار بے حد پسند تھے، اس لیے کہ انہیں دیکھ کر روفی کو مغل آرٹ یاد آجاتا تھا۔ ابھی اچھی خاصی گرمیاں تھیں لیکن رات کو وہ پنکھا چلا کر رضائی اوڑھتے تھے۔

ایک اور امتحان آ رہا تھا۔ ہمیں زائد کام کرنے کو کہا گیا۔ رستم پوچھنے لگا:

"اتنے پریشان کیوں ہو؟"

روفی بولے۔ "کیا بتائیں۔ صبح کام، شام کو کام۔ کام، کام تنگ آ گئے ہیں۔"

"اتنا کام کب سے شروع کیا؟"

"کل سے شروع کریں گے۔"

رستم پڑھا لکھا تھا۔ اُس نے وعدہ کیا کہ ہمارا ہاتھ بٹائے گا اور حساب کے سوال نکال دیا کرے گا۔ اس کے بعد دیر تک بڑوں پر تبصرے ہوتے رہے کہ یہ مزے کرتے ہیں۔ انہیں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ نہ انہیں شام کو ٹیوشن کی مصیبت ہے نہ علی الصبح اٹھنے کی قید۔ ان کی آزمائشیں، ان کے امتحان، ان کے کڑے دن گزر چکے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

پھر ہمارا امتحان ہوا۔ ہمیں کچھ اور بتایا گیا تھا لیکن پرچے کچھ اور ہی آئے۔ چنانچہ ہم کچھ اور ہی لکھ آئے۔ بس فیل ہوتے ہوتے بچے۔ ہر ایک نے ہمیں حسب توفیق ڈانٹا۔ باورچی نے ہمدردی کے طور پر پوچھا "سنا ہے آپ کا امتحان اتنا اچھا نہیں رہا۔ کیا بات ہوئی؟"

روفی بولے۔ "بات یہ ہوئی کہ مجھے پتہ نہیں تھا کہ کوہ سیرا نویدا، دریائے مس سپی اور ٹمبکٹو کہاں ہیں؟"

"میں تو ہمیشہ یہی کہا کرتا ہوں کہ اپنی چیزیں سنبھال کے رکھا کرو۔"

ماسٹر صاحب ہمارے پرچے لے کر آئے۔ پہلے انہوں نے تعلیم کی اہمیت اور محنت کے فوائد پر چھوٹا سا لیکچر دیا۔ پھر غلطیاں گنوانی شروع کر دیں۔ "تمہارا جغرافیہ بے حد کمزور ہے۔ یہ دیکھو اس نقشے میں ریلوے لائن اس جنکشن سے آگے چلتے چلتے ایک دم دریا بن جاتی ہے اور خلیج بنگال میں گرتی ہے۔ یہ چھوٹی سی جھیل سمندر کے عین درمیان واقع ہے اور اس دریا سے ایک سڑک نکلتی ہے جو واپس پہاڑوں کی طرف جاتی ہے۔ تم نے اب تک اٹلس نہیں خریدی؟"

"جی نہیں۔"

"میں مہینوں سے چلا رہا ہوں۔ آخر تم اٹلس کیوں نہیں خریدتے؟"

"جی ۔۔۔ دنیا کے سیاسی حالات ذرا درست ہو لیں۔ پھر خرید لیں گے۔"

"اور یہ طوفانِ نوح کے متعلق تم نے اوٹ پٹانگ باتیں لکھی ہیں۔ تم نے لکھا ہے کہ وہ کشتی کسی پہاڑ پر ٹھہری ہی نہیں۔"

"جناب پہاڑوں پر بھی کبھی کشتیاں ٹھہری ہیں؟"

"لیکن اُن دنوں سیلاب آیا ہوا تھا۔ چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ اچھا، بھلا تم اس کشتی میں ہوتے تو اسے کہاں لے جاتے؟"

"جی میں اسے کسی اچھی سی بندرگاہ میں لے جاتا اور"

"اور ۔ پھر؟"

"پھر ان تمام جانوروں کو باہر نکال کر ایک سرکس کھول لیتا۔"

"افوہ سیلاب تھا چاروں طرف۔" ماسٹر صاحب سر ہلا کر بولے۔ "اور یہ مضمون اتنا لمبا کیوں ہے؟ اسے صرف تین صفحوں کا ہونا چاہیے تھا۔"

روفی کو لمبے لمبے جواب مضمون لکھنے کا بہت شوق تھا۔ اگرچہ وہ ہوتے تھے بالکل یونہی سے۔ تین صفحوں کی قید کو انہوں نے یوں نظر انداز کیا کہ پہلے صفحے پر نمبر ایک لکھا، دوسرے پر نمبر دو۔ اس کے بعد کئی صفحوں کو اکٹھا کر کے پن کر دیا اور اس پر نمبر تین لکھ دیا۔

"اور پھر یہ مضمون اچھا بھی نہیں ہے۔"

"جناب آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ اچھا نہیں ہے۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کو پسند نہیں آیا۔"

"اچھا چلو یوں سہی کہ مجھے پسند نہیں آیا۔ اور یہ تاریخ کے پرچے میں تم نے ایجاد کیا، ایجاد کیا کیوں بار بار لکھا ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ شاہجہان نے تاج محل ایجاد کیا۔ جہانگیر نے جہانگیر کا مقبرہ ایجاد کیا۔ قطب صاحب نے قطب صاحب کی لاٹھ ایجاد کی۔"

"جی یہ اس لیے کہ پہلے ان چیزوں کا کسی کو علم نہیں تھا۔"

"دریافت کیں" میں نے لقمہ دیا۔

"نہیں دریافت بھی نہیں کیں۔ بنائیں، تعمیر کیں۔" ماسٹر صاحب بولے۔

"سچ کہو، تمہارا اسکول کا کام کون کیا کرتا ہے۔ ایمان سے بتاؤ۔"

"جی ۔ رستم کیا کرتا ہے۔"

"اکیلا؟"

"جی نہیں، ہم اس کی مدد کیا کرتے ہیں۔"

"تم دونوں کو اپنا خط خوبصورت بنانا چاہیے۔"

"پھر آپ ہماری اِملا میں غلطیاں نکالیں گے۔"

ماسٹر صاحب شاید کوئی خوشخبری سن کر آئے تھے، ہم سے بالکل خفا نہیں ہوئے۔ چلتے وقت کہنے لگے۔"اتنی غلطیاں میں نے کسی اور کے پرچے میں نہیں دیکھیں۔"

"جی غلطیاں تو ہم سب کرتے ہیں۔ اسی لیئے تو پنسل کے ساتھ ربڑ لگائی جاتی ہے۔" روفی مؤدّبانہ بولے۔

چپراسی بیمار پڑ گیا۔ اس کی ڈیوٹی ہمیں دے دی گئی۔ ٹیلی فون اور ملاقاتیوں کا خیال رکھنا اور اس بے وقوف طوطے کی نگرانی کرنا۔ اس کی بیماری بھی عجیب سی تھی۔ صبح کہتا ہے، نمونیہ ہو گیا ہے۔ شام کو کہتا ہے، نہیں سرسام تھا کبھی کہتا کہ باؤلا کتا کاٹ گیا تھا۔ اسے ثابت کرنے کے لیے اس نے کُتّے کے بھونکنے کی نقل بھی اتاری پھر رستم نے اسے بتایا کہ اس مرض میں مریض مرجاتا ہے لیکن بھونکتا ہرگز نہیں۔ چنانچہ اس نے مرض فوراً بدل لیا۔ یہ مرض تپ دق، مالیخولیا، خون کے دباؤ، زکام وغیرہ سے ہوتا ہوا آسیب پر آکر رکا۔ آخر میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس پر کسی بھوت کا سایہ ہے۔

شام کو ہم باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ باورچی کھانا پکا رہا تھا۔ رستم پاس بیٹھا تھا۔ بھوتوں کے قصّے ہو رہے تھے۔

"رات تم سوتے ہوئے شور مچا رہے تھے۔" میں نے روفی سے کہا۔

"میں بھونکتے ہوئے کتوں کو رات بھر دیکھتا رہا۔ تم نے وہ شور سنا ہوگا۔"

"بھوت تو میں نے دیکھا تھا پچھلے سال۔" باورچی بولا۔

"کیسا تھا؟"

"ایک بہت بڑے گدھے جیسا۔"

"تم اپنے سائے سے ڈر گئے ہو گے۔" رستم نے بتایا۔

"نہیں۔ سچ مچ کا بھوت تھا۔ اُس نے میرا پیچھا کیا۔ میں نے بھاگ کر دروازہ بند کر لیا مگر بھُوت دیوار میں سے نکل آیا۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟"

"میں دوسری دیوار میں سے باہر نکل گیا۔"

"کیا ہانک رہے ہو؟" رستم بولا۔"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ایسا ہوا تھا۔ مگر میں اس وقت خواب دیکھ رہا تھا۔ یہ خواب سنا رہا ہوں۔"

"میں اپنی آپ بیتی سناتا ہوں۔" رستم کہنے لگا۔"مَیں اُن دنوں اپنے کھیت میں کام کیا کرتا تھا۔ کھیت کے راستے میں قبرستان بھی پڑتا تھا اور شمشان بھی۔ ایک دفعہ کیا ہُوا کہ مَیں رات کو کھیت میں پانی لگانے جا رہا تھا کہ شمشان سے میرے پیچھے ایک بھُوت ہو لیا۔ دیکھنے میں وہ بالکل انسانی روپ میں تھا۔ اُس نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ بس میری نقلیں اتارنے لگا۔ میں ڈر سے کانپنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بھی کانپ رہا ہے۔ میری گھگھی بندھی اس کی بھی گھگھی بندھ گئی۔ ایک پیر وہاں رہتے تھے۔ میں اگلے روز ان کے پاس گیا انہوں نے پہلے تو ایک تعویذ لکھا۔ پھر کچھ سوچ کر بولے۔"تم اس مردُود سے کام کیوں نہیں لیتے۔" چنانچہ ان کی ہدایت کے مطابق میں اگلے روز دو ہل اور دو بیل فالتو لے گیا۔ رات کو وہ آیا۔ میں نے اپنا ہل اٹھایا۔ بیل جوتے۔ اُس نے فوراً دوسرا ہل لیا اور بیل جوت لیے۔ میں نے ہل چلانا شروع کر دیا۔ اس نے بھی یہی کیا۔ غرضیکہ رات بھر ہم دونوں نے خوب ہل چلایا۔ علی الصبح وہ واپس چلا گیا۔ اس کے بعد میں نے اس سے ہل چلوایا۔ فصل کٹوائی۔ اناج نکلوایا۔ بوریوں میں بند کروایا۔ پھر اچانک نہ جانے اسے کیا ہو گیا۔ شاید کسی اور بھُوت نے اسے پٹّی پڑھا دی تھی یا کچھ اور وجہ تھی۔ اس کے تیور بدل گئے۔ وہ میری

طرف گھور گھور کر دیکھتا۔ میرے قریب آنے کی کوشش کرتا۔ میں پیر صاحب کے پاس گیا۔ انہوں نے پہلے تو تعویذ لکھا پھر کچھ دیر سوچ کر تعویذ واپس لے لیا اور مجھے ایک تجویز بتائی۔ اس پر میں نے فوراً عمل کیا۔ شام کو میں نے دو گڑھے کھودے۔ ایک میں خوب انگارے دہکائے، دوسرا یونہی رہنے دیا۔ دونوں پر ایک ایک اینٹ جمائی اور اوپر سے راکھ چھڑک دی۔ رات کو وہ آیا۔ میں نے اس سے خوب کام لیا۔ پھر میں نے انگڑائی لی۔ اس نے بھی انگڑائی لی۔ میں بولا بھئی اب تو آرام کرنا چاہیے۔ وہ اسی طرح بولا بھئی اب تو آرام کرنا چاہیے۔ میں راکھ ہٹا کر ٹھنڈی اینٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے بھی اسی طرح کیا دہکتی ہوئی اینٹ پر بیٹھ کر اس نے ایک فلک شگاف نعرہ لگایا اور جو وہاں سے غائب ہوا ہے تو پھر کبھی نہیں آیا۔"

باورچی نے بتایا "جہاں میں پہلے ملازم تھا وہاں حویلی میں ایک بھوت رہتا تھا۔ مگر اس سے کوئی ڈرتا ہی نہ تھا۔ بچے تک اس کا مذاق اُڑاتے۔ جب وہ ڈرانے کی کوشش کرتا تو اسے جھڑک دیا جاتا کہ کیوں بے کار شور مچا رہے ہو۔ ناحق اپنا وقت بھی ضائع کر رہے ہو اور ہمارا بھی۔ کبھی کبھی اسے چائے کی دعوت دی جاتی۔ بھوت رات گئے میرے پاس آتا اور اپنی اس درگت پر آٹھ آٹھ آنسو رویا کرتا۔ سب سے زیادہ غم اسے اس بات کا تھا کہ قاعدے کی رُو سے اس سے سب کو ڈرنا چاہیے تھا اور یہ کہ بحیثیت ایک بھوت کے اسے نہایت ظالم اور سخت دل ہونا چاہیے تھا۔ اُس نے کئی مرتبہ خودکشی کی کوشش بھی کی۔ آخر میں نے ایک روز سُنا کہ بے چارہ کہیں شرم سے سمندر میں ڈوب کر مر گیا۔"

"ایک بھوت ہمارے چپراسی پر بھی تو سوار ہے۔"

"یہ فرضی بیمار ہے۔" رستم بولا۔ اس کا مرض فرضی ہے اس لیے اس کا علاج بھی فرضی ہونا چاہیے۔ جب سب چلے جاتے ہیں تو یہ بالکل تندرست ہو جاتا ہے۔ ساری

دوائیاں کہیں اِدھر اُدھر پھینک دیتا ہے اور علی الصبح اُٹھ کر ورزش کرتا ہے تاکہ سارا دن لیٹے رہنے سے کہیں صحت خراب نہ ہو جائے۔"

"تو کیا یہ جھوٹ بولتا ہے؟" ہم حیران رہ گئے۔

"بالکل! لڑکو دنیا میں جھوٹ ایک نہایت اہم چیز ہے۔ اس کے بغیر گزارا مشکل ہے۔ اب تم جھوٹ بولتے ہو تو تمہیں تھوڑا سا افسوس ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ افسوس غائب ہو جائے گا اور تم بے دھڑک کھُلم کھُلا جھوٹ بولا کرو گے۔ صبح سے جو جھوٹ بولنا شروع کرو گے تو شام تک سراسر جھوٹ بولو گے۔ حیوانوں سے جھوٹ بولو گے انسانوں سے جھوٹ بولو گے۔ یہاں تک کہ خدا سے بھی جھوٹ بولنے کی کوشش کرو گے۔"

کچھ دیر میں ڈاکٹر صاحب کی کار آ گئی۔ وہ مریض کو دیکھنے آئے تھے۔ ہم نے تہیہ کر لیا کہ اب اس مریض کو شفا دلا کر ہی چھوڑیں گے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب کو سلام کیا۔ روفی بولے "جناب مریض کی طبیعت اس قدر خراب ہے کہ وہ آپ سے ملنا نہیں چاہتا۔"

"آج تمہارا ٹمپریچر کتنا تھا؟" ڈاکٹر صاحب نے مریض سے پوچھا۔

"ایک سو آٹھ کے قریب تھا۔"

"اس قدر زیادہ؟"

"کہیں تم نے تھرمامیٹر سے چائے میں شکر تو نہیں ملائی؟" روفی نے کہا۔

"تم نے ہدایت کے مطابق دوائی پی تھی؟" ڈاکٹر صاحب نے سوال کیا۔

"جناب اس نے بوتل پر لکھی ہوئی ہدایت پر عمل کیا ہے کہ کارک کو مضبوطی سے بند رکھو۔" روفی بولے۔

جب ڈاکٹر صاحب نسخہ لکھ رہے تھے تو روفی بڑی سنجیدگی سے منہ بنا کر کہنے لگے۔ "جناب اگر فرصت ہو تو مجھے بھی ملاحظہ فرمائیے۔ میں تندرست رہتا ہوں۔ آج تک بیمار نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ مجھے معمولی سا نزلہ زکام بھی نہیں ہوتا۔ بعض اوقات

تو میں بہت ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے نظام میں کوئی خرابی تو نہیں ہے۔"

ہم علی الصبح اُٹھے۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھتے ہیں تو مریض صاحب کمرے میں ورزش کر رہے ہیں۔ چھلانگیں لگائی جا رہی ہیں۔ ڈنٹر پیلے جا رہے ہیں۔ ہم نے اندر جا کر ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ مولانا یا تو آج صبح سے اپنا ٹیلیفون، وہ نالائق طوطا اور ملاقاتیوں کو سنبھالو۔ ورنہ ہم سب سے کہہ دیں گے۔ آدمی سمجھ دار تھا ـــــ فوراً تندرست ہو گیا۔

اگلے ہفتے ماسٹر صاحب کے ہاں چوری ہو گئی۔ ان کا کنبہ چند دنوں سے کہیں گیا ہُوا تھا۔ اس رات وہ خود بھی کہیں مدعو تھے۔ گھر خالی تھا۔ کوئی موقع پا کر بالکل صفائی کر گیا۔ صبح کو ہم ان کے مکان پر گئے۔ روفی نے بڑے غور سے سب کچھ دیکھا، پھر بولے۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں، خوش قسمتی سے ہم ان دنوں سراغرسانی کی کہانیاں پڑھ رہے ہیں۔"

ہم دونوں نے مشورہ کیا۔ ماسٹر صاحب سے بالکل تھانیدارانہ انداز میں سوال پوچھے۔ پاؤں کے نشان دیکھے، مکان کو اِدھر اُدھر سے سُونگھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک سیاہ رنگ کی بلّی جو برآمدے میں بندھی ہوئی تھی، پکڑ لی گئی۔ یہ بلّی موقع پر موجود تھی۔ اس نے چور کو دیکھا تھا۔ بلّیاں سمجھ دار ہوتی ہیں۔ ان کی آنکھیں رات کو چمکتی بھی ہیں ـــ وہ اندھیرے میں بخوبی دیکھ سکتی ہوں گی۔ یہ چور کو پہچان سکتی ہے۔ اگر اس نے چور کو دیکھا تو غرّائے گی، پنجہ مارے گی یا کسی اور طرح خفگی کا اظہار کرے گی۔ ہم اسے آس پاس سڑکوں پر لیے پھریں گے۔ چور بھی نزدیک ہی رہتا ہو گا۔ یہ کسی بھیدی کا کام تھا۔

شام کو ہم جھیل کے کنارے بیٹھے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ دراصل ہم نے کانٹوں

میں مچھلیاں پہلے سے لگائی ہوئی تھیں۔ پانی میں ڈور تھی اور ڈور کے سرے پر مچھلی۔ یہ رستم کے لیے کیا تھا۔ آج اسے مچھلیاں پکڑ کر دکھا دیں گے۔ جب وہ ہمیں لینے آیا تو چوری کی باتیں شروع ہو گئیں۔ ہمارا خیال تھا کہ لوگ محض دوسروں کو پریشان کرنے کے لیے چوری کرتے ہیں اور یہ ایک قسم کا مذاق ہے۔ وہ ہمیں بتانے لگا کہ لوگ اس لیے چوری نہیں کرتے بلکہ دوسروں کی چیزوں پر قبضہ جمانے کے لیے کرتے ہیں۔ اور پھر ان چیزوں کو کبھی واپس نہیں لوٹاتے۔ اور یہ انسان کی ہوس ہے جو اسے چوری کے لیے اُکساتی ہے۔ کئی لوگ بڑی بڑی چوریاں بھی کرتے ہیں۔ انسانوں کو چُرا لیتے ہیں۔ زمین کے بڑے بڑے خطّوں، برّاعظموں کو چُرا لیتے ہیں۔

اتنے میں شڑپ سے آواز آئی۔ "یہ آواز سُنی تم نے؟" ہم دونوں چلّائے۔

"یہ مچھلی تھی۔"

پھر میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ ڈور کھینچی اور مچھلی باہر نکال لی۔

روفی نے بھی یہی کیا۔

"تم دیکھتے جاؤ، کچھ دیر میں یہاں مچھلیوں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔ تب تو تمہارا شبہ رفع ہو جائے گا۔" ہم نے کہا۔

پھر ہم دوسرے کنارے کی باتیں کرنے لگے کہ جب کبھی ہم وہاں گئے تو رستم کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔ وہ مسکرا کر بولا۔ "لڑکو یہ خود فریبی کی نیلی جھیلیں اور دوسرے کنارے عمر بھر پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ہم زندگی بھر اپنے آپ کو فریب دینے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ یہ یقین دلانے کی کوشش میں کہ جو چیز یہاں نہیں ہے وہ یہاں ہے۔ آج تم نے دو مری ہوئی مچھلیاں اپنے کانٹوں میں اس لیے لگائی تھیں کہ تمہیں اب تک یقین ہے کہ دُنیا جھُوٹی ہے اور تمہارا تصوّر سچّا ہے۔ دوسرے کنارے کے متعلق تم نے کیسے سُہانے خیالات دل میں بسا رکھے ہیں۔ میں وہاں کئی مرتبہ گیا ہوں۔ وہ کنارا بالکل ویران ہے،

اس کنارے سے کہیں بُرا ہے۔ میری مانو تو تم کبھی اس طرف مت جانا، ورنہ تمہیں افسوس ہوگا۔ دوسرا کنارہ بس دُور ہی سے اچھا لگتا ہے۔"

باری باری بلّی پر ہماری ڈیوٹی لگتی۔ رات کو میری ڈیوٹی تھی۔ صبح اُٹھ کر دیکھتا ہوں تو بلّی غائب ہے۔ بہتیرا ڈھونڈا مگر نہ ملی۔ روفی سو رہے تھے۔ میں باہر بھاگا کہ کہیں ایسی ہی کالی بلّی مل جائے تو پکڑ لاؤں۔ یوں تو بلّیاں ہمارے ہاں بھی بہت سی تھیں، لیکن ان میں سیاہ ایک بھی نہیں تھی۔ میں دُعا مانگ رہا تھا کہ یا الٰہی کہیں سے ایک سیاہ بلّی بھیج۔ لوگ کہتے ہیں کہ بچّوں کی دعائیں بہت جلد قبول ہو جاتی ہیں۔ لوگ سچ کہتے ہیں! میں نے سڑک پر ایک آدمی دیکھا جس کے ہاتھ میں تھیلا تھا اور تھیلے میں میاؤں میاؤں ہو رہی تھی۔ اس سے پوچھا وہ بولا کہ اس میں کوئی پندرہ سولہ بلّیاں بند ہیں۔ میں ان سے تنگ آچکا ہوں اور انہیں کہیں دور چھوڑنے جا رہا ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر وہ ایک سیاہ بلّی مجھے نکال دے تو میں اس کا احسان عمر بھر نہ بھولوں گا۔ اُس نے تھیلے میں ہاتھ ڈالا۔ پہلی بلّی سفید تھی۔ اسے واپس بند کیا۔ دوسری چتکبری نکلی تیسری بھوری، چوتھی بادامی۔ ادھر میرا بُرا حال تھا۔ کسی کالی بلّی کے دیدار کے لئے آنکھیں بے تاب ہو رہی تھیں۔ خدا خدا کر کے سیاہ بلّی نکلی اور میں لے کر بھاگا۔ روفی کے جاگنے سے پہلے سیاہ بلّی وہیں بندھی ہوئی تھی۔

"یہ بلّی دو تین دنوں میں کتنی موٹی ہو گئی ہے۔" وہ بولے۔ واقعی یہ نئی بلّی گزشتہ بلّی سے بڑی تھی۔ تیسری رات یہ بلّی بھی بھاگ گئی۔ بدقسمتی سے اس رات بھی میری ڈیوٹی تھی۔ میں بڑا گھبرایا۔ اگر روفی کو پتہ چل گیا تو جان کھا جائیں گے۔ مجھے صبح تک نیند نہ آئی۔ علی الصبح پڑوس میں گیا۔ ان کے ہاں ایک سیاہ بلّی رہتی تھی وہ ان سے ادھار مانگی۔ پہلے تو وہ متعجب ہوئے۔ غالباً پہلی مرتبہ کوئی بلّی اُدھار مانگنے آیا تھا۔ پھر اُنھوں نے اس شرط پر بلّی دی کہ میں تیسرے دن واپس لوٹا دوں گا۔ ساتھ ہی اس کے ناشتے، لنچ اور ڈنر کے متعلق

ہدایتیں کیں کہ ناز و نعم میں پلی ہوئی ہے کہیں دُبلی نہ ہو جائے۔ یہ بلّی بہت موٹی تھی۔ اسے دیکھ کر روفی بولے "بھئی یہ بلّی تو روز بروز موٹی ہوتی جا رہی ہے۔" حالانکہ پہلی بلّیوں کو سارا سارا دن بھوکا رکھا جاتا تھا۔ یہ بلّی عجب شان سے رہتی تھی۔ خوشامدیں کرا کے کھانا کھاتی۔ ذرا ذرا سی بات پر بُرا مان جاتی اور دیر تک رُوٹھی رہتی۔ آتے ہی اُس نے روفی کے ابّا پر پنجہ اُٹھایا اور روفی سوچنے بیٹھ گئے کہ سراغرسانی کے قواعد کے مطابق تو اُن پر شبہ کرنا چاہیے۔ پھر کہنے لگے کہ محض پنجہ اٹھانے سے شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلّی کو کچھ اور بھی کرنا چاہیے۔ شام کو ماسٹر صاحب آئے ان پر بلّی نے نہ صرف پنجہ اٹھایا، بلکہ آنکھیں بھی دکھائیں اور دانت بھی نکالے، تو گویا ماسٹر صاحب نے خود اپنا سامان چرایا تھا۔ ان کے پوچھنے پر ہم نے تفصیل بتائی۔ وہ بولے "تم ناحق اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ بھلا بلّیوں سے بھی کبھی سراغ نکلے ہیں۔"

"اور اگر سُراغ نکل گیا تو؟"

"تو شرط رہی، جو کچھ تم کہو گے کروں گا۔"

تیسرے روز مجھے وہ بلّی واپس کرنی پڑی۔ نئی بلّی کی تلاش میں پھر مارا مارا پھرا۔ بڑی مصیبتوں سے ایک لڑکے سے ایک روپے میں ایک مریل سی کالی بلّی خریدی۔ اسے دن بھر تو میں نے چھپائے رکھا۔ رات کو روفی نے دیکھا تو بڑا افسوس ظاہر کیا۔ "آئے ہائے بے چاری بلّی۔ اسے کیا ہو گیا۔ یکلخت اتنی دُبلی کیسے ہو گئی؟"

ہمیں جب فرصت ملتی، بلّی کو لے کر باہر نکل جاتے۔ اسی امید پر کہ چور اب ملا۔ اب ملا۔

اور پھر خدا کا کرنا کیا ہوا۔ اسی مریل سی بلّی نے جو اس قدر صلح پسند اور خاموش طبیعت تھی، سب کے سامنے رسّی تڑا کر چھلانگ لگائی اور چپراسی کے اُوپر سوار ہو گئی۔ یہ وہی چپراسی تھا جس نے کچھ عرصہ پہلے اپنے عجیب و غریب مرض سے شفا پائی تھی۔

بلّی اسے نوچے ڈالتی تھی۔ پنجے مار رہی تھی، غرّا رہی تھی ۔۔۔ ہم نے بمشکل اسے چھڑایا۔

بلّی کی اس حرکت پر سب کو چپراسی پر شبہ ہو گیا۔ جب اسے ڈرایا دھمکایا گیا تو وہ مان گیا کہ اس نے چوری کی تھی۔ اگلے روز تک ماسٹر صاحب کی سب چیزیں واپس مل گئیں۔ ہماری بڑی تعریفیں ہوئیں۔ بلّی کی بھی تعریفیں ہوئیں۔ ہماری سراغ رسانی کو سراہا گیا۔ ہماری تصویریں بلّی کے ساتھ اتاری گئیں۔

اور حقیقت کا صرف مجھے علم تھا۔ بلّی کے متعلق بھی اور چور کے متعلق بھی۔ چور تو محض اپنی بدقسمتی سے پکڑا گیا۔ ہوا یوں کہ بلّی دو دن سے بھوکی تھی۔ اُدھر وہ سیدھا باورچی خانے سے نکلا تھا۔ جب وہ بلّی کے سامنے سے گزرا تو اس میں سے پلاؤ اور بھُنے ہوئے گوشت کی خوشبو بُری طرح آ رہی تھی۔ بلّی نے جو کچھ کیا وہ سُراغ رسانی کے سلسلے میں نہیں بلکہ بھُوک سے تنگ آ کر کیا۔

میں اور روفی باغ میں بیٹھے تھے۔ سامنے پھلوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہمارے ذمّے یہ کام لگایا گیا تھا کہ ہم چھانٹ کر کچے پھل الگ کر دیں اور پکے الگ۔ روفی بڑے غور و خوض سے چھانٹ رہے تھے۔ ایک ایک پھل پر بڑی دیر لگاتے تھے۔ میں نے پوچھا تو بولے "یہ انتخاب ہے جو مجھے مارے ڈالتا ہے۔ جانتے نہیں ہم آج کل کس قسم کی کہانیاں پڑھ رہے ہیں؟"

"میرے خیال میں پھل چکھ کر چھانٹے جائیں۔" میں نے مشورہ دیا۔ ہم نے پکے پھل کھانے شروع کر دیے۔ ماسٹر صاحب تشریف لے آئے۔ وہ ہمارا شکریہ ادا کرنے آئے تھے۔ "لڑکو! میں شرط ہار گیا۔ بتاؤ میں کیا کروں؟"

"آپ پچاس مرتبہ خوش خط لکھیے کہ میں ہار گیا۔" روفی بولے اور ماسٹر صاحب نے سچ مچ لکھ دیا۔

مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب رُوفی اور میں جھیل کے کنارے لمبی لمبی گھاس میں بیٹھے تھے۔ رات کو بارش ہوئی تھی۔ صبح بالکل صاف طلوع ہوئی۔ خنک ہوائیں چل رہی تھیں۔ بادل تیر رہے تھے۔ جھیل کے نیلے پانی پر ہلکی ہلکی دُھند چھائی ہوئی تھی۔ ہر چیز میں نکھار تھا، تازگی تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے دنیا ابھی ابھی تخلیق ہوئی ہے۔

ہم کہانیاں پڑھتے رہے۔ باتیں کرتے رہے، کھیلتے رہے۔ زقندیں بھرتے ہوئے پرندوں اور ناچتی ہوئی تتلیوں کو دیکھتے رہے۔ ہماری ڈوریں پانی میں تھیں، دن بھر ہمیں مچھلیوں کا انتظار رہا۔ ہم انہیں بھُوننے کا سارا سامان لائے تھے۔ دن ڈھلے ہمیں رستم لینے آیا۔ ایسے خوشنما نظارے کو دیکھ کر وہ بھی ہمارے پاس بیٹھ گیا اور عجیب عجیب سی باتیں سنانے لگا۔ جب رستم ایسی باتیں کرتا تو وہ ہمیں بالکل اچھا نہ لگتا۔ وہ بڑی سنجیدہ قسم کی باتیں کر رہا تھا کہ "کیا ہو جو زندگی اسی خود فراموشی اور خود فریبی میں گزر جایا کرے۔ اسی طرح مسکراتی ہوئی گزر جایا کرے۔ لیکن یوں نہیں ہوتا۔ کوئی کتنی ہی کوشش کرے ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ ان خوابوں سے چونکنا پڑتا ہے۔" وُہ ہمیں بتانے لگا "لڑکو! تم بڑے ہو گے تو تمہیں افسوس ہو گا۔ جوں جوں تمہارا تجربہ بڑھتا جائے گا۔ تمہارے خیالات میں پختگی آتی جائے گی یہ افسوس بھی بڑھتا جائے گا۔ یہ خواب پھیکے پڑتے جائیں گے۔ تب اپنے آپ کو فریب نہ دے سکو گے۔ بڑے ہو کر تمہیں معلوم ہو گا کہ زندگی بڑی مشکل ہے۔ جینے کے لئے مرتبے کی ضرورت ہے۔ آسائش کی ضرورت ہے اور ان کے لیے روپے کی ضرورت ہے اور روپیہ حاصل کرنے کے لئے مقابلہ ہوتا ہے۔ مقابلے میں جھوٹ بولنا پڑتا ہے، دھوکا دینا پڑتا ہے، غدّاری کرنی پڑتی ہے۔ یہاں کوئی کسی کی پروا نہیں کرتا۔ دنیا میں دوستی، محبت، انس، سب رشتے مطلب پر قائم ہیں۔

محبت آمیز باتوں، مسکراہٹوں، مہربانیوں، شفقتوں — ان سب کی تہ میں کوئی غرض پوشیدہ ہے۔ یہاں تک کہ خدا کو بھی لوگ ضرورت پڑنے پر یاد کرتے ہیں اور جب خدا دعا قبول نہیں کرتا تو لوگ دہریے بن جاتے ہیں۔ اس کے وجود سے منکر ہو جاتے ہیں۔ اور دُنیا کو تم کبھی خوش نہیں رکھ سکتے۔ اگر تم سادہ لوح ہوئے تو دُنیا تم پر ہنسے گی، تمہارا مذاق اُڑائے گی۔ اگر عقلمند ہوئے تو حسد کرے گی۔ اگر الگ تھلگ رہے تو تمہیں چڑچڑا اور مکّار گردانا جاتے گا۔ اگر ہر ایک سے گھُل مِل کر رہے تو تمہیں خوشامدی سمجھا جائے گا۔ اگر سوچ سمجھ کر دولت خرچ کی تو تمہیں پست خیال اور کنجوس کہیں گے اور اگر فراخ دل ہوئے تو بیوقوف اور فضول خرچ۔ عمر بھر تمہیں کوئی نہیں سمجھے گا، نہ سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ تم ہمیشہ تنہا رہو گے۔ حتّیٰ کہ ایک دن آئے گا اور چپکے سے اس دُنیا سے رخصت ہو جاؤ گے۔ یہاں سے جاتے وقت تم متحیّر ہو گے کہ یہ تماشا کیا تھا۔ اس تماشے کی ضرورت کیا تھی۔ یہ سب کچھ کس قدر بے معنی اور بے سُود تھا۔"

سُورج غروب ہو رہا تھا۔ یکایک دوسرا کنارہ جگمگا اٹھا۔ وہاں بادل کے ٹکڑوں اور دھُند نے ایسا رنگین اور خوشنما محل بنا دیا کہ ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ نازک سی حسین محرابیں، رنگ برنگے برُج اور مینارے، بل کھاتے ہوئے زینے، دُور دُور تک پھیلی ہوئی فصیلیں۔

ہم نے رستم کو اشارے سے یہ محل دکھایا۔ "کون کہتا ہے کہ وہ کنارہ بھی ایسا ہی ہے۔ وہ دیکھو۔"

پھر سب کچھ نیلا ہو گیا۔ آسمان، جھیل، بادل اور فضا اور دوسرا کنارہ۔ کائنات نیلی ہو گئی۔ بادلوں کا بنا ہوا وہ حسین محل سنگِ مرمر کا بن گیا اور اس پر ہلکی ہلکی چاندنی چھا گئی۔

ان باتوں کو کافی سال گزر چکے ہیں اور اب مجھے دُور اندیش، جہاندیدہ اور عقل مند ہونا چاہیے، لیکن بدقسمتی سے یہ طویل عرصہ مجھ میں ذرا بھی تبدیلی نہ لا سکا۔

جب کبھی زندگی کی تلخیاں سامنے آتی ہیں، کریہہ حقیقتیں حسین و نازک خوابوں کو کچل ڈالتی ہیں، تب میں کسی ایسی ہی نیلی جھیل کے کنارے پناہ لیتا ہوں — اور زندگی میں ان جھیلوں کا تار بندھا ہوا ہے۔ تاحدِ نگاہ یہ جھیلیں اس طرح چلی گئی ہیں کہ جہاں ایک ختم ہوتی ہے وہاں دوسری شروع ہو جاتی ہے۔

اور جہاں حقیقت کی حدیں تصوّر کی حدوں کو چھوتی ہیں — وہاں ایک پُراسرار خطّہ ہے۔ بالکل ویسا ہی حسین اور دلکش — دوسرا کنارہ!

بے بی

اس مرتبہ جو میں نے ایک اُونچے پتھر سے چھلانگ لگائی تو ندی کی تہہ سے ایک چمکیلا گول پتھر لایا۔ ہوا خنک تھی اور پانی سے باہر نکلتے ہی سردی لگتی تھی۔ اس لیے میں تیرتا ہوا پانی کے بہاؤ کے ساتھ نیچے چلا گیا۔ درختوں کے جھنڈ میں ایک جگہ پھول دار بیلیں ندی پر جھکی ہوئی پانی کو چھو رہی تھیں۔ وہاں غوطہ لگایا اور دُور جا کر نکلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ بالکل سامنے پتھر پر ایک پختہ عمر کا شخص بیٹھا ہے۔ اس کے منہ میں لمبا سا پائپ تھا اور ہاتھ میں مچھلیاں پکڑنے کی بنسی۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ مجھے یاد آ گیا۔ اسے ہر روز کہیں نہ کہیں ضرور دیکھتا تھا۔

"ایک غوطہ میرے لیے لگاؤ۔" وہ بولا۔ "اس پتھر کے نیچے کئی مچھلیاں شرارتاً چھپی ہوئی ہیں۔ ذرا انہیں باہر نکال دو۔"

میں نے غوطہ لگایا۔ کافی تلاش کی، نیچے کوئی مچھلی نہیں تھی۔ باہر نکل کر اسے بتایا۔ وہ بہت ہنسا۔ بولا۔ "میرے پاس نہایت مزے دار سینڈوچ ہیں۔ ایک تم بھی چکھو۔"

میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے ایک بڑی سی سینڈوچ مجھے دی، ایک خود کھانے لگا۔ شاید وہ پچپن چھپن کا ہو گا، لیکن اس کی عمر کا صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا کیونکہ اس کے چہرے پر بلا کی تازگی اور شگفتگی تھی۔ مسکراہٹ تھی کہ پھوٹی پڑتی تھی۔ اس نے بڑے

شوخ کپڑے پہن رکھے تھے اور ہیٹ میں ایک خوشنما پَر لگا ہوا تھا۔

"آج میں نے رنگ برنگی تتلیاں پکڑی ہیں۔ شام کو میں انہیں البم میں لگاؤں گا۔ یہ دیکھو۔" اُس نے مجھے تتلیاں دکھائیں۔

"آپ کے پاس تتلیوں کا البم ہے؟" میں نے بڑے شوق سے پوچھا۔

"ہاں! اور پھولوں کا البم بھی ہے۔ پرندوں کے رنگین پروں کا البم بھی۔ میرے ہیٹ میں جو پَر لگا ہے، اس سے کہیں خوشنما پَر البم میں ہیں۔"

میں اکثر اسے جنگلوں میں پھرتے دیکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ تنہا ہوتا۔ اس کے ہاتھ میں تتلیاں پکڑنے کا جال ہوتا اور گردن میں کیمرہ اور تھیلا۔

ہم باتیں کرتے کرتے واپس اس جگہ آ گئے جہاں میرے کپڑے رکھے تھے۔ اس نے میرا بلیزر دیکھا۔

"یہ کرکٹ کا کلر تمہیں کب ملا؟"

"چند مہینے ہوئے۔"

"تب تو تم بہت اچھے کھلاڑی ہو گے۔ بولر ہو یا بیٹسمین؟"

"بولر ہوں۔"

"سلو یا فاسٹ؟"

"فاسٹ۔"

میں نے کلر جیتنے کی ساری داستان سنائی۔ کچھ جھوٹ کچھ سچ۔ اُس نے بڑی دلچسپی سے سب کچھ سُنا۔

"مجھے بھی کرکٹ کا خبط ہے، لیکن میں کبھی اسے سیکھ نہ سکا۔ مجھے بولنگ سیکھنے کا تو بے حد شوق ہے۔ کیا تم مجھے سکھا دو گے؟"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ بھلا اس عمر میں بولنگ سیکھنے کا کیا فائدہ۔ لیکن بڑی

سنجیدگی سے اس نے دوبارہ یہی سوال کیا۔

"آپ کو تھوڑی بہت تو آتی ہو گی۔"

"نہیں بالکل نہیں آتی، لیکن سکھاؤ گے تو بہت جلد سیکھ جاؤں گا۔ میرے پاس چند بلے اور گیندیں ہیں۔ جال اور وکٹیں یہاں نہ مل سکیں تو سری نگر سے منگا لیں گے۔"

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس نے بتایا کہ وہ آسٹریلیا سے یہاں آیا تھا۔ ہندوستان میں کافی دنوں سے ہے۔ گلمرگ میں اکیلا آیا ہے۔ اسے کرکٹ کا نہایت شوق ہے۔ اس نے انگلینڈ اور آسٹریلیا کے بڑے بڑے ٹیسٹ میچ دیکھے ہیں۔ کئی مشہور کھلاڑیوں کو جانتا بھی ہے۔ میں نے بریڈمین اور اوریلی کے متعلق بے شمار سوال پوچھے۔ پھر میں نے ہندوستانی کھلاڑیوں کی باتیں سنائیں۔ اچھے اچھے میچوں کا ذکر کیا۔ میرا ہوٹل پہلے آتا تھا۔ میں نے اسے چائے پر ٹھہرا لیا۔ چائے کے بعد اسے اپنے البم دکھائے۔ اور پرندوں کے تھوڑے سے رنگین پَر۔

طے ہوا کہ اگلے روز ہم اکٹھے تتلیاں پکڑنے چلیں۔ تصویریں بھی اتاریں گے اور کہیں ایک آدھ مچھلی مل گئی تو اسے بھی پکڑ لیں گے۔ پھر شام کو کرکٹ کے لیے میدان درست کیا جائے گا۔ میں اکیلا گلمرگ آیا ہوا تھا۔ سالانہ امتحان ہوا۔ اس قدر کٹھن اور طویل کہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ جس دن امتحان ختم ہوا۔ میں نے بستر باندھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں گلمرگ میں تھا۔ ہوٹل میں ٹھہرا۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک بھی مانوس چہرہ نظر نہ آیا، بڑی مایوسی ہوئی۔ چند ہی دنوں میں بیزار ہو گیا۔ عجب تماشا تھا کہ ایسی پُر رونق جگہ میں میرا جی ایسا اُچاٹ ہوا کہ وقت گزارنا مشکل ہو گیا۔ مجھے ان دنوں کرکٹ کا کلر نیا نیا ملا تھا۔ اس لیے بلیزر پہننے کا اتنا شوق تھا کہ میں اور کوئی کوٹ ہی نہیں پہنتا تھا۔ صبح صبح بلیزر پہن کر نکل جاتا اور سارا دن اِدھر اُدھر پھرتا رہتا۔ شام کو آتا، بلیزر اُتار کر سو جاتا۔

اگلے روز ہم اکٹھے سیر کو گئے۔ دن بھر کرکٹ کی باتیں ہوتی رہیں۔ ہماری عمروں میں اس قدر نمایاں فرق تھا، پھر بھی ہم اتنی جلدی بے تکلف ہو گئے۔ شام کو ان کی چھوٹی سی کوٹھی میں چائے پی گئی۔ سامنے ایک باغیچہ اور میدان تھا۔ اس میں ہم نے جگہ منتخب کی اور دیر تک زمین ہموار کرتے رہے۔ میں نے ان کا نام پوچھا۔ نام بتا کر کہا۔

"یہ نام تو طویل سا ہے اور مجھے پسند بھی نہیں ہے۔ میرے دوست مجھے فرینکی کہتے ہیں تم بھی فرینکی کہا کرو۔"

میں سوچنے لگا کہ فرینکی تو کوئی ہم عمر دوست ہی کہہ سکتا ہے اور یہ مجھ سے اتنے بڑے ہیں۔ مجھے ان کا ادب کرنا چاہیے۔ لیکن انہوں نے اصرار کیا۔ آخر ایک مختصر سی بحث کے بعد طے ہوا کہ میں انہیں انکل فرینکی کہا کروں۔

اُنہوں نے البم دکھائے۔ اس قدر پیاری تتلیاں، رنگ برنگے پَر اور شوخ پھول۔ ایسے خوبصورت مجموعے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ پھر انہوں نے طرح طرح کی سیپیاں، گھونگے اور منکے دکھائے۔ میرے لیے یہ سب کچھ کسی خزانے سے کم نہ تھا۔

ہم نے دو دن صرف کر کے کرکٹ کھیلنے کے لیے موزوں جگہ بنائی۔ جال لگایا، کٹیں گاڑیں، سبق شروع ہوتے۔ میں نے گیند پکڑنے کا طریقہ بتایا۔ قدم گن کر دکھائے۔ بازو گھما کر گیند پھینک کر دکھائی۔ جب وہ اچھی طرح سمجھ گئے تب ان سے کہا کہ اب آپ پھینکیے۔ میں بلا لے کر وکٹوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ان کی پہلی گیندیں تو بمشکل مجھ تک پہنچ سکیں چند گیندیں جال سے باہر نکل گئیں۔ کئی میرے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ مجھے ان کے سٹائل پر بڑی ہنسی آتی۔ یہ تو شاید ہی سیکھ سکیں۔

کئی دنوں تک یہی ہوتا رہا حتیٰ کہ میں بالکل نااُمید ہو گیا۔ لیکن ان کا جوش و خروش

بدستور تھا۔ وہ الٹی سیدھی گیندیں پھینک کر قہقہے لگاتے۔ ہنستے ہنستے ان کا چہرہ گلابی ہو جاتا۔ وہ بے حد زندہ دل تھے۔ حالانکہ ان کی عمر ایسی تھی کہ انہیں کم گو اور قنوطی ہو جانا چاہیے تھا لیکن نہ جانے کیوں ان کی ایک ایک حرکت میں بچپنا تھا۔ بات بات میں شوخی تھی، زندگی تھی۔

ہر روز ہم اکٹھے باہر جاتے۔ درختوں پر چڑھتے، پرندوں کے گھونسلوں سے رنگین انڈے اور پَر چراتے۔ تتلیوں کا تعاقب کرتے، خود رَو پھول توڑتے، بھاگ بھاگ کر بے حال ہو جاتے۔ شام کو کرکٹ شروع ہوتی۔ میں گیند پھینکنے کی قسمیں بتاتا کہ کس موقع پر کیسی گیند پھینکنی چاہیے۔ اس کے بعد وہ عجب اوٹ پٹانگ گیندیں پھینکنی شروع کرتے اور میں بھی ہنس ہنس کر دوہرا ہو جاتا۔

ایک شام کو وہ بولے کہ آج کلب میں رقص ہے، وہاں چلیں گے۔ میں نے معذرت کی کہ اوّل تو مجھے رقص کا اتنا شوق نہیں، دوسرے یہ کہ میں نے آج تک والز نہیں کیا، تیسرے مَیں اس لباس میں کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہوں۔ وہ بولے۔ والز تو میں ابھی سکھائے دیتا ہوں، رہ گیا لباس، سو دیکھ لینا تم اس لباس میں ایسے جچو گے کہ ساری نگاہیں تم پر ہوں گی۔ انہوں نے مجھے آسان سے سٹیپ بتائے۔ ایک، دو، تین۔ ایک، دو، تین۔ میں نے نقل اتاری۔ ایک، دو، تین۔

گراموفون پر ریکارڈ لگایا گیا اور وہ میرے ساتھ رقص کرنے لگے۔ مجھے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گئی۔ ریکارڈ بج رہا ہے۔ ہم دونوں رقص کر رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ ہدایتیں مل رہی ہیں۔ تم مجھے اپنی پارٹنر سمجھو، میرا ہاتھ مت جھٹکو، میرے پاؤں مت کچلو، یوں منہ مت بناؤ، گھبراؤ مت۔

ذرا سی دیر میں مَیں سٹیپ سیکھ گیا۔ چلتے وقت مَیں پھر ہچکچانے لگا۔ وہ بولے۔ بُھتیجے زندگی میں یہ شام پھر کبھی نہیں آئے گی۔ زندگی بے حد مختصر ہے اور رنگین شامیں

گِنی گنائی ہیں۔ سمجھ لو کہ جو لمحہ گزر گیا، پھر کبھی نہیں آئے گا۔ لو اب مسکرانے لگو۔"

کلب کے برآمدے میں پہنچ کر وہ بولے "تم اس کھڑکی سے سب لڑکیوں کو دیکھ لو۔ اور مجھے بتاؤ کہ کس کے ساتھ ناچو گے۔"

میں نے ایک سرے سے لڑکیوں کو دیکھنا شروع کیا — یہ سیاہ گاؤن — نہیں یہ شوخ بہت معلوم ہوتی ہے — یہ سنہری نیک لیس — اس کی ناک بہت لمبی ہے۔ نزدیک جانے پر کہیں چبھ نہ جائے۔ یہ سُرخ بالوں والی — اس کی صحت ضرورت سے زیادہ اچھی ہے — یہ سبز ربن — یہ بھی یونہی ہے۔ اور پھر دفعتہً نگاہیں ایک چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ یوں محسوس ہوا جیسے اسے پہلے کہیں دیکھا ہے۔ اس سنگِ مرمر کے مجسّمے کو ضرور کہیں دیکھا ہے۔

میرے کندھے پر ایک ہاتھ آگیا۔ "کون سی ہے؟" وہ پوچھ رہے تھے میں نے اشارے سے بتایا۔ بولے۔ "انتخاب کی داد دیتا ہوں۔ سچ پوچھو تو میری نگاہ بھی اسی پر تھی۔ اگر میں تمہاری عمر کا ہوتا تو اسی کو چنتا۔ اب تمہارے لیے مجھے اس کی بوڑھی اُستانیوں کے ساتھ ناچنا پڑے گا۔ چلو اندر چلیں۔"

ہم اندر گئے اور سچ مچ بہت سی نگاہیں ہم پر جم کر رہ گئیں۔ میرا تعارف کرایا گیا۔ پہلے معمر خواتین سے جو اس کی اُستانیاں تھیں۔ پھر اس سے۔ اس کا نام روبی تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ چہرہ میں نے بارہا دیکھا ہے۔ ان گلابی رسیلے ہونٹوں، ان شگفتہ رخساروں، ان ساحر آنکھوں کو بار بار دیکھا ہے، لیکن یہ نام پہلی مرتبہ سنا ہے۔ ویسے میں اسے جانتا ضرور ہوں۔

"اُسے رقص کے لیے کہو۔" فرینکی میرے کان میں بولے۔

میں جھجکتا ہوا بڑھا۔ موسیقی شروع ہو گئی اور میں نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔

چاروں طرف ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ مدھم سروں میں بلیو ڈینیوب بج رہا تھا۔ جیسے ایک جھلمل جھلمل کرتی ہوئی ندی بہہ رہی تھی۔ شفاف نیلگوں پانی میں لہریں مچل رہی تھیں۔ بڑے بڑے کنول کے پھول ہلکورے لے رہے تھے۔ ہوا کے تیز جھونکے آتے اور پانی کی سطح پر ننھے منے رنگین پھول نکل آتے۔ یہ پھول بڑھتے گئے۔ پھر ان پر سرخ تتلیاں آگئیں۔ اتنی ساری تتلیاں کہ سب کچھ سرخ ہو گیا۔ پھر تتلیاں شعلے بن گئیں۔ چاروں طرف شعلے ہی شعلے لپکنے لگے۔ بادل گرجا، بجلی کوندی۔ ننھی ننھی بوندیں برسنے لگیں۔ شعلے غائب ہو گئے۔ چاند نکل آیا۔ چاروں طرف چاندنی پھیل گئی۔ بادلوں کے ٹکڑے چاند کے سامنے سے گزر گئے۔ سفید سفید پرندوں کی قطاریں اُڑتی ہوئی چلی گئیں۔ چاند آسمان کو عبور کرتا ہوا نیلے نیلے گنبدوں کے پیچھے چلا گیا۔ ٹمٹماتے ہوئے تارے طلوع ہوئے اور ان کی چمک بڑھنے لگی۔ ان میں حرکت پیدا ہوئی۔ دیکھتے دیکھتے وہ ایک دوسرے سے ٹکرا کر ٹوٹ گئے۔ تاریکی پھیل گئی۔ پھر کہیں سے جگنو آگئے۔ ایک جھنجھناہٹ کے ساتھ سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ موسیقی تمام ہوئی۔ والز ختم ہو گیا! دفعتاً محسوس ہوا کہ میں ایک نیلے چاند کو بازوؤں میں لے کر فضاؤں میں پرواز کر تا رہا ہوں۔

"یہ میرا پہلا والز ہے۔" میں نے کہا۔

"میرا بھی پہلا والز ہے۔" وہ بولی۔

میں کچھ کہنے کے لیے الفاظ تلاش کرنے لگا۔ "باہر بڑا اندھیرا ہے۔ نہ جانے چاند کب نکلے گا۔"

"مجھے بھی چاند کا بڑا انتظار رہتا ہے۔ مجھے چاندنی بہت پسند ہے۔"

"بلیو ڈینیوب میری محبوب گت ہے۔"

"میری بھی۔"

موسیقی شروع ہو گئی۔ ہم پھر رقص کرنے لگے۔ بدستور ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

"معاف کیجیے۔ مجھے کچھ بھی نہیں آتا۔ نہ رقص کرنا آتا ہے، نہ باتیں کرنا آتی ہیں، نہ لباس پہننے کی تمیز ہے۔"

"جی میں نے بھی رقص نیا نیا سیکھا ہے۔ یہ بھڑکیلا لباس مجھے بالکل پسند نہیں۔ میری سہیلیوں کا اصرار تھا کہ آج مَیں اپنے نام کے مطابق رُوبی رنگ کا لباس پہنوں، لیکن مجھے شوخ کپڑے ذرا نہیں بھاتے۔"

"آپ کو تو ہر لباس سج جائے گا۔"

اس کی آنکھیں جُھک گئیں۔

"آپ کے خدوخال مشرقی ہیں۔ یہ سیاہ آنکھیں، سیاہ بال اور محجوب نگاہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی مشرقی محل سرائے سے کوئی شہزادی نکل آئی ہو۔"

"جی، یہ آنکھیں اور یہ بال میری امّی کے ہیں۔ وہ ہسپانیہ کی ہیں میرے ابّا آئرش ہیں۔ میرے ساتھ کئی ہندوستانی لڑکیاں بھی آئی ہوتی ہیں۔ وہ اکثر مجھے یہاں کا لباس پہنا دیا کرتی ہیں۔"

نئی دُھن شروع ہو گئی، لیکن ہم دونوں باہر برآمدے میں چلے گئے اور سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ آسمان میں تارے بڑی تیزی سے چمک رہے تھے۔ موسیقی کی ہلکی ہلکی صدا آ رہی تھی۔

اس نے مجھے بتایا کہ اسے ہندوستان میں آئے تھوڑا سا عرصہ ہوا ہے۔ بمبئی میں اس کے چچا ایک بہت بڑی فرم میں ہیں۔ وہ وہاں لڑکیوں کے کالج میں پڑھتی ہے۔ لڑکیوں کا ایک گروپ اُستانیوں کے ساتھ کشمیر آ رہا تھا۔ اس کے چچا نے اسے ساتھ بھیج دیا۔ ان دنوں اس کی امّی اور ابّا دوسرے ملکوں میں گئے ہوتے ہیں۔ بمبئی سے گزرتے

ہوئے اسے چچا کے پاس چھوڑ گئے۔ بہت جلد وہ اسے واپس آئرلینڈ بلا لیں گے۔ اسے ہندوستان بہت پسند آیا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ یہاں کچھ عرصہ اور رہے۔

ہم واپس ہال میں آئے تو بلیو ڈینیوب بج رہا تھا۔ میں نے کچھ دیر کے لیے جیسے کنول کے پھولوں کو ہاتھوں میں تھام لیا اور بلندیوں میں رقص کرنے لگا۔

جب رُوبی اپنی اُستانیوں اور سہیلیوں کے ساتھ چلی گئی تو ہال سنسان ہو گیا۔

فرینکی کی دیکھا دیکھی میں نے بھی شوخ کپڑے پہننے شروع کر دیے۔ صبح صبح میں نے ایک نہایت شوخ چیک کی قمیض پہنی جس میں بے شمار رنگ تھے۔ رنگین پھول دار سکارف گلے میں لپیٹا۔

فرینکی بولے۔ "تم بالکل کاؤ بوائے معلوم ہوتے ہو۔ صرف ایک کاؤ بوائے ہیٹ کی کسر ہے۔ وہ میں تمہیں دیے دیتا ہوں۔"

انہوں نے ایک چھجے دار ہیٹ مجھے دیا۔ ہم گھوڑوں پر باہر نکلے۔ فرینکی بولے۔

"بالکل کاؤ بوائے، ہُو بہو کاؤ بوائے۔۔۔ یاہُو وُو۔۔!"

میں نے کاؤ بوائے کی طرح چلّا کر کہا "یپی ہی ہی ی۔"

آبادی سے نکل کر اُنہوں نے پوچھا "تمہیں کاؤ بوائز کے گانے آتے ہیں؟"

"ہاں آتے ہیں" میں نے گانا شروع کیا۔ انہوں نے ساتھ دیا۔

گانے میں یہ بار بار آتا تھا۔

"یپی یا یا یا یپی یا۔

یپی یے یے یے یپی یے۔"

ایک جگہ ہم نے گھوڑوں کو باندھا اور تتلیوں کی تلاش میں نکل گئے۔ ایک جھنڈ میں

دیکھتے ہیں کہ کئی لڑکیاں بیٹھی ہیں ـــــ ارے یہ تو وہی ہیں۔ یہاں رُوبی بھی ہوگی۔ رُوبی بھی تھی۔

اُستانیوں کے سامنے پتھروں کا چھوٹا سا ڈھیر تھا۔ غالباً معدنیات یا جمادات پر لیکچر ہو رہا تھا۔ ہم بھی اسی جھرمٹ میں جا بیٹھے۔ لیکچر ختم ہوا تو لنچ شروع۔ مجھے کہا گیا۔ میں نے معذرت کی۔

"لنچ نہیں کھاتے؟" اُستانیاں حیران ہو کر بولیں "آخر کیوں؟"

"دیکھیے تو سہی کا ڈبوائے ہو کر لنچ نہیں کھاتا۔" فرینکی کہنے لگے۔ یہ کاؤبوائے والا نام بہت پسند کیا گیا۔ جب رُوبی نے مجھے کیک کا ٹکڑا دیا تو میں انکار نہ کر سکا۔ کئی بار ہماری انگلیاں چُھو گئیں۔

طے ہوا کہ اور آگے چلیں۔ اُستانیوں کو جغرافیے کے سلسلے میں کسی خاص قسم کے پتھروں کی تلاش تھی۔ بہت ڈھونڈا لیکن نہ مل سکے۔ ایک جھیل آئی۔ وہ کہنے لگیں کہ شاید اس کی تہ میں ہوں۔ اب سوال پیدا ہوا کہ تہ سے نکالے کیونکر جائیں۔ فرینکی نے تھیلے سے تیرنے کا لباس نکالا اور مجھے دیا۔ میں جھیل میں کود گیا۔ تہ میں پتھر تھے تو سہی، لیکن عجب بے ڈھنگے اور بھاری۔ بڑی مصیبتوں سے ایک پتھر ہلایا۔ اس مرتبہ پانی میں اتنی دیر ٹھہرنا پڑا کہ دم ٹوٹنے لگا۔ پتھر باہر لایا۔ معائنے کے بعد بتایا گیا کہ یہ کسی اور قسم کا پتھر ہے۔ میں نے پھر غوطہ لگایا۔ کئی مرتبہ کوشش کی۔ جب سردی لگنے لگی تو میں باہر نکل آیا۔ شام ہو چکی تھی۔ ہم واپس لوٹے۔ میں اور رُوبی پیچھے رہ گئے۔ میں نے اُسے جی بھر کے دیکھا۔ جب کہیں مشکل سا راستہ آتا تو میں اسے اپنے بازو سے سہارا دیتا۔ میں نے پھول توڑ کر اسے دیے۔ تھوڑی سی باتیں بھی ہوئیں۔

جب میں اور فرینکی گھوڑوں پر واپس جا رہے تھے تو وہ بولے۔ "یہ لڑکی تمہیں پسند کرتی ہے۔"

"کون سی لڑکی؟"

"رُوبی۔"

"سچ مچ؟"

"ہاں۔ اور شاید اور زیادہ پسند کرنے لگے۔"

"آپ کو کس نے بتایا؟"

"اُس کی نگاہوں نے ـــ آج وہ تمہیں ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی کہ مجھے یقین ہو گیا۔ جب تم نے غوطہ لگایا اور دیر تک اندر رہے تو وہ اتنی بے چین ہوئی کہ اگر تم کچھ دیر اور اندر رہتے تو وہ پانی میں کود جاتی۔"

"لیکن۔"

"میں بڑا شریر ہوں بھتیجے۔ میں نے ایسے کھیل کئی مرتبہ کھیلے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے عمر کے یہ پچاس پچپن سال یوں جھاڑ دیے ہیں جیسے کوٹ کے کالر سے گرد جھاڑ دیتے ہیں۔ یوں چٹکی بجا کر۔"

"اُس نے کچھ کہا بھی؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"ابھی تک تو نہیں کہا۔ عنقریب کہہ دے گی۔ لیکن یہ مت بھولنا کہ تم اتفاق سے ملے ہو۔ تھوڑے عرصے کے لیے۔ اس کی اور تمہاری راہیں مختلف ہیں۔ سفر میں کتنے مسافر ملتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں۔ کبھی سنجیدگی سے مت سوچنا۔ یہ یاد رکھنا کہ ہزاروں رُوبی آئیں ہزاروں جائیں، لیکن تمہیں پروا نہ ہو۔ خوب ہنسو کھیلو۔ ایسے لمحوں کا استقبال کرو لیکن اپنی جان کو کبھی روگ نہ لگانا۔ جس دن تم نے کسی لڑکی کے فراق میں آہیں بھرنی شروع کر دیں اس دن تمہارے انکل فرینکی تم سے خفا ہو جائیں گے۔"

اگلے روز ہم نے اُستانیوں اور لڑکیوں کو چائے پر بلایا۔ ہم نے کوٹھی سجائی۔ گلدانوں میں پھُول لگائے۔ رُوبی بھی آئی۔ اُس نے ساڑی پہن رکھی تھی۔ ساڑی میں وہ ایسی پیاری معلوم ہو رہی تھی کہ بس۔ اُس نے سب کی نظریں بچا کر اُنگلیاں ماتھے سے چھُوا کر مجھے سلام کیا۔ مَیں نے اسی طرح جواب دیا۔ بولی۔

"یہ ساڑی میری ایک سہیلی کی ہے۔ یہ سلام کرنا بھی اسی نے سکھایا ہے۔ اگر میرے بال لمبے ہوتے تو میں دو چوٹیاں کرتی جیسے میری سہیلی نے کی ہوئی ہیں۔ آپ نے دیکھا اُسے؟"

"نہیں تو۔"

"وہ سامنے بیٹھی ہے۔"

"ہو گی۔ جب تم سامنے ہو تو نگاہیں کسی اور جانب جاتی ہی نہیں۔"

میں نے اُسے پھُولوں کے گجرے دیے کہ ہاتھوں میں پہن لو۔ بولی "ابھی تو بیڈمنٹن ہو گی۔ پہنے تو پھول بکھر جائیں گے۔ چلتے وقت پہنوں گی۔"

چائے پر ہم آمنے سامنے بیٹھے۔ شاید بیڈمنٹن بھی ہوتی، تاش بھی ہوئی، کھیل بھی کھیلے گئے۔ مجھے بقیہ لڑکیوں سے بھی ملایا گیا مجھے اچھی طرح پتہ نہیں۔ بس میں رُوبی کو دیکھ رہا تھا اور وہ مجھے نظریں بچا کر، دزدیدہ نگاہوں سے، ہزار بہانوں سے۔

چلتے وقت اُس نے سر پر پلّو لے کر اُسی طرح مجھے سلام کیا۔

فرینکی نے بتایا کہ اُستانیوں نے ہمیں چائے پر بلایا ہے۔ "بھئی، ان چھوکریوں نے ہمارا کرکٹ کا پروگرام خراب کر دیا۔ آج کہہ رہی تھیں کہ نمائش دیکھنے سری نگر چلیں۔"

"پھر آپ نے کیا کہا؟" میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"کیا کہنا تھا بھتیجے کے لیے جانا پڑے گا۔ وہاں ملنے کے موقعے زیادہ ہوں گے جانتے ہو محبت کی پہلی نشانی کیا ہے؟"

"کیا ہے؟"

"دن میں دو مرتبہ شیو کرنا۔ اور آج تم نے دو مرتبہ شیو کیا ہے۔"

ہم دونوں سری نگر گئے جھیل ڈل میں ہاؤس بوٹ لینے۔ دو ان سب کے لیے اور ایک اپنے لیے۔ میرے لیے ایک چھوٹی سی کشتی بھی لی گئی۔

پھر سب سری نگر گئے۔ مصیبت یہ تھی کہ ساری لڑکیوں سے تعارف ہو چکا تھا۔ ہر ایک سے باتیں کرنی پڑتی تھیں، ان کے ساتھ جانا پڑتا تھا۔

شام کو نمائش پر جانے سے پہلے فرینکی بولے "ان سب کو میں اپنے ساتھ رکھوں گا۔ تم رُوبی کو ساتھ رکھنا اور ہم سے دُور دُور رہنا۔"

رُوبی نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے مشرقی خدوخال پر یہ لباس ایسا سج رہا تھا کہ وہ آنکھوں میں کھُبی جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اس کے ماتھے پر سیاہ ٹیکا لگا دوں۔ اسے کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ کہیں اسے میری ہی نظر نہ لگ جائے۔

ایک سٹال پر قدِ آدم آئینہ تھا۔ میں نے اسے آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ "تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ تم کتنی پیاری معلوم ہو رہی ہو۔ ذرا اپنا عکس تو دیکھو۔"

"آج پہلی مرتبہ میں نے یہ لباس پہنا ہے۔"

"تم ایک خوبصورت سی چینی کی گڑیا معلوم ہو رہی ہو۔"

ایک جگہ میں نے اس کے لیے ہلکی ہلکی نازک چوڑیاں لیں جو اس نے پہن لیں پھُولوں کے ہار لیے۔ پھر ایک تنہا گوشے میں ایک دوسرے کو دیر تک دیکھتے رہے۔ پیلا سا نوکدار چاند درختوں سے طلوع ہو رہا تھا۔

"رُوبی۔"

"جی۔"

"اس لباس کے ساتھ تو تمہارا نام بھی مشرقی ہونا چاہیے۔"

"آپ رکھ دیجیے، نیا نام۔"

"رابعہ۔ روبی اور رابعہ ایک سے بھی ہیں۔"

"رابعہ۔ میں اپنی سہیلیوں کو یہ نام بتاؤں گی۔"

اس کے منہ سے رابعہ بڑا پیارا لگا۔

"میں نے بھی آپ کا نام رکھا ہے۔"

"کیا؟"

"ابھی نہیں، پھر کبھی بتاؤں گی۔"

مَیں نے ہار اسے دے دیے۔ "تمہیں یہاں کے پھولوں کی خوشبو ناپسند تو نہیں؟"

"جی نہیں۔ مجھے تو یہ خوشبوئیں بے حد پسند ہیں۔ ان میں ایک نامعلوم سا فسوں ہے، ایسا فسوں جو بھلائے نہیں بھولتا۔ جو بیان نہیں کیا جا سکتا۔"

"جو تمہاری آنکھوں میں ہے۔"

اُس نے شرما کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ میں نے اس کے لیے آویزے لیے۔ وہ بولی "ایسا قیمتی تحفہ میں نہیں لوں گی۔" میں نے اصرار کیا کہ یہ قیمتی ہرگز نہیں۔ بالکل معمولی سے ہیں۔ بولی "اُستانیاں پوچھیں گی۔" "بتا دینا کہ خود خریدے ہیں۔"

"لاؤ تمہیں آویزے پہناؤں۔" اس نے بہتیرا کہا کہ نہیں پھر کبھی پہن لوں گی، مَیں نے چھوٹے کیل پہن رکھے ہیں۔ لیکن میں نے کیل اُتار کر آویزے پہنا دیے۔

"اب تم سچ مچ رابعہ بن گئی ہو۔"

"بس میرے بال تراشیدہ ہیں۔ اگر یہ بڑے ہوتے تو میں ضرور دو چوٹیاں کرتی تب مَیں بالکل مشرقی لڑکی دکھائی دیتی۔"

"تم اب بھی مشرقی معلوم ہوتی ہو۔ یہ تمہیں سر پر پلّو رکھنا کس نے سکھایا ہے؟"

"کسی نے بھی نہیں، یونہی میرا جی چاہتا ہے کہ سر پر پلّو رہے۔ کیوں اچھا نہیں لگتا کیا؟"

"بہت اچھا لگتا ہے۔"

جب فرینکی نے اشارہ کیا تو مجھے گروہ میں شامل ہونا پڑا۔

سہ پہر کو فرینکی بولے "آج شام کو کلب میں بوڑھوں اور بوڑھیوں کا رقص ہے، سب پچاس سے اُوپر ہوں گے اس لیے میں بھی مدعو ہوں۔ وقت گزارنا مشکل ہو جائے گا۔ میں بوڑھوں کی صحبت سے بہت گھبراتا ہوں۔ دونوں اُستانیاں میرے ساتھ جا رہی ہیں۔ ہم کافی دیر میں لوٹیں گے۔ لڑکیوں کو اِدھر اُدھر کر دوں گا۔ چاندنی رات ہوگی، تم رُوبی کو کشتی میں لے جانا۔"

شام کو اُنھوں نے سب کو اس خوبی سے تتر بتر کر دیا کہ کسی کو پتہ نہیں رہا کہ کون کہاں ہے؟ مَیں کشتی لے کر نکلا، رُوبی کو ساتھ لیا۔ اس نے رنگین لباس پہن رکھا تھا، رنگین دوپٹے میں گوٹے کا پلّو جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ کانوں میں وہی آویزے تھے اور ہاتھوں میں چوڑیاں۔

مَیں کشتی چلا رہا تھا اور وہ سامنے بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں ہاؤس بوٹ اور روشنیاں پیچھے رہ گئیں۔ سفیدے کے درخت آئے پھر سرو کے درختوں کی قطاریں۔

"میں بھی کشتی چلاؤں گی ـــ ایک چپّو مجھے دے دیجیے۔" وہ میرے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر ہم کشتی چلاتے رہے۔

"تم تھک گئی ہو گی۔" میں نے اس کے ہاتھ سے چپّو تھام لیا۔

"لائیے میں بھی آپ کی مدد کروں۔" اُس نے میرا دوسرا ہاتھ تھام لیا۔ ہوا کے جھونکوں سے اس کے بال لہرا رہے تھے۔ بار بار اس کی چوڑیاں بجتی تھیں۔ ہم دُور نکل آئے۔

"کشتی کہاں ٹھہرائیں؟"

"اس کُنج میں جہاں چاند ٹہنیوں کے پیچھے چھُپا ہوا ہے۔"

کشتی کنارے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ کنارے پر پانی تھوڑا تھا۔ میں پانی میں اُتر گیا۔

"آؤ" مَیں نے بازو پھیلا کر کہا۔ "کچھ دُور تک پانی ہے۔"

اس نے دوپٹہ درست کیا اور شرماتی لجاتی میرے بازوؤں میں آگئی۔ مَیں اسے کنارے پر لے آیا۔ ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگے۔ وہ نہایت خوشنما کنج تھا۔ خوشبودار پھُولوں نے سب کچھ مہکا رکھا تھا۔ سرو کے درخت چُپ چاپ کھڑے تھے۔ چاروں طرف ایسی خاموشی تھی جیسے کائنات سو رہی ہو۔ کبھی کبھار کوئی جھینگر بول پڑتا یا جھاڑیوں سے کوئی پرندہ نکل کر اُڑ جاتا۔ ہم دونوں سبزے پر بیٹھ گئے۔ چاندنی میں پہلی مرتبہ میں نے اس کا چہرہ اتنے قریب سے دیکھا۔

میں نے اسے بتایا کہ اس رات میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ مجھے اس کا چہرہ بے حد مانوس معلوم ہوا۔ وہ کہنے لگی کہ اسے بھی یونہی محسوس ہوا تھا جیسے وہ مجھے برسوں سے جانتی ہو۔ میں اسے کہیں بھی ملتا وہ پہچان لیتی۔

میں اس کے آویزوں سے کھیلتا رہا، چوڑیوں سے کھیلتا رہا، بالوں سے کھیلتا رہا۔

"اچھا۔ بھلا تم نے میرا نام کیا رکھا ہے؟"

اُس نے ہتھیلی اُٹھائی اور مَیں نے آنکھیں میچ لیں۔

"بے بی۔ بالکل بے بی۔"

"نہیں۔" مَیں نے مچل کر کہا۔

"میں نے پہلی ملاقات پر ہی تمہارا یہ نام رکھ دیا تھا۔ بے بی۔"

اُس نے آہستہ سے میرے گال کو چھُوا۔ "کبھی پہلے بھی کسی نے بے بی نام رکھا؟"

"نہیں تو۔"

"اور یہ گردن کا تل ہے۔ اسے کسی نے چھُوا؟"

نہ جانے ایسے کتنے سوال اُس نے پُوچھ ڈالے۔ دیر تک ہم یونہی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ چاند درختوں کے پیچھے چلا گیا۔ سائے لمبے ہو گئے۔ جب چاندنی پھیکی پڑنے لگی تو ہم واپس لَوٹے۔ کشتی پانی کے بہاؤ کے ساتھ ہولے ہولے چل رہی تھی اور ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

میں نے فرینکی کو اپنا نام بتایا، وہ اچھل پڑے۔ "بہت اچھے! یہ نام تو کاؤ بوائے والے نام کو بھی مات کر گیا۔ کیسا موزوں نام رکھا ہے اس لڑکی نے۔ ویسے تم ہو بالکل بے بی۔"

اُنہوں نے ناشتے پر سب سے کہہ دیا۔ میرے سامنے دُودھ کا جگ رکھ دیا گیا۔

"بے بی چائے نہیں پیا کرتے، دُودھ پیتے ہیں۔"

"آج بے بی بھوکا رہ گیا۔ اس کے لیے گلیکسو کا دودھ اور بے بی بسکٹ منگائے جائیں۔" یہ دونوں چیزیں شام کو آگئیں اور دو تین کھلونے بھی۔

فرینکی موٹر لے آئے، بولے "چلو باغ میں پھُول توڑیں گے۔ رُوبی کو ساتھ لے چلتے ہیں۔" کلب آیا تو خود اُتر گئے۔ بولے۔ مجھے واپسی پر ساتھ لے لینا۔ یہ کیمرہ ہے۔ اس میں سلف ٹائمر لگا ہوا ہے۔ تم دونوں کی اکٹھے تصویریں اتار دے گا۔ واپس آنے کی کوئی خاص جلدی نہیں ہے۔"

رُوبی کہنے لگی کہ مَیں کار چلاؤں گی۔ میں اُس کے برابر بیٹھ گیا۔ باتیں کرتے کرتے ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے اور کار کسی چیز سے ٹکراتی ٹکراتی بچتی۔

ہم باغ میں پہنچے تو رنگ برنگے تختے پھیلے ہوتے تھے جیسے قالین بچھے ہوتے ہوں۔

ننھے ننھے خوش رنگ پرندے سیٹیاں بجا رہے تھے۔ تتلیاں اور بھونرے پھولوں پر رقص کر رہے تھے۔

کتنی دیر تک ہم پھولوں اور کلیوں سے کھیلتے رہے۔ ہم نے آنکھ مچولی کھیلی، تصویریں اتاریں، درختوں پہ نام کھودے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پریوں کے ملک میں دو بچے راستہ بھول کر آ گئے ہوں۔

جب ہم واپس لوٹے تو دن ڈھل چکا تھا۔ ساری وادی پر پیلی سی خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہماری گود میں پھولوں کا ڈھیر تھا۔ کلب میں ہمیں فرینکی منتظر ملے۔ رُوبی کو چھوڑ کر انہوں نے دو داڑھیاں نکالیں، ایک خود پہنی اور دوسری مجھے دی۔ کافی بڑھیا داڑھی تھی۔ مہنگی ہو گی۔ ہم داڑھیاں پہن کر سڑکوں پر نکل گئے۔ کئی واقف نزدیک سے گزرے، لیکن کسی نے نہ پہچانا۔

"یہ داڑھی چبھتی ہے انکل فرینکی۔"

"لاؤ میں ٹھیک کر دوں۔" انہوں نے میری داڑھی ٹھیک کی۔

"اب بھی چبھتی ہے۔"

"تو یہ مونچھیں لگا لو۔" انہوں نے جیب سے مونچھیں نکال کر دیں۔

سامنے گلی ڈنڈا ہو رہا تھا۔ "یہ کون سا کھیل ہے؟"

میں نے تفصیل بتائی۔ بولے "نہایت دلچسپ کھیل ہے۔"

لڑکوں نے جو ہماری داڑھی مونچھیں دیکھیں تو اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ جلدی سے فرانکی نے داڑھی اتار دی اور میں نے مونچھیں، بڑی مشکل سے لڑکوں کو واپس بلایا۔ انہوں نے ہمیں کھیل میں شریک کر لیا۔ دیر تک گلی ڈنڈا کھیلا۔ فرینکی بڑے اچھے کھلاڑی ثابت ہوتے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کرکٹ سے بہت ملتا ہے۔

رات کو ہم داڑھی مونچھیں لگا کر نمائش میں گئے۔ ان کی فرمائش پر کھانے

کے لیے ایک سستے سے ہوٹل میں چارپائی پہ بیٹھ کر تنور کی روٹیاں اور کوفتے کھائے گئے۔ انہوں نے حقہ بھی پیا۔

فرینکی اور میں ڈل میں تیر کر دھوپ سینک رہے تھے۔ "وہ دیکھیے" میں نے اشارہ کیا۔ چند شکارے آ رہے تھے، جن میں لڑکیاں تھیں۔

"بلاؤں؟"

"خود آ جائیں گی۔" وہ بولے۔

ذرا سی دیر میں شکارے BATH سے آ لگے۔ انہوں نے بتایا کہ ابھی خبر ملی ہے کہ آج نشاط اور شالامار میں پانی آئے گا اور سارے فوارے چلیں گے۔ چند لڑکیاں تصویریں اتارنا چاہتی تھیں، اگر کوئی انہیں اپنے ساتھ باغوں میں لے جائے۔

"میرا بھتیجا اپنی کشتی میں گنی گنائی لڑکیوں کو لے جائے گا۔ بشرطیکہ آج شام کو تم ہمیں کوئی مزے دار سی چیز کھلاؤ۔"

اُنہوں نے لڑکیوں کا انتخاب کیا۔ ان میں رُوبی بھی تھی۔ میں انہیں کشتی میں لے کر نکلا۔ ان کی فرمائش پر سیدھا راستہ چھوڑ کر بیلوں سے گھرے ہوئے کنجوں اور سرسبز ٹاپوؤں سے گزرا۔ ان قدیم مغلیہ باغوں میں فوّارے چل رہے تھے۔ جھرنے رواں تھے۔ چھوٹی چھوٹی آبشاروں اور نہروں میں پانی آیا ہوا تھا۔ دہکتے ہوئے سُرخ پھولوں نے گویا آگ لگا رکھی تھی۔

رُوبی اور میں بیلوں کے پیچھے چلے گئے۔ ہم پھولوں اور کلیوں میں گھر کر بیٹھ گئے۔ آج وہ مغموم تھی۔

"میں جلد ہی واپس چلی جاؤں گی۔ پھر کیا ہو گا؟ تم مجھے بھول تو نہ جاؤ گے؟ ہم بہت

جلد ملیں گے نا؟"

مَیں نے اُسے بتایا کہ میری تعلیم مکمل ہونے میں ابھی دو سال باقی ہیں۔ جب مَیں ڈگری لوں گا تو ابّا مجھے ضرور ولایت بھیجیں گے، تب ہم ملیں گے بس اب تم مسکرانے لگو۔"

"اچھا۔" اُس نے آنسو پونچھ ڈالے۔ "تم جس طرح کہو گے اسی طرح کروں گی۔"

میں نے فرینکی کو سب کچھ بتا دیا۔ وہ بولے: "جب لڑکیاں رونے لگیں تو سمجھ لو کہ وہ سنجیدہ ہو چکی ہیں۔ کھیلتے کھیلتے تم بہت دُور چلے گئے ہو، لیکن میں یہی کہوں گا کہ جب تک وہ یہاں ہے تم اسے اسی طرح پیار کرتے رہو۔ اس عمر کی محبت بڑی عجیب ہوتی ہے۔ جب تک ایک دوسرے کے سامنے ہوں چاروں طرف محبت ہی محبت برستی نظر آتی ہے۔ یوں منٹوں میں عمر بھر کے پیمان باندھے جاتے ہیں اور جہاں نظروں سے اوجھل ہوتے، تھوڑے سے رونے دھونے کے بعد کچھ یاد نہیں رہتا۔ ذرا سے عرصے کے بعد ساری باتیں خواب بن جاتی ہیں۔"

"مگر۔"

"مگر وگر کچھ نہیں میں سب کچھ جانتا ہوں۔ بھتیجے تم مجھے اپنا ہم عمر سمجھو۔"

سری نگر سے واپسی کا پروگرام بنا۔ فرینکی نے ہمیں پھر ملنے کا موقع دیا۔ شام ہوتے ہی مَیں نے روبی کو ساتھ لیا اور کشتی میں ہم اسی کُنج کی طرف چل دیے جہاں اُس رات گئے تھے۔

اُس نے ملگجا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے دوپٹے کا روپہلی پلّو رہ رہ کر جگمگا اٹھتا۔ پہاڑوں سے چودھویں کا چاند ابھی ابھی طلوع ہوا تھا۔ کہیں سے رات کی رانی کی مہک آ رہی تھی۔

"یہ مہک کہاں سے آ رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے بالوں سے۔ یہ دیکھیے۔ ہے نا؟"

"تمہیں یہ خوشبو پسند ہے؟"

"بہت!"

اُس نے ایک چھوٹا سا رومال مجھے دیا۔ "اس پر مَیں نے بیل بوٹے خود نکالے ہیں۔ اس پر تمہارا نام بھی لکھا ہے۔"

وہ کُنج آ گیا۔ ہم سرو کی قطاروں میں چلے گئے۔ چاروں طرف وہی جانی پہچانی خاموشی تھی۔ وہی مہک تھی۔ چاندنی ابھی پھیکی پھیکی تھی۔ جب چاندنی تیز ہوئی تو طرح طرح کے نغمے جاگ اُٹھے۔ رات کی رانی کی مہک بڑھتی گئی۔ دیر تک تارے درختوں سے جھانکتے رہے۔ ہوا کے جھونکے سائیں سائیں کرتے رہے۔ سائے گھٹتے بڑھتے رہے۔

جب ہم واپس لَوٹے تو جھیل خاموش تھی۔ فضا خاموش تھی۔ دُنیا خاموش تھی۔

گلمرگ پہنچ کر فرینکی نے ایسے زور شور سے کرکٹ کھیلنا شروع کیا کہ ساری کسر نکل گئی۔ وہ بڑی محنت سے سبق سیکھتے، بڑی کوشش سے سبق یاد کرتے۔ سہ پہر سے شام تک بولنگ کرتے۔ ان کا کھیل پہلے سے کچھ کچھ بہتر ہوتا جا رہا تھا۔

ایک روز روبی بڑی غمگین ملی۔ کہنے لگی: "عنقریب ہم جانے والے ہیں۔ آج اُستانیاں واپسی کا پروگرام بنا رہی ہیں۔ وہ تو پہلے ہی سے چلی جاتیں مگر فرینکی نے روک رکھا۔" ہم رات کو ملے۔ اس نے بتایا کہ پرسوں منہ اندھیرے وہ سب چلے جائیں گے۔ اُس نے ایک نامکمل سویٹر دکھایا جسے وہ میرے لیے بُن رہی تھی۔ بُننا میں نے ابھی ابھی سیکھا ہے۔ پہلی جو چیز مَیں نے بُنی ہے وہ تمہارا سویٹر ہے۔ اسے بمبئی

سے مکمل کر کے بھیجوں گی۔ وہاں میری ایک بڑی ساری تصویر ہے جو مجھے بہت پسند ہے، وہ بھی بھیجوں گی۔"

اُس نے مجھے ایک تصویر دی۔ اندھیرے میں اچھی طرح نظر نہ آتی تھی۔

"اِس پر لکھنا بھول گئی۔" آنکھوں کے بالکل سامنے تصویر رکھ کر اندھیرے میں اُس نے کچھ لکھا۔ مَیں نے پڑھنے کی کوشش کی۔

"نہیں ابھی نہیں، میں چلی جاؤں تب پڑھنا۔"

اگلے روز فرینکی نے الوداعی پارٹی دی۔ رات کو رقص تھا۔ اسی ہال میں جہاں مَیں نے روبی کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ اُس نے وہی لباس پہن رکھا تھا، ہلکا ہلکا نیلا لباس۔ جب بلیو ڈینیوب بجا تو مَیں نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ دھیمی دھیمی سُریں ہمیں ایک ایسی دُنیا میں لے گئیں جہاں فراق کی گھٹائیں تُلی کھڑی تھیں۔ آسمان سے غم برس رہا تھا۔ آنسوؤں کے دریا بہہ رہے تھے۔ آہوں کے طوفان بپا تھے۔

رات کو وہ باغیچے میں ملی۔ اُس نے مجھے لاکٹ دیا۔ "یہ میری امّی نے مجھے دیا تھا میرے پاس اور کوئی ایسی نشانی نہیں جو میں تمہیں دے سکوں۔ اسے ہر وقت اپنے پاس رکھنا۔ خدا تمہاری حفاظت کرے گا۔"

ہم نے پروگرام بنائے۔ اگر وہ بمبئی رہی تو مَیں ملنے آیا کروں گا۔ اگر وہ واپس چلی گئی تو مَیں تعلیم مکمل کر کے جتنی جلدی ہو سکا وہاں پہنچوں گا۔

"اور جب تم ملنے آؤ گے تو میں سٹیشن پر تمہیں لینے آؤں گی۔ مشرقی لباس پہن کر، مشرقی خوشبو لگا کر، ہاتھوں میں چوڑیاں اور کانوں میں آویزے پہن کر۔"

چاروں طرف تاریکی تھی، حزن تھا، جوں جوں رات گزرتی جاتی تھی، تاریکی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اُداسی بڑھتی جا رہی تھی۔ تاروں کی چمک مدھم پڑتی جا رہی تھی۔

وہ بھولی بھالی حسین گڑیا بڑی پیاری پیاری باتیں کرتی رہی۔ پھر رات ختم ہونے

کو آئی اور آسمان پر ہلکی ہلکی سفیدی پھیلنے لگی۔

علی الصبح وہ چلی گئی۔

اس دن مَیں اکیلا باہر نکل گیا۔ اداس و مغموم جنگلوں میں پھرتا رہا۔ رُوح پر گہری افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ دُنیا تاریک معلوم ہو رہی تھی۔ مَیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ دیر تک بیٹھا رہا۔

پھر مَیں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ فرینکی کھڑے مسکرا رہے تھے۔

وہ میرے پاس بیٹھ گئے۔ اُنہوں نے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کیں۔ ان کے مسکراتے ہوئے چہرے پر ایسی شفقت تھی جیسے میں ان کا برسوں پرانا رفیق ہوں۔ ہماری عمروں میں کوئی فرق نہیں ہے اور ہم دونوں ہم عمر لڑکے ہیں۔

مَیں نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ وہ کہنے لگے۔ "تمہیں تو آج مسرور ہونا چاہیے۔ جب خدا کسی پر خوش ہوتا ہے تو اسے محبّت عطا کرتا ہے۔ تمہیں وہ عطیہ ملا ہے جو بہت کم انسانوں کو ملتا ہے۔ ایسے حالات میں جب کہ تمہیں اس کی ذرا بھی توقع نہیں تھی تمہیں محبت ملی اور پھر کیسی پیاری لڑکی کی معصوم محبّت۔ حالات پر تمہارا قابو نہیں، وقت کے سیل کو تم روک نہیں سکتے۔ تم دونوں کو جدا ہونا تھا۔ ایسے دلآویز لمحے لافانی ہوتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں لیکن ان کی یاد رہ جاتی ہے اور یہ یاد زندگی کے اُن لمحوں کو جگمگاتی ہے۔ کیسا کیف آور خیال ہے کہ کبھی تمہیں ایک بھولی بھالی مخلص لڑکی نے چاہا تھا اور شاید اب بھی دُنیا کے کسی گوشے میں وہ تمہیں یاد کر لیتی ہے ـــــ کتنی حسین یاد ہے ـــــ سب کچھ فنا ہو جاتا ہے لیکن یادیں فنا نہیں ہوتیں۔ یادیں زندگی بنتی ہیں۔"

انہوں نے ایسی اچھی اچھی باتیں کیں کہ میں مسکرانے لگا۔ ہم مسکراتے ہوئے واپس لوٹے۔ شام کو خوب بولنگ ہوئی۔ اب وہ سیدھی گیندیں پھینکنے لگے تھے۔ کبھی کبھار بریک بھی کرا لیتے تھے۔ ایک دفعہ تو انہوں نے مجھے آؤٹ بھی کر دیا۔

رات کو روشنی کے سامنے انہوں نے ہاتھوں کے سائے سے جانور اور پرندے بنائے۔ تتلی، خرگوش، کُتّا، بطخ۔ میں نے بھی سیکھے۔ سایوں سایوں کی آپس میں جھوٹ موٹ کی لڑائیاں بھی ہوتیں۔

کلب میں رقص تھا وہ مجھے ساتھ لے گئے۔ میرے لیے ہال کی سب سے حسین لڑکی چن کر لائے۔ جب ہم بلیو ڈینیوب پر رقص کر رہے تھے تو میں کیسا اداس ہو گیا۔ جیسے میرے بازوؤں میں رُوبی آگئی۔ میں اتنا غمگین ہوا کہ کونے میں اکیلا جا بیٹھا۔ فرینکی مسکراتے ہوتے آئے۔ میرے کندھے کو تھپتھپایا۔ "بھتیجے! تم بھول جاتے ہو کہ زندگی بے حد مختصر ہے اور یہ لمحے کبھی دوبارہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ نہ جانے کتنی مرتبہ بلیو ڈینیوب بجے گا۔ ہر دفعہ رقص کے لیے نیا ساتھی ملے گا لیکن تمہیں ہر بار مسکراتے ہوتے رقص کرنا ہو گا۔ اپنے ساتھی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔ یہ تمہارا فرض ہے ورنہ زندگی تم سے بیزار ہو کر تمہیں پیچھے چھوڑ جائے گی۔ جاؤ اس لڑکی سے پھر رقص کے لیے کہو۔"

ایک روز پارسل ملا۔ رُوبی نے بھیجا تھا۔ میرا سویٹر جس پر میرے نام کا پہلا حرف لکھا تھا۔ رُوبی کی ایک نہایت اچھی تصویر، چند کڑھے ہوئے رومال اور کچھ کھلونے۔ "بے بی کے لیے۔" ساتھ ہی ایک خط جس میں لکھا تھا کہ وہ اپنے چچا کے ساتھ

یورپ جا رہی ہے۔ خط کی عبارت میں اتنا خلوص اور پیار تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ معصوم سی حسین رُوح میرے سامنے کھڑی باتیں کر رہی ہے۔

فرینکی نے ایک اور پروگرام بنایا۔ ہم گلمرگ سے پہلگام گئے، وُلر گئے۔ چشموں پر گئے، پہاڑی چوٹیوں پر چڑھے۔ جنگلوں میں خیمے لگتے۔ الاؤ کے گرد بیٹھ کر درختوں کے تنوں پر سایوں سے تصویریں بناتے۔ ماؤتھ آرگن کے ساتھ گانے گاتے جاتے۔ پرندوں کے رنگین پَر، پتھروں کے گول چمکیلے ٹکڑے، خودرَو پھول، ہمارے پَروں اور پھولوں کے البم بھر گئے۔ فرینکی نے مچھلیاں اور پرندے پکڑنے کی بہت سی ترکیبیں بتائیں، جانوروں کو بے وقوف بنانے کے طریقے بتاتے۔ تاش کے کھیل سکھاتے۔ دوسرے ملکوں کی باتیں سناتیں۔ دُنیا بے حد دلچسپ معلوم ہونے لگی۔

جب واپس گلمرگ پہنچے تو مجھے معلوم ہوا کہ میری چھٹیاں ختم ہو چکی ہیں اور کالج کبھی کا کھل چکا ہے۔ فرینکی بھی کچھ عرصے کے بعد وہاں سے جا رہے تھے۔ افغانستان کی طرف اپنے کسی دوست سے ملنے، جہاں شکار کا پروگرام تھا۔

جب میں وہاں سے چلا تو وہ مجھے چھوڑنے سری نگر تک آتے۔ انہوں نے مجھے اپنی تصویر دی جس پر لکھا تھا۔ "بے بی کے لئے انکل فرینکی کی طرف سے۔"

علی الصبح مجھے روانہ ہونا تھا۔ وہ رات ہم نے ڈل کے کنارے ٹہل کر گزاری۔ ہم نے خوب باتیں کیں۔ انہوں نے مجھے اپنی زندگی کے قصّے سناتے۔ "کہنے کو تو میری عُمر خاصی ہے اور مَیں زندگی کا بیشتر حصّہ گزار چکا ہوں، لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مَیں نے زندگی ابھی ابھی شروع کی ہے۔ مجھے دُنیا کی نفیس ترین چیزوں سے محبت ہے طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب سے محبّت ہے۔ اندھیری رات کے چمکتے ہوتے تاروں سے محبّت ہے۔ وہ قوسِ قزح بڑی پیاری لگتی ہے جو کمان کی طرح کسی وادی پر محیط کر جاتے ہیں۔ سچائی خلوص اور محبّت پر اب تک میرا اعتقاد ہے۔ ایک مخلص دوست میرے لیے سب سے

بڑی نعمت ہے۔ میں صرف خلوص پر زندہ ہوں۔ یہی میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ یہی میرا ماضی ہے، یہی مستقبل۔ میں نے زندگی سے اور کچھ نہیں مانگا۔ زندگی کا ہر سال گزر کر میری عمر میں جمع نہیں ہوتا، بلکہ کم ہو جاتا ہے۔ اب بھی میں پھولوں اور تتلیوں کو کسی اور دنیا کی مخلوق سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ہر رات ایک نئی کائنات تخلیق ہوتی ہے جب انسان سو جاتے ہیں تو چاندنی میں پریاں اُترتی ہیں۔ دنیا کا گوشہ گوشہ نقشے میں موجود ہے لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ کہیں نہ کہیں ایک ایسا جزیرہ ضرور ہے جس میں انسان نے آج تک قدم نہیں رکھا۔ اس جزیرے میں ایسے ایسے رنگ ہیں جو انسانی آنکھ نے کبھی نہیں دیکھے۔ طرح طرح کے خوشنما پرندے ہیں جن کے چہچہوں میں ایسی موسیقی ہے جس سے انسان ناآشنا ہے۔ اس کا کونہ کونہ پُراسرار اور مسحور ہے اور وہ جزیرہ اس سیاح کا منتظر ہے جو کسی دن کشتی لے کر چپکے سے آ جائے گا۔"

چلتے وقت میں نے وعدہ کیا کہ میں کبھی غمگین نہیں ہوں گا۔ ہمیشہ مسکراتا رہوں گا۔

کالج پہنچ کر میں نے ان کی باتیں دوستوں کو سنائیں۔ ان کے خط آتے رہے۔ افغانستان سے وہ کہیں اور جا رہے تھے۔

ایک روز کرکٹ کا میچ تھا۔ بلیزر کی جیب میں ان کی تصویر تھی۔ میں نے کھلاڑیوں کو دکھائی۔ ان میں سے چند تو چونک پڑے

"یہ تمہارے دوست کیسے بنے؟"

میں نے بتایا کہ میں انہیں بولنگ سکھایا کرتا تھا۔ بڑی محنت کے بعد وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ سیدھی گیند پھینک سکیں۔

"بولنگ سکھایا کرتے تھے؟ ان کو؟"

"ہاں۔"

"جانتے ہو یہ کون ہیں؟ آسٹریلیا کے مشہور و معروف بولر جو اپنے وقت میں دنیا کے بہترین بولر رہ چکے ہیں۔"

لیکن مجھے یقین نہ آیا۔ پھر انہوں نے ایک کرکٹ کی کتاب میں فرینکی کی تصویر دکھائی۔

"لیکن میں نے سچ مچ انہیں بولنگ سکھائی تھی۔"

میرا خوب مذاق اُڑا۔

اس وقت میری سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن بعد میں سمجھا۔ اس پُررونق جگہ میں جس طرح میں تنہا اور اداس تھا اسی طرح شاید فرینکی بھی تنہا اور اُداس تھے۔ شروع شروع میں کرکٹ ہی انہیں ایسا موضوع مل سکا جو ہم دونوں میں مشترکہ تھا۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ ہمارے نظریے، ہمارے خیالات، ہمارے مشاغل یکساں تھے۔

ہمارے دل ہم عمر تھے۔

اور ہم دونوں میں سے 'بے بی' کون تھا؟ میں یا وہ؟ یا شاید دونوں۔

تعویذ

چار بجے شیطان چائے پینے آتے۔ جب ہم پی کر باہر نکلے تو دفعتہً انہیں محسوس ہوا کہ چائے ٹھنڈی تھی، چنانچہ ہم ان کے ہوسٹل گئے۔ وہاں کھولتی ہوئی چائے پی گئی۔ لیکن وہ مطمئن نہ ہوئے۔ منہ بنا کر بولے کہ یہ چائے بھی نامکمل رہی، کیونکہ اس کے ساتھ لوازمات نہیں تھے۔ طے ہوا کہ کسی کیفے میں جا کر باقاعدہ چائے پی جائے۔

مصیبت یہ ہے کہ شیطان کو ہر وقت چائے کی پیاس لگی رہتی ہے اور وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں دن میں دو مرتبہ قیامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک تو جب علی الصبح نو دس بجے اٹھتے ہیں تو ان کے سامنے دنیا اندھیر ہوتی ہے اور وہ سوچتے ہیں کہ ع منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — لیکن چائے کی چند پیالیوں کے بعد انہیں یکایک پتہ چلتا ہے کہ ع — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں — یہی تماشا چار بجے چائے کے وقت ہوتا ہے۔ ساڑھے تین بجے زندگی سے بیزار ہوتے ہیں اور ساڑھے چار بجے ان جیسا مسخرہ ملنا محال ہے۔ اگر وہ چائے کی دریافت سے پہلے اس دنیا میں ہوتے تو خدا جانے ان کا کیا حال ہوتا۔

ہم سائیکلوں پر ٹہلتے ٹہلتے کیفے میں پہنچے جہاں ہمیں اکثر بڈی (BUDDY) ملا کرتا تھا۔ اندر جا کر دیکھا تو سب کچھ سنسان پڑا تھا، فقط ایک کونے میں ایک نحیف و نزار

نوجوان بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ ہم اس کے قریب جا بیٹھے۔ ہماری طرف اس کی پشت تھی۔ سسکیوں کی آواز نے ہمیں چونکا دیا، وہ سُبڑ سُبڑ رو رہا تھا۔ چہرے سے پھسلتے ہوئے آنسو سینڈوچیز، کیک کے ٹکڑوں اور چائے کی پیالی میں ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ غور سے دیکھتے ہیں تو یہ امجد تھا۔ امجد ہمارا پرانا دوست تھا جو مدت سے لاپتہ تھا۔ ہم اس کی میز پر جا بیٹھے۔ سُوں سُوں کر اس نے علیک سلیک کی اور پھر رونے میں مصروف ہو گیا۔ شیطان بولے۔ "دیکھیے مولانا، اگر آپ سینڈوچیز یا چائے کے سلسلے میں رو رہے ہیں تو بہتر یہی ہو گا کہ کم از کم یہاں سب کے سامنے نہ روئیں کیونکہ جس شخص نے یہ چیزیں تیار کی ہیں وہ سامنے کھڑا دیکھ رہا ہے اور وہ بے حد حساس و جذباتی ہے۔ اسے شدید اذیت پہنچے گی۔" لیکن امجد بدستور مصروف رہا۔

شیطان نے پوچھا "خان بہادر صاحب کا کیا حال ہے؟"

"کون سے خان بہادر صاحب کا؟" امجد نے بُرا منہ بنایا۔

"کوئی سے خان بہادر صاحب کا۔"

"اوہ!"

ہم نے بہتیری کوشش کی کہ اس نالائق سے باتیں کریں لیکن کچھ نہ بنا۔ اتنے میں بڈی آگیا۔ ہم نے لگاتار روتے ہوئے امجد کا تعارف لگاتار ہنستے ہوئے بڈی سے کرایا۔ اب بڑی سنجیدگی سے وجہ پوچھی گئی اور امجد نے بتایا کہ اس کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے بلکہ بالکل ہی گر گئی ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کبھی تارے ناچتے ہیں اور کبھی اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ وہ اپنے آخری امتحان میں مدت سے فیل ہو رہا ہے۔ لگاتار فیل ہو رہا ہے۔ اگر محنت کرے اور پرچے اچھے ہو جائیں تب بھی فیل ہو جاتا ہے اور اگر پرچے خراب ہو جائیں تب بھی۔ اس کی قسمت ہمیشہ اسے دھوکہ دیتی ہے۔ وہ کسی پر عاشق بھی ہے۔ محبوب نے پہلے تو سب کچھ کہہ سُن لیا اور بعد میں بڑے مزے سے اسے ڈبل کراس کر دیا۔ آج کل

محبوب بالکل خاموش ہے۔ ان کے ہاں آنا جانا بھی مدت سے بند ہے کیونکہ ان کے ہاں ایک بے حد بھاری بھرکم اور خونخوار کتا کہیں سے منگایا گیا ہے جو امجد کو بالکل پسند نہیں کرتا بلکہ اس سے خفا رہتا ہے۔ محبوب کے ہاں ایک اور صاحب کی آمدورفت بھی شروع ہو گئی ہے جو شاید رقیب رُوسیاہ بننے والے ہیں۔ محبوب کے ابا امجد کو یونہی سا بیکار لڑکا سمجھتے ہیں اور انہوں نے شادی سے انکار کر دیا ہے، کیونکہ امجد کچھ نہیں کماتا۔ شیطان اور مقصود گھوڑے کی طرح شہزادہ ہے لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس کا کسی چیز کو دل ہی نہیں کرتا۔ بالکل جی نہیں چاہتا۔ یہاں تک کہ چائے سامنے رکھی ہے اور پینے کو جی نہیں چاہتا۔

گفتگو کے موضوع بدلتے رہے اور ہم نے امجد سے لے کر امجد تک گفتگو کی۔

شیطان بولے۔ "بھئی تمہاری مصیبتیں تو اتنی ہیں کہ ایک GUARDIAN ANGEL تمہارا کام نہیں کر سکتا۔ تمہارے لیے تو فرشتوں کا سنڈیکیٹ بیٹھے گا۔"

بڈی نے کہا "تم آج سے ورزش شروع کر دو۔ ہلکی پھلکی اور مقوی غذا کھاؤ ــــ علی الصبح اُٹھ کر لمبے لمبے سانس لیا کرو۔ قوتِ ارادی پیدا کرو، خوب محنت کر کے امتحان پاس کر لو۔ ملازمت ضرور مل جائے گی اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اِدھر امجد نے اور زیادہ رونا شروع کر دیا۔ اب تو وہ باقاعدہ بھوں بھوں کر کے رو رہا تھا۔ آخر طے ہوا کہ امجد کی سچ مچ مدد کی جائے اور کل پھر یہیں ملاقات ہو۔

اگلے روز ہم سب وہیں ملے۔ اتفاق سے کالج کی چند لڑکیاں بھی وہاں بیٹھی تھیں۔ ایسے موقعوں پر میں ہمیشہ یوں ظاہر کیا کرتا ہوں جیسے میں شیطان کے ساتھ نہیں ہوں، کیونکہ ہمارے کالج کی لڑکیاں شیطان کو پسند نہیں کرتیں جتنی دیر وہ ہماری

طرف دیکھتی رہیں میں کسی اور طرف دیکھتا رہا۔ ان کے جانے پر گفتگو شروع ہوئی۔

"امجد! تم موسیقی پر فدا ہو جاؤ۔" شیطان بولے۔ "یہ پیازی ساری والی لڑکی بڑا اچھا ستار بجاتی ہے۔ تمہیں کوئی ساز بجانا آتا ہے؟"

"ہاں۔"

"کون سا؟"

"گراموفون۔"

"تب تم موسیقی کو پسند نہیں کرو گے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ جب تم آخری مرتبہ اس لڑکی سے ملے تو کیا باتیں ہوئی تھیں؟"

"میں نے اسے شادی کے لیے کہا تھا۔ اور یہ کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ نہ کچھ کما سکتا ہوں۔ نہ کسی قابل ہوں۔ نہ کچھ کر سکتا ہوں اور نہ کچھ کر سکوں گا۔"

"پھر؟"

"پھر اُس نے کچھ بھی نہیں کہا اور آج تک خاموش ہے۔"

"تمہارے ہونے والے خسر اچھے خاصے قبر رسیدہ بزرگ ہیں۔ میں انہیں بالکل پسند نہیں کرتا۔ لیکن لڑکی بہت اچھی ہے۔ جتنے تم شکل و صورت میں بخشے ہوئے ہو اتنی ہی وہ حسین ہے۔ تمہیں احساسِ کمتری ہو جائے گا۔ بھلا کبھی تمہاری خط و کتابت بھی ہوئی تھی؟"

"ہوئی تھی!" کہہ کر امجد نے خطوط کا پلندہ میز پر رکھ دیا۔ شیطان نے جلدی سے خطوط کو سُونگھا اور بولے "جلدی ہے اس لیے ساری باتیں تو کبھی فرصت میں پڑھیں گے۔ البتہ میں خطوط کو ترتیب وار رکھ کر صرف القاب پڑھ کر سناتا ہوں۔"

ترتیب وار القاب یہ تھے۔ "جناب امجد صاحب"۔ "امجد صاحب"۔ "امجد"۔ "پیارے امجد"۔ "میرے امجد"۔ "امجد ڈارلنگ"۔ "امجد ڈارلنگ"۔ "میرے امجد"۔ "امجد"۔

"پیارے امجد"۔ "امجد صاحب"۔ "جناب امجد صاحب"۔

ادھر امجد نے پھر رونا شروع کر دیا۔ شیطان بولے "میں رات بھر سوچتا رہا ہوں کہ تمہارے لیے کیا کیا جائے۔ یہاں سے بہت دُور جنگلوں میں ایک پہنچے ہوئے بزرگ رہتے ہیں۔ ان تک میری رسائی ہو سکتی ہے۔ اچھا تعویذ گنڈوں پر کس کس کا اعتقاد ہے؟"

سوائے بڈی کے ہم سب معتقد تھے۔ بڈی نے پوچھا "تعویذ گنڈے کیا ہوتے ہیں؟"

"کیا امریکہ میں تعویذ وغیرہ نہیں ہوتے؟"

"نہیں تو۔"

جب بڈی کو سب کچھ بتایا گیا تو وہ بولا "ہمارے ہاں GOOD LUCK کے لیے شگون ہوتے ہیں مثلاً سیاہ بلّی کا دیکھنا یا سڑک پر گھوڑے کی نعل مل جانا۔ یہ تعویذ وغیرہ نہیں ہوتے۔ لیکن مجھے شگونوں پر اعتقاد نہیں۔ ایک مرتبہ میں ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ نجومی نے مجھے بتایا کہ اگر مجھے اگلے اتوار کو غروب آفتاب سے پہلے سڑک پر گھوڑے کی نعل مل گئی تو بہت اچھا شگون ہوگا اور غالباً اس لڑکی سے میری شادی ہو جائے گی۔ اگلے اتوار کو میں نے مُنہ اندھیرے اُٹھ کر سڑکیں ناپنا شروع کر دیں۔ دوپہر ہوئی۔ سہ پہر آیا۔ گھوڑے کی نعل تو کیا کسی گدھے کی نعل بھی نہ ملی۔ آخر میں نے اصطبلوں کا رُخ کیا۔ وہاں بھی ناکامی ہوئی۔ شام ہونے پر میں بہت گھبرایا۔ ہمارے پڑوس میں ایک گھوڑا رہتا تھا۔ میں نے چند اوزار اُٹھائے۔ اپنے بھائی کو ساتھ لیا اور چپکے سے اس گھوڑے کو باندھ بوندھ کر رکھ دیا۔ گھوڑا ہرگز رضامند نہیں تھا لیکن ہم نے زبردستی اس کی نعل اُتار اُتار لی۔ باہر نکل کر جو دیکھا تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ اگلے روز میں نے اس لڑکی سے شادی کے لیے کہہ دیا اور اس نے کسی اور سے شادی کر لی۔ تب سے گھوڑے کی نعل سے میرا اعتقاد اُٹھ گیا۔ کیا لغویت ہے۔ اگر گھوڑے کی نعل اتنی ہی مبارک چیز ہے تو گھوڑوں

کو بے حد خوش نصیب ہونا چاہیے۔"

"لیکن تمہارا واسطہ مشرق کے عاملوں سے نہیں پڑا۔ یہاں تو ایسے ایسے عمل کیے جاتے ہیں کہ سن کر یقین نہیں آتا۔ شکلیں بدل جاتی ہیں۔ تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ دنیا بدل جاتی ہے۔"

"اچھا؟"

"ہاں، تم نے پیروں، فقیروں اور سنیاسیوں کے متعلق نہیں پڑھا؟"

"میں نے فلموں میں دیکھا ہے کہ ہندوستان میں بڑی بڑی پُراسرار باتیں ہوتی ہیں۔ یہاں کے فقیر کچھ پڑھ کر ایک رسّے پر پھونک دیتے ہیں۔ رسّہ سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ رسّے پر چڑھ جاتے ہیں۔ رات کو وہ میخوں کے بستر پر سوتے ہیں!"

"یقیناً! تم خود دیکھ لو گے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ امجد کے لیے ان بزرگ سے تعویذ حاصل کروں۔ اگرچہ یہ بہت مشکل کام ہے۔ اوّل تو وہ بزرگ کسی کو تعویذ دیتے ہی نہیں۔ اگر کبھی خوش ہو کر دیتے تو صرف سال میں ایک آدھ مرتبہ۔ لیکن میں اپنی ساری کوششیں صرف کر دوں گا۔ ان کا تعویذ جادو سے کم اثر نہیں رکھتا۔ ناممکن سے ناممکن باتیں ممکن ہو جاتی ہیں۔ اگر مل گیا تو امجد کی تقدیر بدل جائے گی۔ اور امجد! تمہیں میری ہدایات پر عمل کرنا ہو گا۔ اب تمہارے لیے صرف دو باتیں رہ گئی ہیں۔ یا تو میری ہدایات پر عمل کرو اور یا ۔۔ پھر ان پر عمل کرو۔"

شیطان نے ایک لمبی چوڑی فہرست بنائی ۔۔ امجد دو دن بھوکا رہے گا، صرف اسے بکری کا دودھ اور چھوہارے ملیں گے۔ وہ کسی سے بات نہیں کرے گا۔ دوسرے روز شام کو حجامت کرائے گا، پھر سفید لباس پہن کر عطر لگا کر ایک وظیفہ پڑھے گا۔ اگلے روز تالاب میں کھڑا ہو کر دعا مانگے گا اور سورج کی پہلی شعاع کے ساتھ اس کے بازو پر تعویذ باندھ دیا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

امجد نے فقط ایک اعتراض کیا۔ وہ یہ کہ وہ سر پر اُسترا ہرگز نہیں پھروائے گا البتہ قینچی سے حجامت کرا لے گا۔

شیطان ایک ہفتے تک غائب رہے۔ پھر یکایک تعویذ لے کر نازل ہوتے۔ پہلے تو ان بزرگ کے متعلق باتیں سنائیں کہ انہوں نے اپنی ساری عمر جنگلوں میں گزاری ہے بہت کم کھاتے ہیں۔ بولتے تو بالکل نہیں۔ کوئی شخص ان کے پاس تک نہیں پھٹک سکتا۔ ان کے کمالات معجزوں سے کم نہیں۔ ان سے تعویذ حاصل کرنا بالکل ناممکن ہے لیکن شیطان اپنی خوش قسمتی اور محض اتفاق سے کامیاب ہوئے ہیں۔ ہم ان کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے۔

شیطان نے رومال کھول کر ہمیں تعویذ کی زیارت کرائی۔ تعویذ موم جامے میں لپٹا ہوا تھا اور اس سے عنبر کی ہلکی ہلکی مہک آ رہی تھی۔ میں نے اور امجد نے اسے بوسہ دیا اور آنکھوں سے لگایا۔ بڈی نے بھی ہماری تقلید کی۔

امجد دو روز شیطان کے ساتھ رہا۔ تیسرے روز اس کے داہنے بازو پر تعویذ باندھا گیا۔ شیطان ایک فاتحانہ انداز میں بولے "لو بھیا امجد! سمجھ لو کہ آج تمہاری قسمت جاگ اٹھی۔ اب اس مقدس طاقت کے کرشمے دیکھو۔"

ہم نے چند روز بعد امجد کو دیکھا۔ بسورتے ہوئے چہرے پر اب مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ لباس بھی پہلے سے بہتر تھا۔ آہستہ آہستہ تعویذ کی برکت سے تبدیلیاں آنی شروع ہو گئیں۔ اب ہر کام کے لیے امجد کا جی کرنے لگا۔ وہ چست ہو گیا تھا۔ اب یا تو وہ نہایت شوخ ٹائی لگاتا اور یا رنگین سکارف پہنتا۔ ہمیشہ اس کے کوٹ کے کاج میں ایک مُسکراتا ہوا پھول اٹکا ہوتا۔

امجد کے امتحان میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ مَیں اور شیطان اس کے ہاں گئے۔ اس کی دو تین من پُختہ کتابوں کو دیکھا۔ شیطان کہنے لگے کہ کتابیں بہت زیادہ ہیں اور وقت بہت تھوڑا ہے۔ میرے خیال میں کچھ ہم پڑھتے ہیں، کچھ تم پڑھو۔ باقی کتابیں بڈّی پڑھے گا۔ امجد نے کہا۔ مذاق مت کرو، کوئی اور تدبیر بتاؤ۔

شیطان نے مشورہ دیا کہ کتابوں کے خلاصے، نوٹ اور ایسی ویسی چیزیں امتحان میں ساتھ لے جاؤ اور خوب دل کھول کر نقل کرو۔ امجد نہ مانا۔ شیطان بولے۔ ارے میاں! ایسا تعویذ بازو پر بندھا ہے کہ نقل تو نقل اگر کوئی سنگین ترین جرم کر آؤ تب بھی پتہ نہ چلے۔ اس تعویذ کا سایہ ہمیشہ تمہارے سر پر رہے گا۔ غرضیکہ امجد کی خوب ہمت بندھائی گئی اور اس نے امتحان میں خوب نقل کی۔ لہٰذا پرچے نہایت اچھے ہوتے۔ نتیجہ نکلا تو امجد اوّل آیا۔ اب تعویذ پر ریشمی غلاف چڑھایا گیا۔ بڈّی نے تعویذ کو کئی مرتبہ چُوما۔ میرا جی بُری طرح چاہ رہا تھا کہ ایک ایسا ہی تعویذ مجھے بھی مل جائے۔

اب سوال ملازمت کا تھا۔ ایک جگہ درخواست تو دے دی گئی لیکن اُمید کسی کو بھی نہ تھی۔ کچھ دنوں کے بعد بورڈ کے سامنے انٹرویو تھا۔ بورڈ کے صدر نزدیک ہی رہتے تھے۔ شیطان نے امجد کو مشورہ دیا کہ اگر تم صدر صاحب کے سامنے کئی مرتبہ جاؤ تو تعویذ کی برکت سے وہ اس قدر متاثر ہوں گے کہ فوراً منتخب کر لیں گے۔ امجد نے اگلے روز سے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ ان کے گھر گیا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ ملازمت کے سلسلے میں کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔ جو کچھ ہو گا انٹرویو کے وقت سنا دیا جائے گا۔ امجد مُنہ لٹکائے واپس آیا۔ شیطان نے ڈانٹا کہ پھر یہ تعویذ کس واسطے باندھے پھر رہے ہو۔ پیچھا مت چھوڑو ان کا۔ اگلے روز امجد پھر ان کی کوٹھی پر جا کھڑا ہوا۔ دس بجے وہ دفتر گئے یہ ساتھ ساتھ گیا۔ چار بجے واپس آئے، یہ ساتھ واپس آیا۔ کلب گئے۔ رات کو پکچر گئے امجد سائے کی طرح ساتھ رہا۔ اگلے روز وہ شاپنگ کے لیے گئے۔ امجد بھی شاپنگ

کے لیے گیا۔ وہ سٹیشن پر کسی سے ملنے گئے۔ امجد بھی گیا۔ غرضیکہ بازار، ڈاک خانہ، کیفے، سنیما، باغ، جہاں بھی وہ جاتے یہ ساتھ رہتا۔ یہاں تک کہ وہ پچاس ساٹھ میل دُور کسی کو ملنے گئے۔ امجد بھی پچاس ساٹھ میل اسی جگہ گیا۔ انہوں نے بہتیرا کہا کہ میں وعدہ کرتا ہُوں کہ انٹرویو میں تمہارا خیال رکھوں گا لیکن شیطان کی ہدایت کے مطابق امجد بولا کہ وعدہ نہیں ابھی لے لیجئے۔ انہوں نے اسے دھمکایا چمکایا بھی، لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہُوا۔ کہنے لگا کہ میں ساری عُمر اسی طرح آپ کے ساتھ ساتھ رہوں گا۔ آخر وہ اس قدر تنگ آئے کہ انہوں نے امجد کو منتخب کر لیا۔ اس کامیابی پر ایک زبردست دعوت ہوئی۔ تعویذ پر اب پیتل کا خول چڑھایا گیا اور ہر وقت اسے معطّر رکھا جاتا تھا۔ شیطان کی معرفت ان بزرگ کے لیے کچھ نذرانہ بھی بھیجا گیا جسے انہوں نے بمشکل قبول کیا۔ میں نے مصمّم ارادہ کر لیا کہ مَیں بھی ایک تعویذ اپنے لیے بنواؤں گا۔ بڈّی نے بھی شیطان سے یہی خواہش ظاہر کی۔

اب اس لڑکی کی باری آئی۔ سب سے پہلے تو وہاں رسائی کا سوال تھا۔ ان کا نیا کُتّا نہایت ہی ہیبت ناک اور آدم خور قسم کا تھا۔ اسے دیکھ کر ہی امجد کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتی تھی۔ بڈّی نے مشورہ دیا کہ کُتّے کو کچھ کھلا پلا دیا جائے جس سے وہ اِنَّا لِلّٰہ ہو جائے۔ لیکن وہ کُتّا کچھ ایسا بورژوا ذہنیت کا واقع ہوا تھا کہ ایسی ویسی چیزوں کو سُونگھتا تک نہیں تھا۔ شیطان نے ایک موٹا سا ڈنڈا امجد کو دیا اور کہا کہ اسے ہاتھ میں لے کر جاؤ اور مار مار کر کُتّے کا بھُرتہ بنا دو۔ امجد کانپ اُٹھا۔ گڑگڑا کر بولا۔ خدا کا واسطہ، میں یہ ہرگز نہیں کر سکتا۔ شیطان نے تعویذ چُھو کر کہا — جانتے بھی ہو یہ کیا چیز ہے تمہارے بازو پر؟ یہ تعویذ ہمیشہ تمہاری حفاظت کرے گا۔ خواہ تم شیروں سے دل لگی کرتے پھرو، بال تک بیکا نہ ہو گا۔ کافی لمبی بحث کے بعد امجد مانا۔ اگلے روز علی الصبح امجد ہاتھ میں ڈنڈا لے کر ان کے ہاں گیا۔

کُتّا باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ امجد نے کُتّے کی ایسی مرمّت کی کہ طبیعت صاف کر دی۔ اسی دن سے امجد اور کُتّا بڑے گہرے دوست بن گئے۔ امجد کو دیکھ کر وہ نہ صرف دُم ہلاتا بلکہ باقاعدہ مزاج پُرسی کر کے ساتھ ساتھ چلتا۔

وہ صاحب جو گھر آیا کرتے تھے۔ ان کے لیے بھی یہی نسخہ پیش کیا گیا۔ لیکن بڈی نہ مانا، بولا کہ کُتّے اور انسان میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ بہتر ہوگا کہ پہلے انہیں دھمکایا چمکایا جائے۔ وہ صاحب قد میں امجد سے دُگنے تھے۔ امجد پہلے تو بہت ڈرا لیکن جب شیطان نے ڈانٹ کر کہا کہ اس طرح وہ اپنی نہیں بلکہ تعویذ کی توہین کر رہا ہے اور کوئی رقیب امجد کو چھُو تک نہیں سکتا، تو امجد ان صاحب سے ملا اور انہیں صاف صاف بتا دیا کہ خبردار جو آئندہ اس گھر میں قدم رکھا۔ انہوں نے حیران ہو کر پوچھا کہ میاں تم ہو کون؟ یہ بولا کہ میں کوئی بھی ہوں، لیکن یہ واضح رہے کہ میں نے آپ جیسے بہت سوں کو سیدھا کیا ہے بس خیریت اسی میں ہے کہ آپ آئندہ اس گھر کا رُخ نہ کریں۔ امجد نے کچھ اس طرح کی دھمکی دی کہ وہ صاحب واقعی سہم گئے۔ امجد نے چلتے وقت کہا کہ میرا ارادہ تو کچھ اور تھا لیکن فی الحال صرف انتباہ کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ آپ سمجھ دار ہیں تو سمجھ جائیں گے۔ اس دن کے بعد وہ صاحب ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

امجد لڑکی سے ملا۔ خدا جانے کیا باتیں ہوئیں، لیکن سنیچر کو ان دونوں کو میٹنی پر دیکھا گیا۔ لڑکی واقعی نہایت پیاری تھی۔ امجد اس کے سامنے بالکل حکم کا غلام معلوم ہو رہا تھا لیکن خوب اکڑ اکڑ کر چل رہا تھا۔

بڈی تو اب تعویذ پر باقاعدہ ایمان لے آیا تھا۔ بولا کہ میں یہ سب کچھ لکھ کر امریکہ کے سب سے مشہور سائنس کے رسالے میں بھیجوں گا۔ میں نے اس قدر زود اثر اور کارآمد عمل آج تک نہیں دیکھا۔ یہ کسی جادو سے کم نہیں۔ معجزے ابھی ختم نہیں ہوئے۔ مشرق واقعی پُراسرار جگہ ہے۔

تعویذ پر چاندی کا خول چڑھایا گیا۔ ہر دوسرے تیسرے ہم سب اسے چُومتے اور آنکھوں سے لگاتے۔

اب امجد کی تمام مشکلیں حل ہو چکی تھیں۔ صرف اس کی شادی باقی تھی لیکن یہ مشکل سب سے کڑی تھی، کیونکہ اس کے ہونے والے خسر واقعی نہایت گرم خشک انسان تھے۔ امجد نے کئی مرتبہ پیغام بھجوایا لیکن ہر مرتبہ پیغام واپس لوٹا دیا گیا۔

شیطان نے امجد کو یقین دلایا کہ اس تعویذ کے سامنے وہ بزرگ تو کیا ان کے فرشتے بھی سر جھکائیں گے۔ تم آج ہی ان سے ملو اور بغیر کسی تمہید کے ان سے سب کچھ کہہ ڈالو۔ امجد نے یہی کیا۔ بزرگ نے ملاقات کی وجہ پوچھی۔ امجد نے صاف صاف کہہ دیا کہ قبلہ میں آپ کا آنریری فرزند بننا چاہتا ہوں اور آپ کی دخترِ نیک اختر سے عقد کا خواہش مند ہوں۔ اس مرتبہ آپ ہرگز انکار نہیں کر سکتے۔ اگر آپ بحث کرنا چاہتے ہیں تو بسم اللہ۔ پہلے آپ کو میرے شہزادے پن پر اعتراض تھا، سو اب یہ خاکسار باقاعدہ ملازم ہے۔ اگرچہ تنخواہ صرف ڈھائی سو روپے ماہوار ہے لیکن اوپر کی آمدنی کافی ہے۔ مانا کہ یہ بہت زیادہ نہیں، لیکن گستاخی معاف جب آپ کی شادی ہوئی تھی تب آپ کیا کماتے تھے اور تب آپ کے خیالات کیا تھے، خصوصاً اپنے خسر صاحب کے متعلق۔ یقیناً آپ بالکل میری طرح ہوں گے، اور شروع شروع میں ڈھائی سو روپے اتنی بُری تنخواہ نہیں جبکہ اُوپر کی آمدنی بھی شامل ہو۔ شاید آپ یہ فرمائیں گے کہ آپ اپنے رشتہ داروں سے اس سلسلے میں دریافت کرنا چاہتے ہیں، سو یہ بالکل غلط ہے۔ میں نے اپنے کسی رشتہ دار سے نہیں پوچھا اور پھر رشتہ دار بالکل اُلٹے سیدھے مشورے دیں گے۔ یہ ایک ذاتی معاملہ ہے۔ اس میں کسی اور کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔ آج آپ کو ہاں

کرنی ہو گی۔ اسی طرح امجد نے وہ داہنے اور بائیں ہاتھ دیے کہ ان بزرگ کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور ہاں کرنی ہی پڑی۔

اسی شام کو ایک بھاری جشن منعقد ہوا۔ تعویذ پر سونے کا خول چڑھایا گیا۔ شیطان کی معرفت ان پہنچے ہوئے بزرگ کو نذرانہ بھیجا گیا۔ میں نے اور بڈی نے شیطان کی بڑی منتیں کیں کہ کسی طرح ایک ایک تعویذ ہمارے لیے بھی لا دو تاکہ ہمارے بھی دن پھر جائیں۔ شیطان نے وعدہ کیا کہ وہ کوشش کریں گے۔ ہم تقریباً ہر روز تعویذ کو آنکھوں سے اور دل سے لگاتے۔

میں اور بڈی کیفے میں بیٹھے امجد اور مسز امجد کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم بڑے مسرور تھے کیونکہ شام کو شیطان نے تعویذ لانے کا وعدہ کیا تھا۔ ہم دونوں دل ہی دل میں اپنے مستقبل کے متعلق پروگرام بنا رہے تھے کہ امجد اور مسز امجد پہنچے۔ آج امجد ایک ایسا دلیر، نڈر اور بے پرواہ نوجوان نظر آ رہا تھا جس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ جس کے دل میں اُمنگیں تھیں اور جس نے ایک بہت اچھا سوٹ پہن رکھا تھا۔ باتوں باتوں میں اس شام کا بھی ذکر ہوا جب امجد کو ہم نے اسی جگہ روتے پیٹتے دیکھا تھا۔ مسز امجد کے فراق میں۔ صرف چند مہینوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔ صرف ایک مقدس عمل کی بدولت۔

اس تعویذ کی برکت سے جو امجد کے بازو پر بندھا ہوا تھا۔ شیطان نے بھی دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔ نہ جانے کن کن مصیبتوں کے بعد یہ تعویذ دستیاب ہوا ہوگا۔ اگر آج امجد کے پاس یہ تعویذ نہ ہوتا تو غالباً وہ پھر یہیں بیٹھا سینڈوچز اور کیک کے ٹکڑوں پر آنسو بکھیر رہا ہوتا اور اب ہمیں بھی ایسے تعویذ ملیں گے۔ ہمیں اپنے اوپر رشک آنے لگا۔ بار بار ہم دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شیطان کے انتظار میں۔

بڈی نے تعویذ کی زیارت کرنی چاہی۔ امجد نے نہایت حفاظت سے تعویذ اتارا اور بڈی کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ بڈی نے اسے چُوما، آنکھوں سے لگایا اور پوچھا "بھلا تعویذوں میں کیا لکھا ہوتا ہے؟" ہم نے کہا کہ عبارت ہوتی ہے۔ بڈی سمجھ نہ سکا۔ اسے بتایا گیا کہ مقدس الفاظ ہوتے ہیں اور ایک خاص ترتیب سے لکھے جاتے ہیں۔ اس نے پوچھا کہ بھلا اس تعویذ میں کون سے الفاظ ہیں؟ ہم نے لاعلمی ظاہر کی۔ بڈی کہنے لگا۔ کیوں نہ اسے کھول کر دیکھیں۔

امجد بولا۔ ہرگز نہیں' اس طرح بے ادبی ہوتی ہے۔ میں نے بھی کہا کہ گناہ ہوگا لیکن بڈی نہ مانا۔ بولا "مجھے بڑا اشتیاق ہے۔ سارا گناہ میرے ذمے رہا۔ میں نہایت ادب سے اسے کھولوں گا اور الفاظ دیکھ کر بالکل اسی طرح بند کر دوں گا۔ پھر تم اسے بازو پر باندھ لینا۔"

میں بھی سوچنے لگا کہ بھلا دیکھیں تو سہی وہ کون سے الفاظ ہیں جنہوں نے جادو کی طرح اثر دکھایا۔ میں نے بھی بڈی کا ساتھ دیا۔ امجد کہنے لگا کہ کھولنے سے تعویذ کی تاثیر جاتی رہے گی۔ بڈی بولا۔ بھئی سچ پوچھو تو اب اس تعویذ نے اپنا کام کر دیا ہے۔ اب تمہیں کسی مزید تاثیر کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے مسز امجد سے پوچھا۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ آخر امجد بھی مان گیا۔ اس شرط پر کہ اگر کوئی گناہ ہُوا تو بڈی کے سر پر ہوگا۔

بڈی نے بڑی حفاظت سے خول کھولا اور تعویذ نکالا۔ پھر آہستہ آہستہ موم جامہ کھولنے لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے پہنچے ہوئے بزرگوں کے نورانی چہرے، فقیروں کے مزار، سبز غلاف، پھولوں کے ہار، جلتے ہوئے چراغ، مزاروں کے گنبد اور خانقاہیں پھرنے لگیں۔ جیسے عنبر اور لوبان کی خوشبو سے سب کچھ مہک اٹھا اور پاکیزہ روحیں ہمارے گرد منڈلانے لگیں۔ فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ ماحول کچھ ایسا مقدس سا ہو گیا تھا کہ میرا دل دھڑکنے لگا۔ ہونٹ خشک ہو گئے۔

بڈی نے تعویذ کا کاغذ کھولا اور پڑھنے لگا۔ میں رہ نہ سکا۔ بڑی بے صبری سے کاغذ چھین لیا۔ کاغذ پر شیطان کی مخصوص طرزِ تحریر میں یہ مصرعہ لکھا تھا۔

"آیا کرو اِدھر بھی مری جاں کبھی کبھی"

ننانوے ناٹ آؤٹ

بڑی مشکلوں سے ہم نے وہ میچ جیتا، یا یوں کہیے کہ ہارتے ہارتے بچے۔ سب سے زیادہ سکور مقصود گھوڑے کا تھا۔ اس نے صبح سے کھیلنا شروع کیا۔ کوئی سٹروک ایسا نہ تھا جو اس نے نہ دکھایا ہو۔ بولرز کو خوب سزا دی اور دو گھنٹے کے بعد تین رنز بنائیں۔ اس کے بعد جو اچھل اچھل کر کھیلا ہے تو دوپہر تک تین سے دس تک سکور پہنچا دیا۔ لنچ کے بعد وہ بے حد تیز کھیلا۔ آگے بڑھ بڑھ کر وہ ہٹیں لگائیں کہ پانچ رنز کا اضافہ اور کر دیا۔ جب ہم شام کو رو پیٹ کر جیتے اور آخری کھلاڑی نے آخری ہٹ لگائی تو مقصود گھوڑا بیس رنز بنا چکا تھا۔

ہمارے مخالف بھی کافی گئے گزرے تھے۔ وہ بھی اسی طرح کھیلے تھے۔ ان کی بولنگ کا یہ حال تھا کہ گیارہ کھلاڑیوں میں سے دس نے بولنگ کی تھی اور گیارھواں وکٹ کیپر تھا۔ لہٰذا مجبور تھا، ورنہ وہ بھی حسبِ توفیق مدد کرتا۔ کھیل دیکھنے والوں کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ دونوں ٹیموں کو یہ ڈر نہیں ہے کہ کہیں ہار نہ جائیں بلکہ یہ خطرہ ہے کہ کہیں جیت نہ جائیں۔

مَیں مقصود گھوڑے کو لے کر شیطان کے ہوسٹل میں پہنچا۔ ان کے کمرے میں مدھم روشنی میں ایک بڑے سے پلنگ پر چند حضرات رضائیاں اوڑھے کھانا کھا رہے تھے۔

شیطان بولے "سردی زیادہ ہے اور ہم تھکے ہوئے ہیں"۔ انہوں نے ہمارے لیے رضائی منگائی اور ہم بھی کھانے میں شریک ہو گئے۔ مقصود گھوڑے نے پوچھا "رُوفی صاحب! آپ کیسے ہیں؟"

شیطان بولے "میں بفضلِ خدا تعالیٰ بخیریت ہوں اور خیر و عافیت آپ کی خداوند کریم سے نیک مطلوب ہوں۔ دیگر احوال یہ ہے کہ میں تندرست ہوں۔"

میں نے سیکنڈ شو کے لیے کہا اور پوچھا "اب کیا بجا ہوگا؟"

شیطان گھڑی دیکھ کر بولے "جمعرات ہے۔"

ویسے سنیما میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ شیطان کہنے لگے "ایک گھنٹے کا کیا ہے، دس منٹ میں گزر جائے گا۔ آج سنیما اسی طرح چلیں گے، رضائیاں اوڑھ کر، اور نوکر حُقہ ساتھ لے کر چلے گا۔"

اس پر بڑی بحث ہوئی۔ مقصود گھوڑے نے کہا "میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ رضائیاں اوڑھ کر نہ چلیں بلکہ ---"

شیطان جلدی سے بولے "میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ مجھے مشورہ نہ دیں۔ آج رضائیاں اوڑھ کر چلنا ہوگا، سردی بہت ہے۔"

"اوورکوٹ پہن لو۔" میں نے کہا۔

"یہ اوورکوٹ کم بخت ایسا ہے کہ اسے پہن کر اور زیادہ سردی لگتی ہے۔"

"یہ وہی اوورکوٹ تو نہیں جسے الٹوایا گیا تھا؟"

"ہاں وہی ہے! پہلے اسے الٹوایا گیا تھا، پھر سیدھا کرایا گیا ہے۔ لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔"

"یہ روشنی بہت مدھم ہے۔" کسی نے کہا۔

شیطان نے نوکر سے پوچھا "کیوں یہ بلب کتنے ہارس پاور کا لاتے ہو؟"

اس غریب نے بلب کی ہارس پاور بتا دی۔

شیطان بولے "آج بجلی ہی بہت کم آ رہی ہے۔"

شیطان چلتے وقت اپنی عینک ڈھونڈنے لگے۔ کسی نے بتایا کہ ایک عینک تو ان کی ناک پر رکھی ہے۔

بولے "آج کل میرے پاس تین عینکیں ہیں۔ ایک دور کی چیزیں دیکھنے کے لیے، دوسری نزدیک کی چیزوں کے لیے --- اور تیسری ان دونوں کو ڈھونڈنے کے لیے۔"

میں یہی سوچ رہا تھا کہ اگر جج صاحب کے کنبے میں سے کسی نے مجھے دیکھ لیا تو کیا کہیں گے۔ ذرا سی دیر میں ہم مال روڈ پر رضائیاں اوڑھے جا رہے تھے اور ہمارے پیچھے نوکر حُقہ تھامے آ رہا تھا۔

سنیما پہنچے، وہاں اتفاق سے میری نگاہ جج صاحب کی موٹر پر جا پڑی۔ میں نے اندر جاتے وقت اپنی رضائی تو مقصود گھوڑے کے اوپر پھینکی اور شیطان کی نظر بچا کر دُور جا بیٹھا۔ پیچھے مُڑ کر جو دیکھتا ہوں تو جج صاحب بیٹھے تھے۔ میں بالکل سیٹ میں دھنس گیا کہ کہیں نظر نہ آ جاؤں، مگر ذرا سی دیر میں ننھی میرے سامنے کھڑی تھی مجھے پیچھے جانا پڑا اور ننھی کی سیٹ ملی۔ جج صاحب نے پہلے تو میرے نہ آنے کی شکایت کی۔ میں نے امتحان کا بہانہ بنا دیا۔

پھر پوچھا "تمہارے ساتھ وہ خواتین کون تھیں؟"

"کون سی خواتین؟"

"ابھی ابھی جو تمہارے ساتھ تھیں --- وہ جو سامنے بیٹھی ہیں۔" انہوں نے شیطان وغیرہ کی طرف اشارہ کیا جو حُقہ پی رہے تھے۔

"ارے لاحول ولا قوۃ! یہ خواتین تو حُقہ پی رہی ہیں۔" وہ چونک کر بولے۔

"جی نہیں --- یہ خواتین نہیں ہیں۔ کچھ اور ہی ہیں۔"

"میں کہہ جو رہا ہوں کہ خواتین ہیں۔ غضب خدا کا مستورات کو حُقّہ پیتے میں آج پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔"

مَیں نے کن انکھیوں سے رضیہ کو دیکھا جو کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ان دنوں رضیہ مجھ سے رُوٹھی ہوئی تھی۔ مَیں کافی بیزار تھا اور شیطان مجھ سے بیزار تھے۔ بار بار وہ یہی کہتے کہ "میاں اگر بس یا لڑکی ہاتھ سے نکل جائے تو ذرا فکر نہیں کرنا چاہیے۔ دوسری ابھی آتی ہوگی۔"

ان دنوں جتنا میں اسے منانے کی کوشش کرتا اتنا وہ اور رُوٹھ جاتی۔ روٹھنے کی وجہ تھی ایک لڑکی جو ٹینس میں میری پارٹنر تھی۔ اس کا نام تو کچھ اور تھا لیکن سب اسے عینک کہا کرتے۔ اس کے خدوخال میں سب سے نمایاں چیز اس کی عینک تھی بڑی لمبی چوڑی اور وزنی عینک! اگر میں رضیہ کی جگہ ہوتا تو ہرگز بدگمان نہ ہوتا۔ نتھی نے ہمیں چند مرتبہ اکٹھے دیکھا اور رضیہ سے کہہ دیا۔ پھر ایک شام کو عینک نے کہا کہ "میرے ڈیڈی شام کی ٹرین سے گزر رہے ہیں، مجھے سٹیشن پر لے چلیے۔" اس کے پاس سائیکل نہیں تھی اور ٹرین میں بہت تھوڑا وقت تھا۔ میں اسے لے کر نکلا ہی تھا کہ رضیہ اور حکومت آپا مل گئیں۔ ادھر سٹیشن پر ہمیں ایک نہایت ہی کرخت قسم کے درازریش بزرگ ملے جنہیں ہرگز ڈیڈی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میرا اور شیطان کا امتحان نزدیک تھا۔ اس لیے ہم دونوں جج صاحب کے مکان سے ہوسٹلوں میں چلے آئے تھے۔ ان دنوں جج صاحب بڑی سرعت سے کوٹھیاں بدل رہے تھے۔ شیطان جب کبھی ان سے ملتے، یہی پوچھتے کہ آج کل آپ کہاں رہتے ہیں؟

ان کی پہلی کوٹھی میں ہمارے رہتے ہوئے چوری ہوئی۔ جج کے ہاں چوری۔! صبح صبح پتہ چلا کہ رات کو چوری ہوئی، لیکن سب چیزیں جوں کی توں موجود تھیں۔ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ چرایا کیا گیا ہے۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ چور محض "تفریحاً" آئے تھے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ میرے سارے کپ جو انگیٹھی پر اور الماریوں میں رکھے تھے، غائب ہیں۔ خوب چمکیلے اور بڑے بڑے کپ تھے۔ شاید چور نے انہیں اصلی چاندی کے برتن سمجھا۔

وہ کوٹھی ویسے تھی بھی سنسان سی جگہ میں۔ ایک مرتبہ سارا کنبہ کسی دوسرے شہر میں گیا ہوا تھا۔ مَیں اور شیطان سیکنڈ شو دیکھ کر دیر سے لوٹے۔ کوٹھی میں بالکل اندھیرا تھا۔ ہم دیوار کُود کر چھوٹے راستے سے اندر چلے آئے۔ اندھیرے میں آہٹ سنائی دی۔ دبے پاؤں جا کر دیکھتے ہیں تو ایک صاحب تالا کھولنے کی کوشش فرما رہے تھے۔ ہم انتظار کرتے رہے۔ جب تالا کھُل گیا تو شیطان نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے شکایت آمیز لہجے میں کہا "یار بڑے افسوس کی بات ہے۔"

انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی، لیکن ہم نے انہیں کہیں نہ جانے دیا۔ اندر لے آئے۔ انہیں چائے پلائی گئی۔ چاکلیٹ کھلائے گئے۔ پھر کپوں کے متعلق پوچھا گیا۔ اُنہوں نے قسم کھائی کہ انہوں نے نہیں چرائے۔ اگر وہ چوری کرتے بھی تو کپ کبھی نہ چراتے۔ سپورٹس مین معلوم ہوتے تھے۔ ہم نے ہاتھ ملا کر انہیں رخصت کیا۔

جج صاحب نے پھر کوٹھی بدلی۔ نئی کوٹھی میں بجلی کی فٹنگ بالکل غلط تھی۔ پنکھا چلاؤ تو قمقمے جلتے تھے۔ ٹیلیفون کرو تو پنکھا چلتا تھا۔ ریڈیو بے حد ٹھنڈا رہتا۔ ادھر فریجیڈیئر میں موسیقی سنائی دیا کرتی۔ اس مرتبہ جو کوٹھی بدلی تو پڑوس میں دن رات قوالیاں ہوتیں، بینڈ بجتے، جلسے ہوتے۔ غرضیکہ اسی طرح ہوتا رہا۔ اب جو نیا مکان ملا تو ایسی جگہ کہ آس پاس بے شمار لڑکیاں رہتی تھیں۔ سہ پہر کو لڑکیاں سکولوں اور کالجوں سے واپس لوٹتیں تو خوب رونق ہو جاتی۔ شیطان نے اس جگہ کا نام مینا بازار رکھا۔ پروگرام یہ تھا

کہ امتحان ختم ہوتے ہی ہم ہوسٹل چھوڑ کر جج صاحب کے ہاں آجائیں گے۔

جج صاحب بدستور ان خواتین کو دیکھ رہے تھے جو حقّہ پی رہی تھیں۔

رضیہ نے دوپٹہ اس انداز سے رکھا تھا کہ مجھے صرف اس کی ناک کا ذرا سا حصّہ نظر آرہا تھا۔ میرے خیال میں وہ ان تمام ناکوں کے ذرا سے حصّوں سے حسین تھا جو میں نے آج تک دیکھے تھے۔ حکومت آپا مجھے بڑی بُری طرح گھُور رہی تھیں۔ شیطان کا خیال تھا کہ حکومت آپا کو مجھ سے ایک حسرت آمیز نفرت تھی۔

میں ننھی کو کہانیاں سنا رہا تھا۔ سنو ننھی، ایک شخص اندھیری رات میں شیر کا شکار کھیلنے ایک بہت ڈراؤنے اور تاریک جنگل میں گیا۔ شیر بولا — "HURRAY" — اچھا ایک اور کہانی سنو — دو چیتے کے شکاری اور ایک چیتا۔ ایک چیتے کا شکاری اور ایک چیتا۔ اور آخیر میں فقط چیتا۔ اور ننھی باقاعدہ ڈر گئی۔

چلتے وقت جج صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ ہمارا اگلا میچ دیکھنے ضرور آئیں گے۔

ہمارے کلب کے کپتان گیدی صاحب تھے۔ ان کا اصلی نام زیدی، مہدی یا کچھ اسی قسم کا تھا۔ ان کا قد بہت چھوٹا تھا اور بقول شیطان کے وہ سطح سمندر سے فقط ساڑھے چار فیٹ بلند تھے۔ ان کے ساتھ ہر وقت ان کے دو مشیر ہوتے جو اتفاق سے کافی دراز قد تھے۔ گیدی صاحب ان کے درمیان میں چلتے۔ شیطان نے ان تینوں کا نام ایک سو ایک — ۱۰۱ — رکھا ہوا تھا۔ ان کے قدوں کے مطابق۔

ٹیم کی انتخابی کمیٹی بھی تھی جو ایک ممبر پر مشتمل تھی — گیدی صاحب پر! بڈی بھی ہمارے کلب کا ممبر تھا۔ امریکہ میں اس نے بیس بال کھیلی تھی۔ چنانچہ کرکٹ بھی وہ بیس بال کی طرح کھیلتا تھا۔ ہمارے کلب کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہم لگاتار

تین میچ جیت کر فائنل کھیلنے والے تھے۔

سہ پہر کو ٹیم پریکٹس کے لیے آتی۔ گیدی صاحب میچ کے لیے بیٹنگ کی ترتیب دینے لگے۔ شروع میں وہ اور مقصود گھوڑا، ساتویں وکٹ پر بڈی۔ آٹھویں پر میں اور نویں پر شیطان۔ حساب لگانے کے بعد جب شیطان کو معلوم ہوا کہ وہ گیارھویں کھلاڑی ہیں تو مچل گئے اور گیدی صاحب سے پوچھا "مجھے گیارھواں کیوں بھیجا جا رہا ہے؟"

"اس لیے کہ کوئی بارھواں نہیں ہوتا۔" جواب ملا۔ "کپتان ہمیشہ صحیح اندازہ لگا سکتا۔ اس کا نظریہ ہمیشہ درست ہوتا ہے۔"

شیطان بولے۔ "ہر شخص کے دو نظریے ہوتے ہیں — اس کا ذاتی نظریہ — اور دوسرا نظریہ، جو عموماً صحیح نکلتا ہے۔"

مصیبت یہ تھی کہ شیطان نہ بولر تھے نہ بیٹسمین، نہ وکٹ کیپر۔ مگر ان کا دعوٰی تھا کہ ایک اعلیٰ درجے کی ٹیم میں پانچ بہترین بیٹسمین ہونے چاہئیں، چار بہترین بولر، ایک اچھا وکٹ کیپر اور ایک ردّی۔

ویسے تقریباً ہر میچ میں شیطان کا سکور صفر ہوتا۔

ہر روز جب مشرق سے سورج نکلتا ہے تو کلیاں کھِل کر پھُول بن جاتی ہیں تتلیاں جاگ اٹھتی ہیں۔ پرندے چہچہانے لگتے ہیں۔ ہر روز سورج ڈوبتے وقت آسمان گلابی ہو جاتا ہے۔ چاندنی رات میں ایک عجیب سا فسوں آسمان سے زمین تک چھا جاتا ہے۔

لیکن حکومت آپا کو ان باتوں کا علم تک نہ تھا۔

جب ہم جج صاحب کی کوٹھی میں پہنچے تو عجب سہانا سماں تھا۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی آخری شعاعیں ٹہنیوں اور پتّوں پر رقصاں تھیں۔ باغیچے میں ایک فوارہ چل رہا تھا —

گلاب کے سرخ پھولوں نے جیسے آگ سی لگا رکھی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ بے کار تھا کیونکہ نزدیک ہی حکومت آپا بیٹھی تھیں۔

حکومت آپا مجھ سے خفا اس لیے ہوئیں کہ جب وہ موٹی ہو گئی تھیں تو میں نے ان کو دُبلا ہونے کا مناسب نسخہ نہیں بتایا۔ میں نے فاقہ کشی تجویز کی، مگر وہ بولیں۔

"نہیں کوئی کھانے کی ایسی چیز بتاؤ جس سے دُبلی ہو جاؤں۔" بڑی مصیبتوں کے بعد مَیں نے ان کا لنچ چھُڑایا۔ ایک روز جا کر دیکھتا ہوں تو وہ چائے پر پلاؤ کھا رہی تھیں۔ اور میں نے ان کا لنچ پھر شروع کرا دیا۔

شیطان کا خیال تھا کہ وہ صبح صبح شام کلیاں گایا کرتی ہیں۔ اور باتیں کرتے وقت وہ کہتی کچھ ہیں' ان کی نگاہیں کہیں اور ہوتی ہیں، دھیان کسی اور طرف، اور باتوں کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔

ہمیں دیکھ کر وہ مسکرائیں ــــ اور سورج غروب ہو گیا۔

کھانے کے بعد مجھے یونہی خیال آیا کہ شیطان اور حکومت آپا دیر سے غائب ہیں۔ تلاش کرنے پر دیکھتا ہوں کہ دونوں فوارے کے پاس بیٹھے ہیں اور رومان انگیز گفتگو ہو رہی ہے۔ میں چھُپ کر سننے لگا۔

شیطان بولے "سچ مچ تم بہت پیاری معلوم ہو رہی ہو۔"

حکومت آپا نے کہا۔ "سچ مچ میرے پاس اس وقت روپے نہیں ہیں، ورنہ ضرور قرض دے دیتی۔"

شیطان بولے۔ "یقیناً ان چند مہینوں میں تمہاری رنگت نکھر آئی ہے جب تم جوُن میں آئیں تو تمہاری جوُن بدلی ہوئی تھی۔"

"یقیناً میرے پاس روپے نہیں ہیں۔"

"روپے کون مانگتا ہے تم سے؟ بھلا ایسی رومان پرور فضا میں جہاں باغ کا

ایک تنہا گوشہ ہو، فوارہ چل رہا ہو، چاندنی چھٹکی ہوئی ہو اور تم سامنے ہو' وہاں روپوں کا کیسے خیال آسکتا ہے۔ وہاں تو ایک معصوم سی آرزو دل میں کروٹ لینے لگتی ہے۔"

"سچ مچ؟" حکومت آپا شرما گئیں۔

"ہاں سچ مچ۔"

"بھلا اس وقت آپ کو کس چیز کی آرزو ہے؟"

"کلوروفارم کی۔" شیطان بولے۔ "اور جانتی ہو حکومت، انسان کا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟"

"کون ہے؟"

"آئینہ! اور کئی انسان آئینے کو بھی دھوکا دے جاتے ہیں۔ آئینہ کچھ کہے، وہ ایک نہیں سنتے۔ ان میں سے ایک تم ہو۔"

اب حکومت آپا کچھ بگڑنے لگیں۔ شیطان جلدی سے بولے۔ "نہیں یہ بات نہیں ہے۔ یونہی منہ سے نکل گیا تھا۔"

پھر رومانی باتیں ہونے لگیں۔ حکومت آپا نے پوچھا۔ "رومانی ادب میں تمہاری محبوب کتاب کون سی ہے؟"

"ڈکشنری!" شیطان نے جواب دیا۔

حکومت آپا شیطان کے چہرے کو غور سے دیکھتی رہیں' پھر بولیں۔ "تمہاری ناک اتنی لمبی کیوں ہے؟"

شیطان نے ایک آہ بھری اور بولے۔ "کیا بتاؤں کہ ناک لمبی کیوں ہے' یہ فطرت کے راز ہیں۔ تم ہی بتاؤ کہ تمہارا ماتھا باہر کو کیوں نکلا ہوا ہے۔ تمہارے کان مڑے ہوئے کیوں ہیں۔ تمہارے دانت خرگوش کے دانتوں کی طرح کیوں ہیں۔ حکومت' تم ان ہستیوں میں سے ہو جن سے اگر وقت پوچھا جاتے تو وہ گھڑی بنانے کا طریقہ

بتا دیں۔ تم ان صحرا نوردوں کی طرح ہو جو آج یہاں ہیں ـــ اور کل ـــ کل بھی یہیں ہیں۔ آج سے پانچ سال پہلے سب کہتے تھے کہ اس لڑکی کا مستقبل نہایت شاندار ہے اور اب سب کہتے ہیں کہ اس لڑکی کا ماضی واقعی لاجواب ہو گا۔"

اب تو باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی اور مجھے بھی شامل ہونا پڑا۔

واپسی پر میں نے رضیہ کی بے رخی کا ذکر کیا، رُوٹھنے کی وجہ بتائی اور یہ بھی بتایا کہ اسی لیے میں نے عینک سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے۔

شیطان نے مشورہ دیا کہ اگر مَیں تمہاری جگہ ہوں تو عینک کو ہر وقت سائیکل پر بٹھائے پھروں اور رضیہ کے گھر کے سامنے سے ہر روز دو مرتبہ گزرا کروں تاکہ وہ اچھی طرح دیکھ لے اور یہ رُوٹھنا رُوٹھنا سب درست ہو جائے۔ میری مانو تو آج سے تم بھی رضیہ سے رُوٹھ جاؤ اور عینک کے ساتھ خُوب چُہلیں کرو۔ پھر قدرت کا تماشا دیکھو۔

مَیں نے ان کو اپنا خواب سنایا "کل رات مَیں نے خواب میں دیکھا کہ رضیہ نے آسمانی دوپٹہ اوڑھ رکھا ہے جس میں سنہرے تارے ہیں اور روپہلی پلّو جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔ اس کے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے اور ہاتھ میں رنگ برنگے پھُولوں کا گلدستہ ہے۔"

"تو جناب آج کل خواب بھی ٹیکنی کلر میں دیکھتے ہیں۔ سب سے اچھا خواب جانتے ہو کیا ہے؟"

"کیا؟"

"یہی کہ کوئی خواب نہ آئے۔"

مَیں نے ان کو بتایا کہ جب سے رضیہ رُوٹھی ہے مَیں تنہا سا رہتا ہوں اور مَیں محبت میں خوش نصیب ہرگز نہیں رہا۔

وہ بولے "محبت میں خوش نصیب صرف ایک قسم کے انسان رہتے ہیں، وہ ہیں

کنوارے ـــ اور میاں اگر تم اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہو، یا تنہائی سے ڈرتے ہو تو ہرگز شادی مت کرنا۔"

مَیں نے ایک رومان شروع کیا لیکن انہوں نے بات کاٹی اور کہا۔ محبّت کی بہترین اور مختصر ترین کہانی مَیں تمہیں سناتا ہوں۔ سنو۔ لڑکا بولا۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟ لڑکی بولی۔ نہیں۔ اور اس کے بعد وہ دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔

ہمارا میچ شروع ہوا۔ کچھ چھٹیاں تھیں اور کچھ مینا بازار کا قرب۔ ویسے بھی چاروں طرف لاتعداد ریٹائرڈ بزرگ رہتے تھے۔ وہ سب آئے۔ ساتھ بے شمار لڑکیاں آئیں۔ ہمارے کپتان نے حسبِ معمول ٹاس ہارا اور ہم فیلڈ کرنے چلے۔ لڑکیوں کی تعداد کا اندازہ ہمیں میدان میں پہنچ کر ہوا۔ جدھر نظر جاتی تھی رنگ برنگے ملبوس دکھائی دیتے تھے۔

"ہوائے او ہوائے آج مجھے امریکا یاد آرہا ہے۔" بڈی بار بار کہتا۔

گیدی صاحب نے چمکتی ہوئی نئی گیند میرے ہاتھ میں دی۔ مَیں فیلڈ جمانے لگا۔ شیطان کا اصرار تھا کہ ان کو شامیانے کی طرف بھیج دیا جائے۔ غالباً اس لیے کہ وہاں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی ـــ تالیاں بجیں اور بیٹسمین شامیانے سے روانہ ہوئے۔ ایک صاحب بے حد موٹے تھے اور دوسرے بالکل ذرا سے تھے اور کم عمر بھی تھے۔ کسی نے بتایا کہ یہ کسی یار جنگ بہادر کے لڑکے ہیں۔ شیطان چونک کر بولے۔ اچھا؟ اتنا کم عمر اور ابھی سے ایک یار جنگ بہادر کا لڑکا۔ کمال ہے۔"

ان موٹے تازے حضرت کا نام قلندر صاحب تھا۔ شاید قلندر بیگ ہو گا یا قلندر حسین۔ یہ نام ہمیں یوں معلوم ہوا کہ جب میری تیسری گیند ان کی توند سے

چھو کر وکٹ کیپر کے برابر سے گزری تو یار جنگ بہادر کے صاحبزادے نے ادھر سے چلّا کر کہا "قلندر صاحب وہیں ٹھہریے"۔ دوسرے اوور میں ہمیں پتہ چلا کہ چھوٹے صاحب کا نام چنوں میاں تھا۔ انہوں نے ایک چھوٹی سی ہٹ لگائی۔ ادھر سے قلندر صاحب چلّائے "چنوں میاں وہیں ٹھہریے"۔

دیر تک یہی ہوتا رہا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو وہیں ٹھہرنے کے لیے کہتے رہے۔ ایک گیند بڈی کے سامنے سے گزری، لیکن اس نے ہاتھ تک نہیں ہلایا۔ معلوم ہوا کہ جناب لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے مُفت کی باؤنڈری ہو گئی۔ قلندر صاحب نے ایک گیند ہوا میں اٹھا دی۔ شیطان اسے بخوبی کیچ کر سکتے تھے لیکن انہوں نے گیند کی طرف دیکھا تک نہیں۔ کچھ دیر کے بعد معلوم ہوا کہ سوائے بولر اور بیٹسمین کے ہر ایک رنگین لباسوں اور حسین چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب قلندر صاحب نے وکٹ کے سامنے ٹانگ اڑا دی اور مَیں نے چلّا کر اپیل کی تو امپائر صاحب چونک پڑے۔ جیسے جاگ کر بولے۔ ایں؟ پھر آہستہ آہستہ سے کہنے لگے۔ بھئی معاف کرنا، میرا دھیان کسی اور طرف تھا۔ حالانکہ یہ امپائر اچھے خاصے قبر رسیدہ بزرگ تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ ہم ساری عمر بولنگ کرتے رہیں گے اور قلندر صاحب اور چنوں میاں ساری عمر کھیلتے رہیں گے۔

دفعتہً قلندر صاحب نے ایک گیند آسمان میں چڑھا دی۔ گیند اُونچی ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ نگاہوں سے غائب ہو گئی۔ ہم سب آسمان کی طرف یوں تک رہے تھے جیسے عید کا چاند دیکھ رہے ہوں۔ پھر ایک چھوٹا سا نقطہ نظر آیا اور ہم سب کیچ کرنے کے لیے بھاگے۔ وکٹ کیپر اور مقصود گھوڑا اتنے زور سے ٹکرائے کہ دونوں عارضی طور پر بیہوش ہو گئے۔ ہم سب ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔ پھر گیدی صاحب للکارے "سب ہٹ جاؤ یہ کیچ میں کروں گا"۔ گیدی صاحب

دونوں ہاتھ یوں پھیلائے کھڑے تھے جیسے بڑے خشوع سے دعا مانگ رہے ہوں۔ گیند بلند فضاؤں سے اُترنی شروع ہوئی اور گیدی صاحب نے ہاتھ اور بھی اُونچے پھیلا دیے۔ گیند نیچے آئی۔ لیکن ان کے ہاتھوں میں نہیں۔ شاید یہ گیند کی غلطی تھی۔ وہ سیدھی ان کے ہیٹ پر لگی۔ ٹپ سے آواز آئی۔ گیند اچھلی، پھر ٹپ سے ہیٹ پر گری اور آہستہ سے ان کی گردن پر لڑھکتی ہوئی زمین کی طرف چل دی۔ پھر یک لخت وکٹ کیپر صاحب جو آنکھیں بند کیے بے ہوش پڑے تھے، چونکے اور گرتی ہوئی گیند کو دبوچ لیا۔ اُدھر گیدی صاحب دھڑام سے گرے اور کچھ دیر کے لیے بے ہوش ہو گئے۔ قلندر صاحب آؤٹ ہو گئے۔ جب وہ واپس جا رہے تھے تو شیطان نے ان سے کہا۔ قبلہ اب آپ کے بغیر یہ میدان خالی خالی سا معلوم ہو گا۔ واقعی قلندر صاحب نہایت موٹے تھے۔

اب جو نئے صاحب آئے تو انہوں نے شیطان کو دیکھا اور فوراً لپٹ گئے۔ حالانکہ شیطان نے اب تک کوئی اشتیاق ظاہر نہیں کیا تھا۔

انہوں نے بتایا "آپ مجھے پہچانتے نہیں، مَیں وہی بیزار اختر ہوں"۔

شیطان نے بغور دیکھا اور کہا "ممکن ہے کہ آپ وہی بیزار ہوں، لیکن اختر وہ ہرگز نہیں ہیں جو پہلے تھے"۔

وہ بولے "میں سچ مچ وہی ہوں، فقط ذرا بدل گیا ہوں۔ بیمار تھا اس لیے پہلے سے میرا قد چھوٹا ہو گیا ہے"۔

اب وہ دونوں ہیں کہ باتیں کر رہے ہیں اور ہم سب انتظار کر رہے ہیں۔ آخر امپائر نے ٹوکا، تب بیزار اختر نے کھیلنا شروع کیا۔ میری پہلی ہی گیند انہوں نے ہوا میں اٹھا دی۔ ایک فیلڈر کے پاس سے گزری لیکن اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ ایک اور فیلڈر کے پاس پہنچی تو انہوں نے دیکھا تک نہیں۔ جب مَیں نے ان کا نام پکارا، تب

چونکہ انہوں نے گیند اٹھائی اور از راہِ کرم میری طرف پھینک دی۔ اب یہاں تک نوبت پہنچ چکی تھی کہ جس کھلاڑی کی طرف گیند جاتی فوراً اس کا نام لے کر اسے مطلع کیا جاتا۔

چنّو میاں نے گھوم کر LEG کی طرف ہٹ لگائی۔ آگے مقصود گھوڑا دنیا و مافیہا سے غافل مراقبے میں کھڑا تھا۔ دھم سے گیند اس کے پیٹ میں لگی۔ اس نے نعرہ لگا کر وہیں دبوچ لی۔ چنّو میاں آؤٹ ہو گئے اور انہیں جاتے دیکھ کر سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ شیطان دُور سے بھاگے بھاگے آئے اور میرے کان میں بولے۔ "وہ جو دو لڑکیاں نظر آ رہی ہیں، وہ چنّو میاں کی رشتہ دار معلوم ہوتی ہیں۔"

لنچ پر معلوم ہوا کہ شیطان درست کہتے تھے۔ چنّو میاں ان دونوں لڑکیوں کو لے کر آئے، تعارف ہوا۔ ایک بوڑھے پروفیسر اپنی لڑکیوں سمیت آئے ہوتے تھے۔ ایک ہم جماعت بھی مل گئی۔ رضیہ منہ پھیرے بیٹھی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کہیں سے سو ڈیڑھ سو لڑکیاں اور بھی آ جائیں تاکہ آج رضیہ کے سامنے خوب چہلیں کی جائیں۔
شیطان شکایت کر رہے تھے۔ "یہ ہجوم کافی بدمذاق معلوم ہوتا ہے کسی نے ہمارا آٹو گراف نہیں لیا۔"

لنچ کے بعد مجھے اور شیطان کو باؤنڈری پر بھیج دیا گیا۔ وہاں ہم باتیں کرنے لگے۔ اس لیے گیدی صاحب نے ناراض ہو کر ہمیں واپس بلا لیا اور بیٹسمین کے بالکل قریب کھڑے ہو کر فیلڈ کرنے کو کہا۔ ایسی جگہ بہت سنجیدگی سے فیلڈ کرنا پڑتا ہے۔ ہم بہت گھبرائے۔ یہی دعا مانگ رہے تھے کہ کہیں کوئی کیچ نہ آ جائے۔ تھوڑی دیر میں ہم نے پھر باتیں شروع کر دیں۔

مَیں نے کچھ کہا۔ شیطان بولے۔ "ملاؤ ہاتھ اسی بات پر۔" انہوں نے میری طرف ہاتھ بڑھایا اور شُوں سے ایک چیز آئی اور شپ سے شیطان کی ہتھیلی سے چپک گئی۔

لاحول ولا قوۃ، یہ تو گیند تھی۔ شیطان نے ایک نہایت لاجواب کیچ کیا تھا۔ اب ہم کھیل کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ پانچ وکٹوں پر سکور ایک سو اٹھانوے تھا اور وہ بیزار اختر صاحب بیاسی ناٹ آؤٹ تھے۔ ارے! یہ تو سنچری پر تُلا ہوا ہے۔

چار کے بعد گیدی صاحب نے نئی گیند لی، مجھے بُلایا گیا۔ مَیں نے بڑی تیز گیندیں پھینکیں، لیکن ان بیزار صاحب پر کوئی اثر نہ ہوا۔ نئی گیند پر وہ اور بھی محتاط ہو گئے۔ اِدھر وہ قبر رسیدہ امپائر صاحب جو دن بھر کھڑے رہ رہ کر تنگ آ چکے تھے، اپنے پرانے قصے سنا رہے تھے کہ جب مَیں چھوٹا تھا تو یہ کیا کرتا تھا۔ جب مَیں چھوٹا تھا تو یہ بات یوں تھی۔۔۔۔
شیطان بولے۔ اچھا تو کیا آپ سچ مچ کبھی چھوٹے بھی تھے؟ اور وہ ناراض ہو گئے۔ اسی خفگی میں انہوں نے میری اپیل پر نفی میں سر ہلا دیا۔ شام کو سات وکٹوں سکور دو سو چالیس تھا۔ اور بیزار صاحب ننانوے ناٹ آؤٹ تھے۔

ہم زندگی سے تنگ آئے ہوتے تھے۔ ایک بڈی غریب تھا جو سب کو ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن اس کی باتوں پر کوئی ہنستا ہی نہ تھا۔ سب یہی کہتے کہ بھئی یہ تو مَیں نے پہلے سے سُن رکھا ہے۔ حالانکہ بڈی کے لطیفے ہمیشہ نئے ہوا کرتے تھے۔

اور جب ہم بڈی کی موٹر میں واپس جا رہے تھے تو شیطان نے تنبیہ کی۔ "بڈی ذرا آہستہ چلاؤ۔ تم موٹر ہمیشہ اس طرح چلاتے ہو جیسے کسی حادثے کا ریہرسل کر رہے ہو۔"

اگلی صبح اخبار جو پڑھتے ہیں تو اس میں شیطان کی خوب تعریفیں تھیں۔ شیطان کے ایک کیچ کا ذکر نصف کالم میں تھا اور بیزار صاحب کی خوب برائیاں کی ہوئی تھیں۔ مَیں نے پوچھا تو شیطان کہنے لگے "مجھے کیا پتہ؟ اخبار کا رپورٹر وہاں موجود تھا۔ یہ اس کی بے لاگ رائے ہے۔"

جج صاحب ملے، بولے۔ "اور کچھ بھی ہو جاتے، لیکن اس لڑکے کی سنچری نہیں ہونی چاہیے۔ وہ نہایت بری طرح کھیلا ہے۔ اگر وہ ایک اور رن بنا گیا تو مجھے سخت افسوس ہوگا۔"

کھیل شروع ہوا۔ بیزار صاحب ہر ایک گیند روک رہے تھے۔ ہجوم خاموش تھا۔ سب ان کی سنچری کے منتظر تھے۔

شیطان کو ہر اوور کے بعد باؤنڈری لائن سے پورا میدان عبور کر کے دوسری طرف باؤنڈری لائن پر جانا پڑتا تھا۔ ایک اوور میں انہیں دیر سے خیال آیا کہ اس وقت دوسری طرف ہونا چاہیے تھا اور وہ غلط جگہ کھڑے ہیں۔ وہ سرپٹ بھاگے۔ بھاگتے بھاگتے انہوں نے ایک گیند دیکھی جو ان کے قریب سے گزرنے والی تھی۔ انہوں نے رک کر یونہی پکڑ لی۔ کیچ ہو گیا! شیطان نے پھر ایک حیرت انگیز کیچ کیا تھا۔ سب نے یہی سمجھا کہ شیطان جان بوجھ کر محض اس کیچ کے لیے اتنی دور سے بھاگے تھے۔ دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔

سکور وہی تھا، لیکن بیزار صاحب ننانوے ناٹ آؤٹ تھے اور ہم سب کے سینوں پہ مونگ دل رہے تھے۔

یکایک ہجوم میں سے کسی نے چلّا کر کہا کہ اس سے بولنگ کراؤ جس نے ابھی کیچ کیا ہے۔

گیدی صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی، شیطان کو بلا کر گیند ہاتھ میں دے دی شیطان نے آج تک کبھی میچ میں بولنگ نہیں کی تھی۔

گیدی صاحب نے پوچھا "تم تیز گیند پھینکتے ہو یا آہستہ؟"

شیطان بولے۔ "مجھے کیا پتہ؟ ابھی پھینک کر دیکھوں گا۔"

انہوں نے کئی مرتبہ قدم گنے اور مختلف جگہوں پہ نشان لگاتے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ شیطان اور کرکٹ دونوں کے لیے معجزہ تھا اور بقول شیطان کرکٹ کی تاریخ میں سنہرے الفاظ سے لکھے جانے کے قابل تھا۔ شیطان نے رومال سے گیند صاف کی اِدھر

اُدھر دیکھا اور عجب بے ڈھنگے طریق سے بھاگنا شروع کیا۔ وکٹوں کے پاس آ کر ان کے قدم غلط ہو گئے اور ایک نہایت ہی بیہودہ گیند انہوں نے پھینکی۔ بیزار صاحب نے آگے بڑھ کر بڑی حقارت سے بلّا گھمایا اور ایک غدر مچ گیا۔ لوگ چلّانے لگے۔ لوگ چنگھاڑنے لگے۔ لوگ پاگل ہو گئے۔ میدان تالیوں سے گونج اٹھا۔ بیزار صاحب کی سنچری پہ نہیں بلکہ ان کے آؤٹ ہونے پر۔ شیطان کی اس بیہودہ سی گیند نے اس بیہودگی سے وکٹیں اڑائیں کہ وہ ننانوے پر آؤٹ ہو گئے۔

اس کے بعد تھوڑی دیر میں ہم نے باقی کھلاڑیوں کو فارغ کر دیا۔ ساری ٹیم دو سو چالیس پر آؤٹ۔ شیطان کی خوب تعریفیں ہوئیں۔ شاباش دینے کے بہانے انہیں پیٹ کر رکھ دیا گیا۔

اب ہماری اننگز شروع ہوئی۔ مَیں اور عینک رضیہ کے قریب جا بیٹھے اور وہ دزدیدہ نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ مخالف ٹیم فیلڈ کرنے چلی اور شیطان کیمرہ لے کر لپکے۔ ان کی تصویریں اتاریں۔ پھر گیدی اور مقصود گھوڑا بلّے لے کر شامیانے سے نکلے شیطان نے باقاعدہ پوز کرا کر ان کی کئی تصویریں اتاریں۔ لیکن ہم دیر تک شامیانے میں نہ بیٹھ سکے۔ ہمارے کھلاڑی یکے بعد دیگرے آؤٹ ہوتے چلے گئے۔ مخالف بولرز نہایت خطرناک ثابت ہوتے یا ہمارے بیٹسمین شامیانے کی طرف دیکھتے رہے۔ جو کوئی کھیلنے جاتا وکٹوں کو ہاتھ لگا کر واپس آ جاتا۔ جب ساتویں وکٹ پر بڈی گیا تو سکور فقط چھتیس تھا۔ بڈی کے منہ میں چیونگ گم تھا اور ہاتھوں میں بلّا، جیسے اس نے بیس بال کے سٹائل پر پکڑ رکھا تھا۔ جاتے ہی اس نے ترچھے بلّے سے ایک چوکا لگا دیا۔ اگلی گیند پر پھر چوکا، پھر چھکا، پھر چوکا۔ غرضیکہ بولرز کے چھکے چھڑا دیے۔ تیز اور آہستہ، ہر قسم کی بولنگ کو وہ ایک ہی لاٹھی سے

ہانک رہا تھا۔ اُدھر بولر چلتا، اِدھر بڈی چلتا۔ جہاں گیند زمین پر پڑتی وہیں ہٹ لگتی۔ لیکن بڈی بھی زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ اس کے آؤٹ ہوتے ہی بقیہ کھلاڑی بھی نکل گئے۔ ساری ٹیم ننانوے پر آؤٹ۔ اسی ننانوے پر جو بیزار اختر اکیلے کا سکور تھا۔

جج صاحب نے فیصلہ صادر فرما دیا کہ ہم ضرور ہاریں گے۔

لنچ پر گیدی صاحب بے حد بیزار تھے۔ مَیں اور عینک باہر گھاس پر بیٹھے چلغوزے کھا رہے تھے۔ وہ اپنی کسی سہیلی کا ذکر کر رہی تھی، اتنے میں شیطان آ گئے۔

آتے ہی پوچھا "کیا آپ اسی لڑکی کا ذکر تو نہیں کر رہی ہیں جو لباس بہت اچھا پہنتی ہے؟

"ہاں۔"

"اور جسے لباس جچتا بھی ہے۔"

"ہاں۔"

"اور جو گاتی بھی خوب ہے۔"

"ہاں۔"

"اور جو بلا کی حسین بھی ہے۔"

"ہاں۔ کیا آپ اس سے ملے ہیں؟"

"نہیں، اب تک تو دیکھی تک نہیں۔ لیکن ایسی لڑکی سے کون نہ ملنا چاہے گا؟ کیا آپ کبھی اس سے تعارف کرا دیں گی؟"

"اچھا۔"

شیطان اس لڑکی کو بالکل نہیں جانتے تھے۔ پتہ نہیں کون تھی۔ ہم دونوں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ باتیں شروع ہی ہوئی تھیں کہ دفعتہً ہمیں ایک ایسی ہستی نظر آئی کہ شیطان کے دیوتا کوچ کر گئے۔ یہ مس ریچھ تھیں۔ ان پر شیطان چند ماہ پہلے بُری طرح

عاشق تھے۔ عاشق کیا بالکل دیوانے بنے ہوتے تھے۔ ادھر مس موصوفہ میں کوئی ایسی بات نہیں تھی، جس پر کوئی عاشق ہوتا ہوا اچھا لگے۔ یہ نام ان کو خوب زیب دیتا تھا۔ وہ بے حد طویل و عریض تھیں۔ ان کی والدہ شیطان کو کبھی تو بہت پسند کرتی تھیں اور کبھی بہت ناپسند۔ ویسے وہ بھی اسی سانچے کی بنی ہوئی تھیں، بس ذرا پرانا ماڈل تھیں۔ وہ میک اپ خوب کرتی تھیں اور بعض اوقات تو وہ اپنی بیٹی سے قدرے حسین معلوم ہوتیں۔

شیطان کا خوب مذاق اُڑتا۔ "ریچھوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں، سو نعمتیں کھا کھا کے پلا ریچھ کا بچہ"۔ "تو ہی ناداں چند ریچھوں پر قناعت کر گیا"۔ "مانا کہ ترے ریچھ کے قابل نہیں ہوں مَیں ۔۔ تو اپنا ریچھ دیکھ میرا انتظار دیکھ"۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن شیطان باز نہ آتے اور اس وقت تک عاشق رہے جب تک ان کا موڈ عاشقانہ رہا۔ پھر خود بخود راہِ راست پر آ گئے۔ مس ریچھ سے تعارف نہایت پُرلطف رہا۔

ہوا یوں کہ مَیں اور شیطان چھٹیوں سے واپس آ رہے تھے۔ ایک جنکشن پر گاڑی بدلی، دوسری ٹرین چلنے والی تھی۔ ہم بھاگا دوڑی میں سامان رکھوا رہے تھے کہ ہجوم میں ایک سفید ریش ضعیف شخص دکھائی دیا جو ایک بچے کی انگلی پکڑے جا رہا تھا۔ شیطان کو ایسے موقعوں پر فوراً ترس آ جاتا ہے۔ اپنی جیبیں ٹٹول کر بولے "میرے پاس فقط نوٹ ہیں تمہارے پاس کچھ ٹوٹا ہوا ہو تو اس بے چارے فقیر کو دے دو"۔ جلدی تھی، گھبراہٹ میں کچھ ملتا ہی نہ تھا۔ بڑی مشکل سے دو آنے ملے۔ جلدی سے اس فقیر کو دیے اور قلیوں کے پیچھے بھاگے۔ ڈبے میں کافی جگہ تھی۔ گاڑی چلنے سے ذرا دیر پہلے کسی کا بہت سا سامان آ گیا۔ اس کے بعد ایک سالم کنبہ۔ اور بعد میں وہی فقیر اس بچے کے ساتھ آیا اور بیٹھ گیا۔ سارا کنبہ اسے ابا جان ابا جان کہہ رہا تھا۔ لاحول ولاقوۃ! ہم بڑے شرمندہ ہوئے۔ وہ بزرگ جو اس وقت ہمیں فقیر معلوم ہوئے تھے، نہایت معزز قسم کے مالدار حضرت نکلے۔ کچھ تو ان کا لباس ضرورت سے زیادہ سادہ تھا، کچھ ہم ضرورت سے زیادہ گھبرائے ہوئے تھے،

اور کچھ شیطان کو ضرورت سے زیادہ ترس آگیا۔ انہوں نے ہمارے دو آنے واپس کیے، اور بڑے مزے کی باتیں ہوئیں۔ اسی کنبے میں مس ریچھ بھی تھیں۔ پس شیطان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً عاشق ہو گئے۔ واپسی پر بڈی کو بتایا گیا۔ وہ بولا "شاید یہ پانچویں لڑکی ہے جس پر تم اس سال عاشق ہوئے ہو۔"

شیطان نے فوراً تصحیح کی "نہیں چوتھی ہے۔ ایک لڑکی پر میں دو مرتبہ عاشق ہوا تھا۔"

وہ تو شیطان کی خوش قسمتی سے مس ریچھ نے ہمیں دیکھا نہیں ورنہ سیدھی ہماری طرف آتیں۔

ہم فیلڈ کرنے جا رہے تھے تو ننھی آئی۔ کہنے لگی "آپ اس طرح گیند کیوں نہیں پھینکتے؟"

پوچھا "کس طرح؟"

بولی "اسی طرح جیسے اُس روز پھینکی تھیں۔"

پوچھا "کس روز؟"

بولی "میں بھول گئی۔ ٹھہریے ابھی پوچھ کر بتاتی ہوں۔"

اور سیدھی رضیہ کے پاس گئی۔ اچھا تو یہ سلطانہ رضیہ صاحبہ ہمیں ہدایات دے رہی تھیں۔ ننھی نے مجھے ایک کاغذ کا پرزہ لا کر دیا۔ میں نے سر ہلا کر کہا "اچھا۔"

گیدی صاحب غلطی پر غلطی کر رہے تھے۔ انہوں نے شیطان سے خواہ مخواہ بولنگ کرائی۔ شیطان کی خوب پٹائی ہوئی۔ پھر گیدی صاحب کو جو جوش آیا تو انہوں نے خود بولنگ شروع کی اور وہ معمولی گیندیں پھینکیں جن کے متعلق ان کا ذاتی خیال یہ تھا کہ GOOGLY ہیں لیکن تھیں وہ بالکل سیدھی گیندیں۔ سکور خوب بڑھتا جا رہا تھا۔ شیطان بار بار مجھ سے شرط لگاتے "دس روپے کی شرط رہی۔ چنو میاں پچاس سے اوپر سکور کریں گے۔"

میں انکار کرتا تو وہ فوراً کہتے۔ "اچھا تو پھر لگاتے ہو دس روپے کہ چنو میاں پچاس سے نیچے سکور کریں گے۔" میں برابر انکار کرتا رہا۔ تب میں بالکل کنگال تھا۔

چائے پر ان کے چار کھلاڑی آؤٹ ہوتے تھے اور سکور ڈیڑھ سو تھا۔ ننھی نے پھر ایک کاغذ کا پرزہ لا کر دیا اور پھر میں نے سر ہلا کر کہا۔ "اچھا۔"

وہ پھر آئی۔ بولی "آپا کہہ رہی ہیں کہ آپ نے ہمارا کہنا نہیں مانا۔"

میں نے کہا "ابھی مانتا ہوں۔"

میں نے گیدی صاحب کو بڑی مشکل سے منایا۔ نئے سرے سے LEG پر چھ کھلاڑیوں کی فیلڈ جمائی۔ دن بھر کے کھیل سے وکٹ کافی خراب ہو چکی تھی۔ پہلی گیند ایسی تیز بریک ہوئی کہ میں حیران رہ گیا۔ خود بخود اس طرح کے بریک ہو رہے تھے۔ گیدی صاحب نے چونک کر پوچھا "یہ اتنے تیز بریک تم نے کب سے شروع کیے۔"

میں نے کہا "آج سے۔ بلکہ ابھی سے۔"

ایک ہٹ کو بڈی صاحب نے یوں دبوچ لیا جیسے کوئی اُڑتے ہوئے بٹیر کو دبوچ لے۔ یہ بیزار صاحب آؤٹ ہوتے تھے۔ جب بیزار صاحب شامیانے کی طرف جا رہے تھے تو اُن کے آؤٹ ہونے پر سب خوش تھے۔ سوائے بیزار صاحب کے۔

اگلی گیند کو کھلاڑی نے گلانس کیا اور بڈی نے زمین پر لیٹ کر گیند پکڑ لی۔ اب تو شور مچ گیا۔ دو گیندوں پر دو کھلاڑی آؤٹ۔ آوازیں آ رہی تھیں کہ ہیٹ ٹرک کرو۔ لوگ طرح طرح کے مشورے دے رہے تھے۔ ہیٹ ٹرک کا خیال ہی ایسا ہے کہ ماتھے پر پسینہ آ جاتا ہے۔ میں نے سوچا وچا کچھ نہیں، دُور سے بھاگا بھاگا آیا اور LEG STUMP پر گیند پھینک دی۔ بالکل معمولی سی گیند تھی، چنانچہ کھلاڑی نے گھوم کر ہٹ لگائی۔ گیدی صاحب نے اُچھل کر ہوا میں کیچ کرنے کی کوشش کی۔ ان کا ہاتھ پہنچا بھی، گیند ہاتھ سے چھوٹی بھی، لیکن کچھ نہ بنا، فقط گیند کا رُخ بدل گیا۔ وکٹ کیپر نے بایاں ہاتھ ہوا میں لہرایا۔

لیکن کیچ پھر بھی نہ ہوا۔ مگر اس کے GLOVE سے ٹکرا کر گیند پھر اُچھلی اور رُخ بدل گیا۔ اتنے میں بڈّی بجلی کی طرح تڑپا اور گرتی گیند آناً فاناً میں دبوچ لی۔ ہیٹ ٹرک ہو گیا۔

سچ مچ کا ہیٹ ٹرِک!

گیدی صاحب نے اپنا چھوٹا سا ہیٹ میرے سر پر رکھ دیا۔ مَیں نے وہی ہیٹ بڈّی کے سر پر رکھ دیا۔ میرے اگلے اوور میں بڈّی نے LEG کی طرف ایک اور بہت اچھّا کیچ کیا۔ ایک کیچ مقصود گھوڑے نے کافی دُور لانگ لیگ پر کیا۔ ایک سو اٹھاون پر ساری ٹیم آؤٹ۔ چھ وکٹیں میری تھیں! محض LEG پر بولنگ کی بدولت ــــ اور یہ مشورہ رضیہ کا تھا! ہماری ٹیم اب چُست ہو گئی تھی۔ سب کے چہروں پر اُمید جھلک رہی تھی۔

عینک نے دوڑ کر میرا استقبال کیا۔ شیطان دوڑے دوڑے آئے اور میرے کان میں سرگوشی کی ــ "اگر تم مجھے کسی طرح ریچھ سے محفوظ رکھ سکو تو کل کے اخبار میں تمہاری تعریفیں ہی تعریفیں ہوں گی۔"

پوچھا۔ "کیونکر؟"

بولے "رپورٹر میرا دوست ہے اور سب کچھ میرے کمرے میں بیٹھ کر لکھتا ہے۔"

مَیں انہیں سیدھا حکومت آپا کے پاس چھوڑ آیا جہاں ریچھ تو کیا جن بھُوت بھی نہیں پھٹک سکتے تھے۔ ننھی نے مجھے ایک چاکلیٹ دیا۔ پوچھا "کس نے دیا ہے؟"

بولی "آپا نے۔"

پوچھا "کون سی آپا نے؟"

بولی "نہیں بتاتے۔"

مَیں نے سر ہلا کر کہا "ہم نہیں لیتے۔"

بولی "اُن آپا نے۔"

مَیں نے ایک پرزے پر شکریہ لکھ کر اسے دیا اور کہا "یہ رضّو کو دینا۔"

بولی "آپ ہماری آپا کا ادب نہیں کرتے، صرف رضّو کہتے ہیں۔"

مَیں نے کہا "آپا واپا ہوں گی تمہاری، ہمارے لیے تو وہ صرف رضّو ہیں۔"

"مَیں ابھی جا کر بتاتی ہوں۔" اُس نے دھمکی دی۔

اب ہمیں جیتنے کے لیے پوری تین سو رنز درکار تھیں۔ برابر ہونے کے لیے دو سو ننانوے اور ہارنے کے لیے دو سو اٹھانوے یا اس سے کم۔ شام ہو چکی تھی اور فقط تیس پینتیس منٹ باقی تھے۔ روشنی کم ہوتی جا رہی تھی۔ گیدی صاحب اور ان کے لمبے لمبے مشیروں نے کچھ کانفرنس سی کی اور یہ فیصلہ سنایا۔ "اگر شروع کے اچھے کھلاڑی اس وقت گئے تو کہیں آؤٹ نہ ہو جائیں۔ بہتر یہی ہو گا کہ اناڑیوں میں سے دو کو بھیج دیا جائے۔ اگر وہ آؤٹ بھی ہو گئے تو کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ ممکن ہے کہ وہ وقت پُورا کر دیں۔"

بڈّی کو اور مجھے چُنا گیا۔ ہمیں بے شمار ہدایتیں دی گئیں۔ ہم دونوں میں سے آج تک کوئی اننگز کے شروع میں نہیں گیا تھا۔ بڈّی کی خاص طور پر منتیں کی گئیں کہ بس گیند روک لینا، ہٹ وغیرہ ابھی مت لگانا۔

جب ہم دونوں بلّے لے کر میدان میں گئے تو چاروں طرف تالیاں بج رہی تھیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کوئی بہت مشہور کھلاڑی ہوں اور ابھی کچھ کا کچھ کر کے رکھ دوں گا۔

کھیل شروع ہوا۔ چمکتی ہوئی نئی گیند بجلی کی طرح آتی اور جھلک دکھا کر نہ جانے کہاں غائب ہو جاتی۔ مَیں دیکھتا رہ جاتا۔ ادھر بڈّی بھی حیران کھڑا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، وہ بھی گیند نہ چھُو سکا۔ تیسرے اوور میں گیند اور بلّے کی ملاقات ہوئی۔ گیند بولر کے ہاتھ سے نکلی، OFF پر تھی، ارادہ کیا کہ کٹ کروں۔ ابھی پاؤں اٹھایا ہی تھا کہ گیند کا رُخ بدل

گیا، سوچا کہ ڈرائیو کروں۔ رُخ پھر بدل گیا۔ مَیں ٹُھک کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ پھر ایک دم روکنے میں مصلحت سمجھی اور گلانس خواہ مخواہ ہوگیا۔ گیند نہایت تیز تھی اس لیے باؤنڈری ہوگئی۔ اب کچھ ہمت بندھی۔ جہاں گیند زمین سے چھُوتی اُچھل کر وہیں اسے روک لیتا۔ مَیں بالکل کرکٹ کی کتاب کی نقل کر رہا تھا۔ سیدھے بلّے سے جب گیند کو آئینہ دکھاتا تو نعرے لگتے۔ "سٹائیلش" "بہت اچھے۔"

بڈی کو گیند روکنا مصیبت ہوگئی۔ ہر گیند پر وہ ہٹ لگانے کے لیے بلّا اٹھاتا، لیکن پھر کچھ سوچ کر صرف روکنے پر اکتفا کرتا۔ مگر ایسے عجیب طریقے سے روکتا جیسے بلّے سے گیند کو زمین میں ٹھوک رہا ہو۔ اس نے تھوڑی ہی دیر میں نئی گیند کی چمک دمک سب اتار کے رکھ دی۔

خدا خدا کرکے وقت ختم ہوا۔ جب ہم تالیوں کے شور میں واپس لَوٹے تو مَیں گیارہ ناٹ آؤٹ تھا اور بڈی پندرہ ناٹ آؤٹ۔

رات کو مَیں نے شیطان سے تصویروں کے متعلق پوچھا کہ "فلم کب دُھلواؤ گے؟"

بولے۔ "کون سی فلم؟"

کہا۔ "آج جو تصویریں اتاری ہیں، وہ فلم۔"

بولے۔ "کیمرہ تو خالی تھا۔ آج کل فلمیں ملتی کہاں ہیں؟"

پوچھا۔ "تو پھر تصویریں اُتارنے میں کیا مسخرا پن تھا؟"

بولے۔ "ویسے ہی ذرا لطف رہتا ہے۔ ہاتھ میں کیمرہ ہو تو انسان ذرا سمارٹ معلوم ہوتا ہے۔"

اگلے روز اخبارات میں میری خوب تعریفیں تھیں۔ لطف یہ ہے کہ بولنگ کا اتنا ذکر نہیں تھا جتنا کہ بیٹنگ کا۔ یہ سب شیطان کی کرامات تھی۔

اگلی صبح جج صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ "بس گیندیں روکتے رہنا۔ باہر جاتی ہوئی گیند کو ہرگز مت چھوؤ اور زبردستی ہٹ کبھی مت لگاؤ۔ سکور خود بخود ہوتا رہے گا۔"

کھیل شروع ہوا۔ ہم گیندیں روک رہے تھے۔ جو گیند سیدھی آتی اسے روک لیتے جو باہر جاتی اسے چھوڑ دیتے۔ تھوڑی دیر میں ہمیں پتہ چلا کہ رنز خود بخود ہو رہی ہیں۔ ہم دونوں نے سکور سو تک پہنچا دیا۔ بڈی آہستہ آہستہ اپنی اصلیت پر آ رہا تھا۔ پھر شپ سے کسی نے اس کا کیچ کر لیا اور بیالیس رنز کرکے وہ آؤٹ ہوگیا۔ گیدی صاحب آئے۔ لیکن بہت ڈرے ہوتے تھے۔ ایک معمولی سی گیند پر وہ آؤٹ ہوگئے۔ آؤٹ ہوتے ہی انہوں نے نعرہ لگایا کہ "بہت اچھی گیند تھی ـــ گُگلی تھی!" اور بولر کی تعریفیں کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ مقصود گھوڑا آیا۔ اُس نے ذرا کھیل جما دیا۔ مجھے اب گیند فٹ بال جتنی دکھائی دے رہی تھی۔

ہم لنچ کے لیے گئے تو سُورج بھی لنچ کے لیے چلا گیا اور بادلوں میں جا چھُپا۔ لنچ کے بعد ایک ہی اوور میں ہمارے دو کھلاڑی نکل گئے۔ دو سو پر نئی گیند آئی اور مجھے ایک مرتبہ پھر قیامت کا سامنا کرنا پڑا۔

مَیں آہستہ آہستہ تھکتا جا رہا تھا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ بیٹنگ بہت مشکل چیز ہے۔ آج تک کبھی اتنی دیر وکٹوں پر ٹھہرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میری ٹانگیں شَل ہو چکی تھیں۔ کمر بُری طرح دُکھ رہی تھی۔ میرا سکور ستّر ناٹ آؤٹ تھا۔ مَیں نے آج تک کبھی اتنا سکور نہیں کیا تھا۔ سب کہہ رہے تھے کہ سنچری کرو لیکن میرا بھاگنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ چار پر ہمارا سکور ڈھائی سو تھا۔ شیطان اور عینک کی سہیلی باتیں کر رہے تھے۔ وہ بولی "مجھے لیفٹ ہینڈر زیادہ پسند ہیں، کیونکہ وہ کھیلتے ہوئے بہت اچھے لگتے ہیں۔"

اس پر شیطان نے سرگوشی کی۔ "میں آج بائیں ہاتھ سے کھیلوں گا۔ اگرچہ میں نے بولنگ دہنے ہاتھ سے کی ہے۔ اور پھر یہ کرکٹ تو ہے بھی میرے بائیں ہاتھ کا کھیل۔"

پھر مجھے ایک طرف لے جا کر کہنے لگے "اس لڑکی نے مجھ میں ایک نئی رُوح پھونک دی ہے۔ تم دیکھنا کہ آج میں کیسا کھیلتا ہوں۔ اور ہاں آج رضیہ دن بھر اُداس رہی ہے۔ رُوٹھنا رُوٹھنا سب ختم ہو چکا ہے۔ جب بلائے بے ٹنک چلے جانا اور ع مہرباں ہو کے بُلا لو مجھے چاہو جس وقت"۔ والا برتاؤ کرنا۔"

چائے کے بعد پہلی گیند پر ایک وکٹ نکل گئی۔ اب ایک ایک گیند پر تالی بجتی تھی۔ سکور کرو یا نہ کرو۔ ہٹ لگاؤ یا نہ لگاؤ، چاہے گیند روکتے رہو یا صاف چھوڑ دو، شور ضرور مچتا تھا۔

یک لخت ہجوم خاموش ہو گیا۔ چاروں طرف مایوسی چھا گئی۔ اب آخری کھلاڑی آ رہا تھا۔ شیطان اپنی عینک سنبھالتے، بَلا گھماتے۔ ایک عجب شان سے تشریف لا رہے تھے۔ آتے ہی انہوں نے لیفٹ ہینڈر کا سٹائل بنایا۔ مَیں نے بڑی منتیں کیں کہ آج داہنے ہاتھ ہی سے کھیلو، یہ بائیں ہاتھ کا شوق کبھی پھر پُورا کر لینا۔

بولے "ہرگز نہیں۔ تم دیکھنا تو سہی اگر زندگی نے وفا کی تو سکور پورا کر کے دکھاؤں گا۔ جب میں جیتنے کی ہٹ لگاؤں گا تو عینک کی سہیلی کا چہرہ فخر سے اُونچا ہو جائے گا۔"

شیطان کے محبوب سٹروک دو ہیں۔ لیگ بائی اور آف بائی۔ کبھی گیند پیڈوں سے بچ کر بلّے میں بھی لگ جاتی ہے اور جب بلّے سے نکل جاتے تو لازمی طور پر وکٹوں میں جاتی ہے۔ آؤٹ ہونے کے بعد شیطان ہمیشہ بلّے کو اس انداز سے دیکھتے ہیں جیسے اس میں کہیں سوراخ تھا جس میں سے گیند نکل گئی۔

پہلی گیند شیطان کی ٹھوڑی کے نیچے سے نکل گئی۔ دوسری گھٹنوں میں سے تیسری ناک کو چھُوتی ہوئی گئی۔ چوتھی کمر میں لگی۔ لیکن شیطان لیفٹ ہینڈر کا سٹائل بناتے کھڑے رہے۔

پہلے اوور کے بعد شیطان مجھ سے ملنے آئے۔ ہجوم نے سمجھا کہ کھیل کے سلسلے میں

مشورہ لینے آئے ہوں گے، خوب تالیاں بجیں۔ شیطان نے کان میں کہا "وہ دیکھو شامیانے کے اس کونے میں عینک کی سہیلی بیٹھی ہے۔"

مَیں نے بتایا کہ یہ تو کوئی اور ہے اور ساتھ ہی انہیں عینک کے شیشے صاف کرنے کو کہا۔ انہوں نے شیشے صاف کیے اور بولے "تو وہ ہجوم میں کہیں ہو گی۔ کاش کہ اس وقت ایک دوربین ہوتی۔ اور یہ پوائنٹ پر جو کھلاڑی کھڑا ہے اس کی لٹکی ہوئی مونچھیں مجھے آؤٹ کرائیں گی۔"

اگلے اوور کے بعد پھر مجھے ملے، بولے "جانتے ہو یہ وکٹ کیپر عینک کی سہیلی کا کوئی عزیز ہے۔ بیچارے نے آج ایک بھی کیچ نہیں کیا۔ جی چاہتا ہے اسے ایک کیچ کرا دوں۔"

مَیں نے پھر ان کی منتیں کیں اور وہ بمشکل باز آئے۔

شیطان اتنی بُری طرح کھیل رہے تھے کہ لوگوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ شیطان اس وقت کرکٹ نہیں کھیل رہے تھے بلکہ گتکا، کبڈی، ہائی جمپ اور بہت سی چیزیں ملا کر تماشے کر رہے تھے۔

مخالف بولر بولا "یہ بیٹنگ کیسی ہو رہی ہے؟"

"اور یہ بولنگ کیسی ہو رہی ہے؟" شیطان نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اُچھل کر ایک آف بائی سکور کی۔ اب وہ وکٹوں کے چاروں طرف کھیل رہے تھے اور بائی پر بائی سکور ہو رہی تھی۔ سکور دو سو اسّی ہو گیا۔ مَیں بچانوے ناٹ آؤٹ تھا اور شیطان نے دس بائی سکور کی تھیں۔ مَیں اس قدر تھک چکا تھا کہ مجھے نہ کسی سکور کا چاؤ تھا، نہ کسی میچ کا۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ پیڈ وغیرہ اُتار کر یہیں گھاس پر لیٹ جاؤں۔

ایک گیند پر بائی لگا کر شیطان نے مجھے بلایا۔ میں چلا۔ اتنے میں گیند واپس آ گئی۔ وہ چلّائے، واپس جاؤ۔ مَیں بُری طرح بھاگا۔ گیند بہت تیز تھی اس لیے دوسری طرف نکل گئی۔ انہوں نے پھر بلایا، مَیں پھر گیا۔ گیند واپس آ گئی، پھر واپس بھاگا۔ ہم دونوں خوب

بھاگے دوڑے لیکن سکور کچھ نہ ہوا۔ اگلی گیند پر شیطان نے پھر یہی حرکت کی۔ اس دفعہ تو مَیں رَن آؤٹ ہوتا ہوتا بچا۔

شیطان اور وکٹ کیپر خوب مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ شیطان نے اسے کھانے پر مدعو کیا۔ آخری اوور آیا اور مَیں نے دل کڑا کر کے ایک چوکا لگا دیا۔ اب مَیں ننانوے ناٹ آؤٹ تھا۔ اگلی گیند کو گلانس کیا اور شیطان کو بلایا، وہ نہیں آئے۔ چوتھی گیند پر پھر بلایا، وہ پھر وہیں کھڑے رہے۔ وقت ختم ہو گیا۔ سکور دو سو پچاسی تھا اور مَیں وہی ننانوے ناٹ آؤٹ۔

شیطان کہنے لگے۔ "میاں یہ ننانوے کا پھیر بہت بُرا ہوتا ہے۔ یہ ہندسہ ہمارے لیے بہت منحوس ہے۔ کہیں کل تمہارے ساتھ ان کا باؤلر وہی سلوک نہ کرے جو مَیں نے بیزار صاحب کے ساتھ کیا تھا جب وہ ننانوے ناٹ آؤٹ تھے۔"

مَیں نے اُن سے پوچھا۔ "یہ آخری اوور میں کیا حرکت کی تھی؟ میرے بُلانے پر کیوں نہیں آئے؟"

بولے۔ "اس لیے کہ اب اس خاکسار کی دو آرزوئیں ہیں۔ پہلی یہ کہ تمہاری سنچری نہ ہو، ورنہ تم ہم اناڑیوں کے زمرے سے نکل کر اپنے آپ کو بیٹسمین سمجھنے لگو گے۔ دوسری یہ کہ جیتنے کی ہٹ مَیں لگانا چاہتا ہوں۔ مَیں نے عینک کی سہیلی سے وعدہ کیا ہے۔"

رضیہ ملی۔ بولی۔ "ذرا سُنیے۔"

مَیں چلا گیا۔ ہم دونوں باہر گھاس پر بیٹھ گئے۔ اُس نے کہا۔ "اتنے دنوں سے مَیں پڑھائی میں مصروف رہی اور کچھ میرا جی اچھا نہیں تھا۔"

مَیں نے کہا۔ "مَیں بھی اتنے دنوں بہت مصروف رہا۔ کچھ امتحان کی تیاری اور کچھ یہ ٹورنامنٹ کا سلسلہ۔"

مَیں نے لیگ بریک پر بولنگ کا ذکر کیا کہ اسے یہ خیال کیونکر آیا۔ کہنے لگی۔ "مجھے آپ کا ایک پہلا میچ یاد تھا، جس میں آپ نے اسی طرح وکٹیں لی تھیں۔"

مَیں نے پوچھا۔ "کل کیا پروگرام ہے؟"

"کل چھٹی ہے۔"

"کل میرے ساتھ چلو گی؟ ایک جگہ پک نک ہے۔"

"اجازت لینی ہو گی، امّی سے اور حکومت آپا سے۔"

"عینک کی سہیلی کا بہانہ کر دینا ——— آج تم دونوں کافی دیر اکٹھی رہی ہو۔"

"کوشش کروں گی۔"

"کوشش وشش نہیں، وعدہ کرو۔"

شرما شرما کر بولی۔ "اچھا۔"

مَیں شیطان کے ہوسٹل گیا۔ وہاں وہ وکٹ کیپر صاحب موجود تھے۔ کئی مرتبہ ننانوے ناٹ آؤٹ کا ذکر آیا۔ جب میں واپس آ رہا تھا تو مجھے ہر دیوار پر جلی الفاظ میں ننانوے ناٹ آؤٹ لکھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے ہوسٹل پہنچا تو بہت سے لڑکے ملے، سب نے یہی بار بار دہرایا۔ رات کو ٹائم پیس کی ٹک ٹک میں مجھے ننانوے ناٹ آؤٹ، ننانوے ناٹ آؤٹ سنائی دیا۔

رات بھر میرے کانوں میں کوئی چیخ چیخ کر کہتا رہا کہ ننانوے ناٹ آؤٹ ——— ننانوے ناٹ آؤٹ۔

اگلے روز بہت زیادہ ہجوم تھا کیونکہ میچ بے حد دلچسپ ہو گیا تھا۔ مینا بازار سالم کا

سالم وہاں موجود تھا۔ تالیوں اور نعروں کے شور میں جب ہم بلّے لے کر نکلے تو میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔

شیطان کی باری تھی۔ مخالف کپتان نے اپنے ایک فاسٹ بولر کو بُلا لیا۔ اس کی پہلی گیند شیطان اور وکٹ کیپر دونوں کے اُوپر سے گزر گئی۔ بائی کی چار رنز ہو گئیں۔ اگلی گیند پر پھر یہی ہوا۔ چار رنز اور ہو گئیں۔ اُنہوں نے فالتو فیلڈ لے لی بقیہ گیندیں بھی شیطان اور وکٹ کیپر کے اُوپر سے گزریں لیکن مزید سکور نہ ہوا۔

دوسری طرف سے انہوں نے ایک نیا بولر لگایا جس کو مَیں اب تک نہیں کھیلا تھا۔ وہ اوور یونہی گزر گیا۔ اگلے اوور میں شیطان نے قلابازی سی کھائی اور ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا کٹ لگایا۔ سکور دو سو ستانوے ہو گیا اور وہیں اٹک کر رہ گیا۔ چند اوور پھر ویسے ہی خشک گزر گئے۔ ہجوم کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر گیند کے ساتھ وہ شور و غل مچتا تھا کہ خدا کی پناہ۔

ایک گیند پر شیطان نے گٹکے کا ہاتھ دکھایا اور گیند لیگ کی طرف نکل گئی۔ ہم نے دوڑ کر دو رنز بنا لیں۔ سکور دو سو ننانوے ہو گیا۔ یعنی ہم نے سکور برابر کر دیا تھا۔ اب ہمیں جیتنے کے لیے صرف ایک رن کی ضرورت تھی۔ اور مجھے سنچری کرنے کے لیے بھی ایک ہی رن کی ضرورت تھی۔

اوور کی تین گیندیں ابھی باقی تھیں۔ ہر گیند پر شیطان نے بے تحاشا بلّا گھمایا لیکن کچھ نہ ہوا۔ اِدھر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں عمر بھر سنچری نہیں کر سکتا۔ صدیاں گزر جائیں، سنچری نہیں ہو گی اور یہ ننانوے ناٹ آؤٹ ایک تہمت ہے جو مجھ پر لگی ہوئی ہے۔ یہ ایک طوق ہے جو میرے گلے میں لٹک رہا ہے۔ یہ ایک سینگ ہے جو میرے سر میں اُگا ہوا ہے اور مَیں اس کم بخت ننانوے ناٹ آؤٹ سے کبھی پیچھا نہیں چھڑا سکوں گا۔
اب میری باری آئی۔ وہی نیا بولر گیند پھینک رہا تھا، گز گز بھر کی بریک کراتا تھا۔

پہلی گیند روکی، دوسری، تیسری، چوتھی۔ مَیں کسی پر سکور نہ کر سکا۔ اب آخری گیند تھی۔ اُدھر گیند آئی اِدھر مَیں نے آنکھیں بند کر کے بلّا گھمایا۔ خدا جانے گیند بلّے سے لگی، پیڈوں سے لگی، جُوتوں سے لگی، لگی بھی یا نہیں۔ بس گیند نکل گئی۔ ان کے دو کھلاڑی پیچھے بھاگے، اِدھر مَیں بھاگا۔ دوسری طرف پہنچا تو شیطان وہیں کھڑے تھے۔ مَیں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو فیلڈر گیند کے پیچھے بھاگے جا رہے تھے۔ مَیں نے شیطان کو اس طرف آنے کو کہا، وہ وہیں کھڑے رہے۔ مَیں نے ان کو بازو سے پکڑ کر ہلایا لیکن وہ نہیں ہلے۔ آخر مَیں ان کو زبردستی گھسیٹتا ہوا اپنی وکٹ تک لایا اور وہاں پٹخ کر تابڑ توڑ واپس بھاگا۔ بس رَن آؤٹ ہوتے ہوتے بچا۔

اور پھر غدر مچ گیا۔ زلزلہ آ گیا۔ زمین کی جگہ آسمان نے لے لی اور آسمان زمین کی جگہ آ گیا۔

بڈی بھاگا بھاگا آیا اور مجھے کندھے پر اُٹھا کر شامیانے کی طرف دوڑا۔ بار بار وہ یہی کہہ رہا تھا۔ "ہُرّائے او ہُرّائے مَیں چیمپئن ہوں۔ مَیں نے ایک کپ جیتا ہے۔ اب مَیں کرکٹ کا کھلاڑی ہوں"۔

شامیانے میں پہنچ کر پتہ چلا کہ ہم جیت بھی گئے تھے اور ایک رن سکور بھی ہو گئی تھی، لیکن یہ امر بحث طلب تھا کہ اسے مَیں نے سکور کیا تھا یا یہ محض بائی تھی۔ ایک امپائر کچھ کہتا تھا دوسرا کچھ۔ کوئی کہتا تھا کہ میں نے سنچری کی ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ محض ننانوے ناٹ آؤٹ ہوں۔
ادھر شیطان اس وکٹ کیپر اور عینک کی اس سہیلی کے ساتھ ایسے غائب ہوئے جیسے کبھی یہاں تھے ہی نہیں۔

جب مَیں اور رضیہ اکٹھے چل رہے تھے تو اس نے نہایت خوشنما کوٹ پہن رکھا تھا اور گلے میں وہ سادہ سا ہار تھا جو مَیں نے اسے دیا تھا۔ وہ بولی "یہ کوٹ ابّا نے سالگرہ پر دیا تھا، میں آج اسے پہلی مرتبہ پہن رہی ہوں۔"

مَیں نے پوچھا "اب تک کیوں نہیں پہنا؟"

کہنے لگی "میں نے سوچا کہ کسی خاص دن پہنوں گی۔"

مَیں نے اسے سائیکل پر بیٹھنے کو کہا۔ بولی "کیریئر پر تو ٹوکری بندھی ہوئی ہے۔"

مَیں نے کہا "آگے بیٹھ جاؤ۔"

بولی "اور جو کسی نے دیکھ لیا تو؟"

کہا "کسی نے دیکھ لیا تو میری خوش نصیبی پر رشک کرے گا۔"

وہ شرما کر آگے بیٹھ گئی۔ میرا چہرہ اس کے بالوں سے چھو رہا تھا۔

"یہ تم نے حکومت آپا کی خوشبو آج پھر چُرائی ہے؟" مَیں نے پوچھا۔

"آپ نے بھی تو اُن کا تیل لگا رکھا ہے۔" اُس نے بتایا۔

ہم دونوں درست تھے۔

جب ہم دو تین میل آگے نکل آئے تو وہ پوچھنے لگی کہ پک نک کہاں ہو رہا ہے؟

مَیں نے بتایا کہ یہاں سے کچھ دُور ایک پرانے باغ میں۔

اُس نے پوچھا کہ "پک نک میں اور کون کون ہوں گے؟"

میں نے کہا کہ "صرف دو ہوں گے۔ مَیں اور تم۔"

جب ہم دونوں چاندنی میں سائیکل پر واپس آ رہے تھے تو رضیہ نے کہا "یہ میچ تو صرف آپ کا تھا۔ اور وہ ہیٹ ٹرک خوب تھا۔ گیند پھینکتے ہوئے آپ بہت اچھے لگ رہے تھے۔"

"وہ ہیٹ ٹرک تو تمہارا تھا۔"

"اور وہ ننانوے ناٹ آؤٹ؟"

"نہیں۔ سو ناٹ آؤٹ!" میں نے مچل کر کہا۔

"ہم تو ننانوے ناٹ آؤٹ ہی کہیں گے۔ بھلا کرکٹ میں کبھی ساتھیوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر بھی سکور کیا جاتا ہے۔ یہ سب عینک کی اس سہیلی کی برکت ہے۔"

"ذرا مسکراؤ۔"

وہ مسکرانے لگی۔

"اب ذرا منہ بنا کر بھی دکھاؤ۔" اس نے منہ بنا کر دکھایا۔ "تم مسکراتی ہوئی کہیں اچھی معلوم ہوتی ہو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ ہر وقت مسکراتی رہا کرو۔ آج آئینے میں دیکھنا۔"

"آپ آگے دیکھیے ــــ بالکل سیدھ میں اور سائیکل سیدھی چلائیے۔ کہیں ٹکر نہ ہو جائے۔"

رضیہ کو چھوڑ کر مَیں نے شیطان کے ہوسٹل کا رُخ کیا۔ راستے میں وہی رپورٹر مل گیا۔ کہنے لگا "مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ سنچری نہ کر سکے۔ مَیں نے اخبار میں آپ کے ننانوے ناٹ آؤٹ کی بڑی تعریف کی ہے۔"

"آپ سے یہ کس نے کہا؟"

"رُوفی صاحب نے۔"

"ابھی چھپا تو نہیں؟"

"نہیں۔"

مَیں نے اسے ساتھ لیا، راستے میں بڈی کو پکڑا۔ شیطان کے کمرے میں جاکر دیکھتے ہیں تو ایک بڑے سے پلنگ پر کچھ حضرات رضائیاں اوڑھے کھانا کھا رہے ہیں۔ کچھ اور رضائیاں منگائی گئیں اور ہمیں بھی ساتھ بٹھا لیا گیا۔ مَیں بار بار شیطان سے اس آخری رن کے متعلق کہہ رہا تھا۔ میرا اصرار تھا کہ اسے مَیں نے سکور کیا ہے۔

شیطان بولے "یار عجب سپورٹس مَین ہو تم بھی، صرف ایک رن کے لیے اتنے پریشان ہو رہے ہو۔ اچھا، تمہاری سنچری لکھوا دیں گے۔ بس! چلو بھئی لکھ دو ان کی سنچری۔"

رپورٹر نے ہمارے سامنے بیٹھ کر سب کچھ درست کر دیا۔

بڈی کی سفارش پر میری تھوڑی سی تعریف بھی شامل کی گئی۔

اب سیکنڈ شو کا پروگرام بنا۔ شیطان نے وہ اوورکوٹ اتار دیا جس کو پہن کر سردی زیادہ لگتی تھی۔ جو پہلے اُلٹوایا گیا تھا پھر سیدھا کرایا گیا۔ سب نے رضائیاں اوڑھ لیں چند حضرات ایک ایک رضائی میں دو دو ہو گئے۔ نوکر حُقّہ لے کر ساتھ ہو لیا۔

ذرا سی دیر میں ہم رنگ برنگی رضائیاں اوڑھے اتنی ٹھنڈ میں ٹھنڈی مال روڈ پر جا رہے تھے۔ تقسیمِ انعامات کا ذکر ہو رہا تھا۔ بڈی بار بار کہتا تھا "لواتے او لواتے۔ آج مَیں اپنے آپ کو ہیرو محسوس کر رہا ہوں مَیں چیمپئن ہوں، مَیں نے کرکٹ کا ایک کپ جیتا ہے۔ یاہو ووووو!"

اور جب شہر کے بہترین سنیما میں رضائیاں اوڑھے پکچر دیکھ رہے تھے اور حُقّے کے کش لگا رہے تھے تو ہمارے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ نہ ہمیں چیمپئن سمجھ رہے تھے نہ ہیرو۔ بلکہ غالباً ایسی خواتین سمجھ رہے تھے جو حُقّہ پی رہی تھیں۔

بلڈ پریشر

"میرا بلڈ پریشر" شیطان نے پھر شروع کیا۔

"درست ہے۔" مقصود گھوڑے نے پھر ان کی بات کاٹ دی۔ "ہُوا یہ کہ آج صبح جو مَیں اُٹھ کر دیکھتا ہوں تو کائنات میرے لیے سنوری ہوئی تھی۔ سُورج میرے لیے ضرورت سے زیادہ چمک رہا تھا اور اپنی چمکیلی اور سنہری شعاعیں براہ راست میرے واسطے بھیج رہا تھا۔ باغیچے میں لاتعداد پھول محض میرے لیے کِھلے تھے اور پرندے صرف اس اُمید پر سریلے گیت گا رہے تھے کہ مَیں سُنوں گا۔ پھر ناشتے پر مجھے دُنیا کی بہترین چاء ملی جو صرف میرے لیے دارجیلنگ کی خوشنما پہاڑیوں سے چُنی گئی تھی اور دنیا کی تندرست ترین گائے نے اپنے لختِ جگر بچھڑے کو نظر انداز کرتے ہوئے میرے لیے دُودھ کا ایک گلاس بھیجا۔ لاکھوں شہد کی مکھیاں مدتوں فقط میرے لیے محنت مشقت کرتی رہی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کاوشوں کا نتیجہ شہد کی صورت میں میری خدمت میں پیش کیا جسے مَیں نے بڑی فراخ دلی اور خندہ پیشانی سے قبول فرمایا۔"

ہم مقصود گھوڑے کے ہاں رات کے کھانے پر مدعو تھے۔ اس کا گھر ہمارے ہوسٹل سے سات میل دُور تھا۔ وہاں سے رات کے دس بجے آخری بس چلتی تھی۔ ابھی ساڑھے نو بجے تھے اور کھانے کے بعد باتیں ہو رہی تھیں۔ قنوطیت اور رجائیت پر بحث ہو رہی تھی۔

"لیکن اس میں ایسی خاص بات کیا ہے؟ ہر شخص صبح اُٹھ کر سُورج کو دیکھتا ہے اور حسبِ توفیق ناشتہ کرتا ہے۔ تم تو خواہ مخواہ بڑھا چڑھا کر باتیں کر رہے ہو۔ بھلا آج تمہیں کون سی خوش خبری ملی ہے جو اتنے مسرور ہو۔"

"آج تو مجھ سا خوش قسمت تمہیں آس پاس نہیں ملے گا۔ آج مَیں نے تیرہ ہزار مرتبہ سانس لیا ہے۔ آج میرا دل ستاون ہزار مرتبہ دھڑکا ہے۔ آج مَیں طرح طرح کے حادثوں سے محفوظ رہا ہوں۔ آج میں کسی موٹر کے نیچے نہیں آیا۔ آج مجھ پر کوئی درخت نہیں آن گرا۔ آج میں کسی شبہے میں گرفتار نہیں کیا گیا۔ آج کسی نے میری جیب نہیں کتری۔ آج کسی لفنگے نے مجھے محض تفریحاً پیٹا نہیں۔ آج مَیں کسی پر عاشق نہیں ہوا اور آج"

"وہ اور بات ہے" کیدی صاحب بولے "لیکن حساس شخص کبھی بھی مسرور نہیں رہ سکتا۔ مَیں نے ایک جگہ پڑھا تھا کہ رجائیت پسند وہ خوش فکرا ہے جو شیر سے ڈر کر درخت پر چڑھ جاتے اور جب کہ شیر نیچے کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہو، وہ آس پاس کے نظاروں سے خوب لطف اندوز ہوتا رہے۔"

"دیکھیے! مَیں آپ کو مثال دوں۔ اگر ہمارے سامنے پانی کا آدھا گلاس رکھا ہو تو مَیں اس بات پر خوش ہوں گا کہ شکر ہے اس میں پانی تو ہے اور آپ یہ سوچ کر غمگین ہوں گے کہ یہ آدھا خالی کیوں ہے؟" مقصود گھوڑے نے کہا۔

"دراصل ہم پریشان اس لیے ہوتے ہیں کہ آتی ہوئی مصیبت کو جلد از جلد رخصت کرنے کی بجائے اس کا استقبال کرتے ہیں اور اسے بیٹھنے کو کرسی پیش کرتے ہیں اور پھر ہماری توقعات بے شمار ہیں اور ہم بے حد خود غرض ہیں۔ چند سال پہلے میں نے باغیچہ لگا رکھا تھا تو ہر رات کو کچھ اس قسم کی دعا مانگا کرتا کہ اے خدا آج رات بالکل ہوا نہ چلے! اوس اگر پڑے تو صرف گلاب کے تختوں پر پڑے جس کونے میں خشک بیج ہیں اس طرف کچھ نہ ہو۔ کل گیندے کے پھُولوں کو خوب دھوپ لگے، لیکن ذخیرے پر دھوپ قدرے ہلکی ہو۔

اس کے بعد سہ پہر کو معمولی سی بارش ہو، تاکہ پھل دار پودوں کو پانی مل جائے لیکن ذخیرے پر بارش نہ ہو اور ـــــ" بڈی اپنا فلسفہ بیان کر رہا تھا۔

"حضرات میرا بلڈ پریشر" شیطان بولے۔

"درست ہے رونی" مقصود گھوڑے نے پھر بات کاٹی "بات دراصل یہ ہے کہ"

"حضرات سُنیے" شیطان نے داہنا ہاتھ اُٹھا کر زور سے نعرہ لگایا۔ "دراصل بات یہ ہے کہ یہ کوئی نہیں جانتا کہ کب ایک اچھا بھلا مسخرہ قنوطی بن جائے گا اور کب ایک روتا پیٹتا قنوطی چھلانگیں مارنے لگے گا۔ اس لیے یہ بحث ہی فضول ہے۔ اسی قسم کا ایک قصہ مَیں سنانا چاہتا ہوں جس کا تعلق نہ صرف اس موضوع سے ہے بلکہ میرے بلڈ پریشر سے بھی ہے۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ تقریباً سال بھر سے مَیں قنوطی رہا ہوں۔ بالکل گیا گزرا قنوطی! اور میرا بلڈ پریشر دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ مَیں صبح سے شام تک فکر کرتا رہتا اور شام سے صبح تک ـــــ اگر کوئی فکر کرنے والی بات ہوتی تب بھی فکر کرتا، اور جب ایسی کوئی بات نہیں ہوتی تب اور بھی فکر کرتا کہ ایسی بات کیوں نہیں ہے۔ پچھلے اتوار کو ڈاکٹر صاحب نے میرا بلڈ پریشر لیا تھا اور وہ بہت گھبرائے تھے کیونکہ بلڈ پریشر کا گراف اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ بیس بائیس سال کی عمر میں بلڈ پریشر کا بڑھنا نہایت خطرناک ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا فکر تھا جس نے میری زندگی تلخ کر رکھی تھی۔ نہ مجھے دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی تھی اور نہ جینے کی کوئی تمنا تھی۔ میرا یہی خیال تھا کہ یہ بیزاری بڑھتی جائے گی اور میرا بلڈ پریشر بھی بڑھتا جائے گا لیکن دفعتاً سب کچھ بدل گیا۔ حالات بدل گئے۔ دنیا بدل گئی۔ کل صبح سے میری زندگی میں حیرت انگیز تبدیلیاں آ گئیں۔ مجھے اتنی اُمیدیں اور مسرتیں مل گئیں کہ اب یہی جی چاہتا ہے کہ ناچنے لگوں۔"

"بھئی خیال رکھنا، کہیں نبض نہ نکل جائے۔" مَیں نے آہستہ سے کہا۔

"ابھی دیر ہے۔ مَیں صرف چند منٹ لوں گا۔" شیطان بولے "ہاں تو ہوا یوں کہ کل

صبح یونہی مسکراہٹ کی لہر میرے چہرے پر دوڑ گئی۔ مَیں کپڑے پہننے میں ہمیشہ لاپروائی سے کام لیا کرتا تھا۔ پتلون کسی سوٹ کی ہوتی تو کوٹ کسی سوٹ کا، اور ٹائی کسی رنگ کی ہوتی۔ لیکن کل صبح مَیں نے نہایت اچھا لباس پہنا، تمام کپڑے ایک دوسرے کے مطابق تھے۔ کالج جاتے وقت مَیں نے ایک عجیب بات محسوس کی۔ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے مَیں اس سڑک کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ مَیں نے کئی نئی عمارتیں بھی دیکھیں۔ بہت سی نئی دکانیں اور نئے اشتہار نظر آتے۔ کئی نئے چہرے دکھائی دیے۔ شاید تمہیں یاد ہو گا کہ مَیں نے ہمیشہ سائنس کی برائی کی ہے اور کئی مرتبہ یہ بھی کہا ہے کہ شاید مَیں سائنس پڑھنا چھوڑ دوں گا، کیونکہ یہ مضمون مجھے بے حد خشک اور مشکل معلوم ہوتا تھا۔ لیکن کل مجھے محسوس ہُوا کہ لیکچر روم میں جو بڑے بڑے چارٹ آویزاں ہیں، وہ بالکل آسان ہیں۔ پروفیسر صاحب نے جو کچھ بورڈ پر لکھا وہ نہ صرف آسان ہی تھا بلکہ دلچسپ بھی تھا۔ پھر مَیں نے اپنی ہم جماعت مس ہُدہُد کو غور سے دیکھا۔ سال بھر کے بعد مجھے دفعتہً معلوم ہوا کہ اس کی شکل بالکل معمولی ہے، بلکہ بالکل ہی معمولی ہے اور صبیحہ کے مقابلے میں تو وہ کچھ بھی نہیں۔ میرے خیال میں مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ جانے اس کا خیال کیوں مجھ پر اتنے دنوں سوار رہا تھا۔

مَیں نے دل کھول کر اپنے اوپر لعنت بھیجی۔ آئندہ اگر کبھی مجھے اس سے باتیں کرتے دیکھ پاؤ تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔ خیر، اس کے بعد پریکٹیکل شروع ہوا۔ جو آلے اور اوزار مجھے زہر دکھائی دیتے تھے، وہ کچھ اتنے بُرے معلوم نہیں ہو رہے تھے۔ پہلے تو مَیں پریکٹیکل خود کرتا ہی نہیں تھا۔ کل مَیں نے اسے اپنے ہاتھوں سے کیا اور مجھے سائنس اس قدر دلچسپ معلوم ہوئی کہ اب میرا ارادہ ہے کہ ایم ایس سی کر کے ریسرچ کروں۔ دوپہر کو کالج سے واپس آتے وقت دُور مَیں نے ایک تانگہ دیکھا جس میں صبیحہ بیٹھی تھی۔"

"صبیحہ بیٹھی تھی؟ سچ مچ؟؟" کئی حضرات نے چونک کر پوچھا۔

"بھئی ذرا خیال رکھنا، کہیں بس نہ نکل جاتے۔" مَیں نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں سچ مچ صبیحہ تھی۔ اس سڑک سے وہ ہر روز تانگے میں گزرتی تھی لیکن مَیں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ نہ جانے وہ کون سی طاقت تھی جس نے کل مجھے اس کی جانب متوجہ کر دیا۔ ذرا سی دیر میں مَیں سائیکل پر اس کے تانگے کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ مَیں نے سلام کیا جس کا جواب ملا۔ کل مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ صبیحہ نہایت ہی پیاری لڑکی ہے اور اس سے بہتر آنکھیں کسی کی نہیں ہو سکتیں۔ دفعتہً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مَیں صبیحہ پر دوبارہ عاشق ہو رہا ہوں۔ ہوسٹل پہنچ کر مَیں نے آئینہ دیکھا۔ کبھی میرا چہرہ ترچھا نظر آتا تھا، کبھی لمبوترا اور کبھی بالکل گول دائرے کی طرح۔ یہ آئینے کا نقص تھا۔ غالباً اسی سستے آئینے کی وجہ سے مجھے اس قدر احساسِ کمتری تھا۔ لطف یہ کہ مجھے پہلے اس کا خیال تک نہیں آیا۔

کل مَیں فوراً بازار گیا اور ایک اچھا سا آئینہ خریدا۔ اس میں اپنا چہرہ غور سے دیکھتا ہوں تو زمین آسمان کا فرق تھا۔ مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ میں اتنا بُرا نہیں ہوں۔ پھر شام کو میرا ٹینس میچ تھا۔ مَیں گھبرا رہا تھا تو صرف اس بات سے کہ اگر میچ لمبا ہو گیا اور اندھیرا ہو گیا تو مَیں ضرور ہار جاؤں گا، کیونکہ روشنی کم ہوتے ہی کھیل میں میری دلچسپی کم ہوتی جاتی تھی۔ کل شام کو میچ واقعی لمبا ہو گیا اور آخری سٹ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ لیکن میں اسی دلچسپی اور تن دہی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب مَیں نے میچ جیتا ہے تو باقاعدہ تارے نکلے ہوتے تھے۔ تعجّب ہے کہ مَیں نے پہلی مرتبہ روشنی کی کمی کو محسوس نہیں کیا اور ایسے مخالف کو ہرایا جس نے کئی سال سے میری زندگی تلخ کر رکھی تھی۔ کھیل کے بعد مَیں نے صبیحہ کے گھر کا رُخ کیا۔ اور۔۔"

"بھئی وہ ذرا بس کہیں۔" مَیں نے نہایت دھیمی آواز میں کہا۔

"بس میں دیر ہے۔ وہاں صبیحہ کے ابّا ملے، اس کی امّی ملیں۔ پہلے مجھے ان دونوں سے یہی شکایت تھی کہ وہ مجھ سے بے رخی برتتے ہیں، لیکن کل رات مَیں نے پہلی مرتبہ ان کی آنکھوں میں شفقت جھلکتی دیکھی۔ وہ میری جانب بڑی محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے

تھے۔ میری نظریں انگیٹھی پر رکھی ہوئی تصویروں کی طرف چلی گئیں جہاں کنبے کے افراد کی تصویریں رکھی تھیں، وہاں ایک تصویر میری بھی تھی۔ یہ تصویر مجھے پہلے کیوں نہیں دکھائی دی؟ اس کا جواب مَیں نہیں دے سکتا۔ پھر مجھے کھانے پر ٹھہرا لیا گیا۔ دسترخوان پر صبیحہ ذرا دُور بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا، بُری طرح شرما رہی تھی مَیں رات گئے لَوٹا لیکن کوٹھی کے دروازے پر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اوپر صبیحہ کے کمرے میں روشنی تھی اور کوئی دریچے میں کھڑا تھا۔ اس سے پہلے بھی مَیں کتنی مرتبہ رات گئے ان کے ہاں سے لَوٹا تھا۔ صبیحہ کے کمرے میں روشنی بھی ہُوا کرتی تھی اور شاید وہ دریچے سے مجھے دیکھا بھی کرتی لیکن کل رات پہلی مرتبہ مجھے اس کا احساس ہوا۔ اور جب مَیں واپس لَوٹا تو چاند مسکرا رہا تھا، تارے مسکرا رہے تھے، دنیا مسکرا رہی تھی۔ میرا رُواں رُواں مسرّت سے ناچ رہا تھا میرے خیال میں اتنے مختصر عرصے میں اتنی ساری خوشگوار تبدیلیاں کسی کی زندگی میں نہیں آئی ہوں گی۔ پرسوں مَیں ایک چڑچڑا اور بیزار لڑکا تھا، جس کی زندگی کا مقصد صرف خودکشی تھا جس کے بلڈ پریشر کا گراف دن بدن اونچا ہوتا جا رہا تھا لیکن کل قسمت کچھ ایسی مہربان ہوئی کہ سب کچھ بدل گیا۔ میرے چاروں طرف جو دھندسی چھائی رہتی تھی وہ یک لخت دُور ہو گئی۔ مجھے وہ چیزیں دکھائی دینے لگیں جن سے مَیں پہلے آشنا نہیں تھا۔ یہی کائنات جو بے حد دھندلی، بے معنی اور دُور دُور معلوم ہوتی تھی، دفعتہً اپنی تمام رنگینیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ بالکل قریب آ گئی۔"

"اور تمہارا بلڈ پریشر؟" کسی نے پوچھا۔

ہاں! میرا بلڈ پریشر۔ آج صبح مَیں ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا تو انہوں نے میرا معائنہ کیا اور حیران رہ گئے۔ میرا بلڈ پریشر اس قدر گر چکا تھا کہ نارمل سے بھی نیچے تھا۔"

"کمال ہے۔"

"حد ہو گئی۔"

"لیکن رُوفی بلاوجہ تو یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوا ہوگا۔"

"نہیں کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی۔" شیطان بولے۔

"پھر بھی۔ شاید کچھ ہوا ہو۔ پرسوں یا کل۔"

"کوئی ایسی خاص بات تو نہیں ہوئی۔ فقط میں نے ذرا ـــ"

"ہاں ہاں۔ فقط کیا؟" ہم سب نے پوچھا۔

"فقط مَیں نے اپنی عینک کے شیشے بدلوائے تھے۔" اُنہوں نے اپنی عینک اُتار کر کہا۔ پچھلے ہفتے مَیں نے کافی عرصے کے بعد دوبارہ اپنی بینائی کا معائنہ کرایا تھا اور ڈاکٹر صاحب نے نئے شیشے تجویز کیے تھے۔ یہ نئی عینک مَیں نے کل صبح سے لگانی شروع کی ہے۔"

ہم سب لاحول پڑھتے ہوئے اُٹھے اور بڑی پھُرتی سے سڑک پر پہنچے۔ آخری بس نکل چکی تھی!

جب ہم سات میل لمبی سڑک پر پیدل ہوسٹل کی طرف آ رہے تھے تو ہمارے بلڈ پریشر کا گراف ماؤنٹ ایورسٹ سے بھی اونچا پہنچ چکا تھا۔

کلب

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب مَیں ہر شام کلب جایا کرتا تھا۔

شام کو بلیرڈ روم کا افتتاح ہو رہا ہے۔ چند شوقین انگریز ممبروں نے خاص طور پر چندہ اکٹھا کیا۔ ایک نہایت قیمتی بلیرڈ کی میز منگائی گئی۔ کلب کے سب سے معزّز اور پرانے ممبر رسمِ افتتاح ادا کر رہے ہیں۔

پہلے ایک مختصر سی تقریر ہوئی۔ پھر میز کی سبز مخمل پر چھوٹی سی گیند رکھ دی گئی اور ان بزرگوار کے ہاتھ میں کیو دیا گیا کہ گیند سے چھُو دیں، لیکن انھوں نے اپنے طُرّے کو چند مرتبہ لہرایا۔ مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ چند قدم پیچھے ہٹے اور پھر دفعتہً کسی بیل کے جوش و خروش کے ساتھ حملہ آور ہوتے۔ سب نے دیکھا کہ میز کا قیمتی کپڑا نصف سے زیادہ پھٹ چکا ہے اور کیو اندر دھنس گیا ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر ایک بچہ بولا۔ "ابّا جان! آپ خاموش کیوں ہیں؟ آپ OPENING CEREMONY کے خواہش مند تھے۔ انھوں نے اس ڈنڈے کی نوک سے مخمل کو OPEN کر تو دیا ہے۔ اور کیا چاہیے؟"

ایک جگہ غدر مچا ہوا ہے۔ بچّے چیخ رہے ہیں، چلّا رہے ہیں۔ بالکل ہی نزدیک چند معمّر حضرات اس سنجیدگی سے اخبار پڑھ رہے ہیں جیسے کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ ایک کھیل کھیلا

جا رہا ہے۔ ایک بچّہ گراموفون پر ریکارڈ رکھتا ہے لیکن ریکارڈ بجایا نہیں جاتا صرف گھمایا جاتا ہے۔ ایک اور بچّہ باجے کے گرد بھاگ بھاگ کر گھومتے ہوئے ریکارڈ کے الفاظ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سب بچّے تالیاں بجا رہے ہیں۔

ایک بچّہ اپنے کوٹ کے کالر میں گوبھی کا چھوٹا سا پھول لگا کر آیا ہے۔ چند بچّوں نے کلب کے سارے کیلنڈر اُلٹ پلٹ کر دینا، غلط تاریخیں لگا دینا اور کلاکوں کی سوئیاں اُوپر نیچے کر دینا اپنا فرض تصوّر کر رکھا ہے۔ ایک بچّہ ایک تنہا کمرے میں بیٹھا بڑی سنجیدگی سے گا رہا ہے۔ ع

شباب آیا کسی بُت پر فدا ہونے کا وقت آیا

ایک بچّہ باہر گیٹ کے پاس خوانچے والے سے محوِ گفتگو ہے۔

"تمہارے پاس شکر قندیاں ہیں؟"

"نہیں شکر قندیاں تو نہیں ہیں۔"

"کھیرے ہیں؟"

"نہیں۔ مگر سنگترے ہیں۔"

"اور ککڑیاں؟"

"ککڑیاں نہیں۔ مگر کیلے ہیں۔"

"اور گنڈیریاں؟"

"نہیں لیکن سیب ہیں۔"

"تو کہہ کیوں نہیں دیتے کہ تمہارے پاس فروٹ بالکل نہیں ہیں۔"

چند بچّے بیٹھے بڑوں کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ایک بچّہ کہہ رہا ہے کہ ان لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر انہیں کوئی لطیفہ سناؤ تو سن چکنے کے بعد پوچھتے ہیں کہ پھر کیا ہوا؟

دوسرا بچّہ کہہ رہا ہے کہ چند سال پہلے اس کے ابّا اسے ایک آنہ دے کر فرمایا کرتے

تھے کہ جاؤ بیٹا عیش کرو۔

"اب بتائیے ایک آنے میں کیا ہو سکتا ہے؟"

ایک بچّے کو دکاندار نے ایک روپے کی ریزگاری دیتے وقت جلدی میں سترہ آنے دے دیے ہیں۔ مگر بچّے کو یقین ہے کہ اس سودے میں بھی اُس نے کچھ بچا لیا ہوگا، آخر کو دکاندار تھا۔

ایک کمرے میں کچھ حضرات اور اُن کے لختِ جگر اور نورِ چشم بیٹھے ہیں۔ ایک صاحب اپنی کھینچی ہوئی تصویریں دکھا رہے ہیں۔ ان کے بچّے نے اچھل کر ایک تصویر چھین لی، اور نعرہ لگایا "ابّا جان! یہ آدمی ماموں جان سے کتنا ملتا ہے۔"

"بالکل نہیں ملتا۔"

"کتنا تو ملتا ہے۔ فقط اس کے کان ذرا لمبے ہیں اور ناک ذرا چھوٹی ہے۔ بس۔"

"بیٹے نہیں ملتا۔"

"نہیں ابّا جان۔ آپ غور سے دیکھیے۔ بس اس کے ہونٹ ذرا موٹے ہیں۔ آنکھیں ذرا بھینگی ہیں اور ماتھا ذرا چھوٹا ہے۔ باقی تو ہو بہو ماموں جان سے ملتا ہے۔ اور یہ آدمی کرسی پر کیوں نہیں بیٹھا۔ پیدل کیوں کھڑا ہے؟"

اُن صاحب کی ایک تصویر ہل گئی ہے۔ مگر وہ صاحب فرما رہے ہیں کہ ان کا کیمرہ ہرگز نہیں ہلا۔

"آپ کا کیمرہ ہرگز نہیں ہلا تو بیک گراؤنڈ ہل گیا ہوگا۔ یا یہ عمارت ہل گئی ہوگی۔" ایک بچّہ کہتا ہے۔

"عمارت کس طرح ہل سکتی ہے؟" ایک اور بچّہ پوچھتا ہے۔

"زلزلے سے سب کچھ ہل سکتا ہے۔" ایک برخوردار بیان دیتے ہیں۔

"ابّا جان!" ایک طرف سے آواز آتی ہے۔

"ہاں بیٹا۔" اس کے والد بڑی محبت سے کہتے ہیں۔

"آپ کے ماتھے پر یہ جو جھُریاں ہیں ان پر استری نہیں ہو سکتی کیا؟"

ایک اور صاحب مغربی مصنّفوں کا ذکر فرما رہے ہیں۔ او ہنری کا ذکر ہو رہا ہے۔ ایک برخوردار پوچھتے ہیں۔

"ابّا جان۔ یہ او ہنری کچھ یوں معلوم نہیں ہوتا جیسے ابے او ہنری؟"

کسی نے ایک بڑا سا سگریٹ لائٹر نکالا۔

اس پر ایک صاحبزادے چلّائے۔ "ابّا جان اتنا بڑا سگریٹ لائٹر آپ نے کبھی دیکھا؟ ضرور یہ حقّے کے لیے ہوگا۔"

"اور یہ دونوں شادہ شدی معلوم ہوتے ہیں۔ شاید بیاں میوی ہیں؟" ایک بچّے نے تصویر ہاتھ میں لے کر کہا۔

"ہاں۔ یہ خرید و فروخت کرنے جا رہے تھے کہ مَیں نے تصویر اتار لی۔" والد ماجد بولے

"ابّا جان! لوگ خرید و فروخت کرتے وقت اپنے گھر سے چیزیں لے جا کر بازار میں فروخت بھی کرتے ہوں گے؟" اُس نے پوچھا۔

اتنے میں ایک بیرے نے آکر ایک صاحب سے دریافت کیا۔ آپ کھانا یہیں کھائیں گے؟

"ہاں۔ مگر انگریزی کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

"اُردو کھانا کھاؤں گا۔" ایک بچّے نے لقمہ دیا۔

"کیسے بے ہودہ بیرے ہیں۔"

"ابّا جان! ہودہ آدمی بھی تو ہوتے ہوں گے جو نہایت اچھے ہوں گے۔"

ایک گوشے میں چند بچے کتابیں کھولے بیٹھے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ ہو رہا ہے۔

"پانی پت کی لڑائی میں مرہٹوں کا کیا نکل گیا؟" ایک نے پوچھا۔

"بھُرکس۔"

"اور علاؤالدین خلجی کے زمانے میں کیا چیز عام تھی؟"

"طوائف الملوکی۔"

"اکبر نے رشوت کا کیا کر دیا؟"

"قلع قمع۔"

"بڑے ذہین لڑکے ہیں۔" ایک بزرگ فرماتے ہیں "کیوں میاں صاحبزادے امتحان میں کتنے نمبر لو گے؟"

"جی مَیں یونیورسٹی میں سیکنڈ آؤں گا۔"

"سیکنڈ کیوں؟ فرسٹ کیوں نہیں؟"

"جی فرسٹ ایک اور لڑکا آئے گا جو میرا ہم جماعت ہے۔"

ایک بزرگ رات بھر عبادت کرتے ہیں۔ ان کے صاحبزادے جو حساب پڑھ رہے ہیں۔ کہتے ہیں۔ ابّا جان! آپ اللہ میاں، اللہ میاں اتنی مرتبہ کیوں دُہراتے ہیں؟ یوں کیوں نہیں کرتے کہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر کہہ دیا کریں — اللہ میاں ضرب ایک لاکھ — انہوں نے سلیٹ پر لکھ کر بھی دکھایا — (اللہ میاں × ۱۰۰۰۰۰) — بس اس کے بعد آرام سے سو جایا کریں۔"

اور بزرگ ہیں کہ اپنے نورِ چشموں، راحت جانوں کی باتیں سُن سُن کر فخر سے پھُولے نہیں سماتے۔

"ابّا جان! بادلوں کی بجلی اور پنکھے کی بجلی میں کیا فرق ہے؟"

"مَیں نے سائنس نہیں پڑھی تھی۔"

"ابّاجان! خطِ استوا تو کافی بڑی ساری چیز ہوگی۔ دُور سے نظر آتی ہوگی۔"

"پتہ نہیں۔"

"ابّاجان، اسکیمو تو خوب آئس کریم بنا بنا کر کھاتے ہوں گے؟"

"پتہ نہیں۔ مجھے جغرافیہ پڑھے دیر ہوگئی ہے۔"

"ابّاجان! توپ کس طرح چلاتے ہیں؟"

"پتہ نہیں۔"

"ابّاجان۔ اگر۔"

"ہاں ہاں۔ بیٹا۔"

"اچھا۔ جانے دیجیے۔"

"جانے کیوں دیجیے؟ (چلّا کر) تم سوال پوچھنے سے کیوں ہچکچاتے ہو؟ اگر سوال نہیں پوچھوگے تو سیکھوگے خاک؟ تمہارے علم میں کیونکر اضافہ ہوگا؟"

چند بچے سوٹیوں اور میخوں سے مسلح ہو کر چپکے چپکے موٹروں کی طرف جا رہے ہیں۔

مَیں بے تحاشا بھاگتا ہوں، اپنی سائیکل بچانے جس میں صبح صبح پنکچر لگوایا تھا۔

آج رات خاص تقریب ہے۔ ایک بہت بڑے عامل اپنے کمالات کا مظاہرہ کرنے والے ہیں۔

"مَیں اپنے دل کی حرکت بند کر دوں گا۔ یہ عطیہ مجھے تبّت کی پہاڑیوں میں ایک سنیاسی سے ملا تھا۔ ایسے درویش سے جن کی عمر چھ سو برس تھی۔ جن کی مَیں نے بیس سال خدمت کی تھی۔"

وہ ہال کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر چھت پر نظریں گاڑ دیتے ہیں اور بُت بن جاتے ہیں۔ کمرے میں مکمل خاموشی ہے۔ وہ زیرِ لب بڑبڑانے لگتے ہیں۔ پھر ان کے دیدے مٹکنے لگتے ہیں۔ الفاظ اُونچے ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک بالکل عجیب و غریب عبارت پڑھ رہے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے وہ سکتے میں آجاتے ہیں اور دھڑام سے غش کھا کر گر پڑتے ہیں۔ پھر اُٹھ کر ایک صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں اور دونوں ہاتھ پھیلا کر مری ہوئی آواز میں کہتے ہیں "خواتین و حضرات! میرے قلب کی حرکت تھم گئی ہے۔ آپ میری نبضیں دیکھ سکتے ہیں۔"

سب نے ان کی نبضیں ٹٹولیں۔ بالکل ساکن تھیں۔

کلب کے سیکرٹری جو ایڈیشنل جج تھے، ہیڈ بیرے پر خفا ہو رہے تھے کہ ٹینس کے میدان کی گھاس کیوں نہیں کاٹی گئی؟

"رولر کیوں نہیں پھیرا گیا؟ اتنے آدمی کیوں رکھے ہوئے ہیں؟ دو بیل کیوں رکھے ہیں؟ رولر کے لیے ایک بیل کافی ہے۔ دوسرا کیا کرتا ہے؟"

"دوسرا ایڈیشنل بیل ہے۔" جواب ملا۔

بیرا تنخواہ میں اضافہ چاہتا ہے۔ "اس وقت جبکہ دُنیا کے ہر گوشے میں بیداری پھیل رہی ہے اور مزدور طبقے کو سب آنکھوں پر بٹھا رہے ہیں۔ اتنی تھوڑی تنخواہ بالکل مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ میری تنخواہ زیادہ ہونی چاہیے، ورنہ۔"

"اچھا دیکھیں گے۔ چیئرمین صاحب سے کہیں گے۔"

"آپ ہمیشہ یہی کہتے ہیں۔ مَیں کہتا ہوں میری تنخواہ بڑھنی چاہیے، ورنہ۔"

"کچھ دیر انتظار کرو۔"

"ہرگز نہیں۔ میری تنخواہ بڑھنی چاہیے، ورنہ۔"

"ورنہ۔ ورنہ کیا کروگے؟"

"ورنہ۔ (سر کھجاتے ہوئے) ورنہ پرشین گلف یا مڈل ایسٹ کی طرف نکل جاؤں گا۔"

وہ دیر تک بڑبڑاتا رہا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنا دکھڑا رونا شروع کر دیا۔ چیئرمین ایسے ہیں، سیکرٹری ایسے ہیں، ممبر ایسے ہیں۔ اس قسم کے مہمانوں کو ساتھ لاتے ہیں۔

"اب آج جو یہ جادوگر صاحب تشریف لاتے ہیں۔ یہ اپنی طرف سے بڑا کمال دکھا رہے ہیں۔ مَیں نے خود دیکھا ہے کہ ان کی بغلوں میں دو ٹینس کی گیندیں دبی ہوئی ہیں جب کندھے دباتے ہیں تو بازوؤں میں خون جانا بند ہو جاتا ہے اور نبضیں بند ہو جاتی ہیں۔ اس طرح کون نہیں کر سکتا؟"

ساتھ کے کمرے میں چیزیں پکائی جا رہی ہیں اور بیرے ممبروں پر تبصرہ کر رہے ہیں۔ میں بھی ممبر ہوں، لہٰذا مَیں یہ سب سُننا نہیں چاہتا۔

"ذرا میری برساتی تو اٹھا لانا۔" مَیں اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہتا ہوں۔

"کس رنگ کی ہے؟"

"سبز رنگ کی۔"

"سبز رنگ کی؟ (کچھ دیر سوچ کر) اوہ آپ کا مطلب ہے گرین برساتی۔ اچھا لاتا ہوں۔"

چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ مَیں کلب کے باغ میں ٹہل رہا ہوں۔ ایک خوشنما کنج سے کچھ آوازیں آ رہی ہیں۔ مَیں دبے پاؤں جا کر دیکھتا ہوں۔ بنچ پر ایک لڑکی بیٹھی ہے سامنے ایک گھٹنا گھاس پر ٹیکے ایک لڑکا ہے۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے دل پر ہے اور دوسرا ہوا میں لہرا رہا ہے۔ نہایت رُومان انگیز فضا ہے۔

"مَیں شادی کا وعدہ تو نہیں کرتی۔ صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ آپ سیمی فائینلز میں آ گئے ہیں۔"

"اپنے پرانے رفیق سے ایسی بے رُخی؟"

"پرانے رفیق۔ چہ خوب۔ پرانے رفیق کیا، آپ میرے نئے رفیق بھی نہیں ہیں۔"

"لیکن تمہیں مجھ سے محبّت تو ہے۔"

"یہ آپ کو کس نے بتایا؟ محبّت تو ایک طرف رہی، مجھے آپ سے باقاعدہ نفرت بھی نہیں ہے۔"

"مَیں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ جب میں تمہارے انار کے دانوں جیسے دانت، چیری جیسے ہونٹ، سیب جیسے گال ——"

"یہ کسی لڑکی کا ذکر ہو رہا ہے یا فروٹ سلاد کا۔"

"کیا بتاؤں؟ بس سمجھ لو کہ مجھے اظہارِ محبت کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔"

"تو کیا مَیں ڈکشنری ہوں؟"

"آج مَیں تمہارا فیصلہ سُن کر ہی جاؤں گا۔"

"مجھے ڈر ہے کہ میرا فیصلہ آپ کے نظامِ اعصابی کے لیے مُضر ثابت ہو گا —— لو سُن لو —— ہماری راہیں بالکل الگ الگ ہیں۔"

"بے شک ہماری راہیں الگ الگ ہیں۔ تم اپنی راہ پر جاؤ اور مَیں —— مَیں تمہاری راہ پر جاؤں۔ تم نہیں سمجھتیں کہ تم میری بیکار زندگی میں کتنی خوشگوار تبدیلیاں لے آئی ہو۔ پہلے میری زندگی کے افق پر سیاہ بادل چھائے رہتے تھے۔ بجلیاں کڑکتی تھیں۔ آندھیاں چلتی تھیں، طوفان آتے تھے۔ تمہارے آنے پر گھٹائیں چھنٹ گئیں، فضا نکھر گئی، سورج نکل آیا، ہوا کے لطیف خنک جھونکے چلنے لگے۔"

"یہ اظہارِ محبت ہے یا موسم کی رپورٹ؟ آخر میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ مَیں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"اچھا! کیا تم چند وجوہات بتا سکتی ہو کہ تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کر سکتیں؟"

"پہلی وجہ یہ کہ آپ مجھے پسند نہیں ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ آپ مجھے پسند نہیں۔ تیسری وجہ یہ کہ آپ مجھے پسند نہیں۔"

"اور جو یہ مَیں اتنے عرصے سے تمہاری نازبرداریاں کرتا رہا ہوں۔ پورے چار سال سے تمہارے پیچھے پیچھے پھرتا رہا ہوں۔ یہ۔"

"اس کے لیے آپ کیا چاہتے ہیں؟ پنشن؟"

"کیا تمہیں سچ مچ میرا خیال نہیں۔ کیا تمہیں مَیں کبھی یاد نہیں آتا؟"

"صرف ایک دن یاد آئے تھے۔"

"کس دن؟"

"اس دن مَیں چڑیا گھر گئی ہوئی تھی۔"

جب وہ واپس جا رہے تھے تو لڑکی کہہ رہی تھی "آپ تو سچ مچ ناراض ہو گئے۔ مَیں تو مذاق کر رہی تھی۔" اور لڑکا کہہ رہا تھا "تم جیسی لڑکی سے شادی کرنے سے بہتر ہے کہ انسان کسی مگرمچھ سے شادی کر لے۔"

نوجوانوں کے جھرمٹ میں انہی حضرت کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے۔

"وہ اس قدر ٹھس طبیعت ہے کہ جب صرف میرے متعلق باتیں کر رہا ہو تب بھی مجھے اُکتا دیتا ہے۔"

"اور خود پسند اتنا ہے کہ جب اس کا ایکس رے لیا گیا تو اُس نے جلدی سے بال درست کیے اور مسکرانے لگا۔ بعد میں اصرار کیا کہ ایکس رے کو ری ٹچ بھی کیا جائے۔ اے لو وہ آ رہا ہے۔"

"آؤ بھئی۔ تمہاری ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ ہم سب تمہاری تعریفیں کر رہے تھے۔ لاؤ تمہاری ہتھیلی دیکھیں۔ ارے، یہ لکیریں تو کہتی ہیں کہ تم محبت میں کامیاب رہو گے۔"

"کون سی محبت میں؟ کوئی ایک محبت ہو تو معلوم ہو۔"

"مبارک باد قبول ہو۔"

"کس بات کی؟"

"تمہاری شادی ہو رہی ہے۔"

"نہیں میری شادی تو نہیں ہو رہی۔"

"تو پھر تو اور بھی مبارک باد۔"

"دراصل میری مالی حالت اجازت نہیں دیتی کہ مَیں شادی کے متعلق سوچوں بھی۔ جب مستقل آمدنی کی صورت پیدا ہو گئی، تب سوچیں گے۔"

"تم ضرورت سے زیادہ محتاط ہو۔ میرے خیال میں تم پنشن ملنے کے بعد شادی کرنا۔"

"دراصل شادی ایک لفظ نہیں، پورا فقرہ ہے۔"

"جانتے ہو محبت کرنے والوں کا کیا حشر ہوتا ہے؟"

"کیا ہوتا ہے؟"

"ان کی شادی ہو جاتی ہے۔"

"شادی کے لیے تو بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے۔"

"شادی کے لیے صرف دو کی ضرورت ہے — ایک نوعمر لڑکی — اور ایک بے صبر ماں۔"

"لیکن کورٹ شپ کس قدر پُرلطف وقفہ ہوتا ہے۔"

"کورٹ شپ وہ وقفہ ہے جب لڑکا لڑکی کا تعاقب کرتا ہے، حتیٰ کہ وہ اُسے پکڑ لیتی ہے۔"

"تم اس لڑکی کا ذکر کیوں نہیں کرتے جس سے ابھی ابھی مل کر آئے ہو۔ کیا بنا؟"

"بننا کیا تھا؟"

"شاید یہ پہلی نگاہ کی محبت ہے۔"

"ہاں تھی تو پہلی نگاہ کی محبت۔ لیکن بعد میں مَیں نے دوسری اور تیسری نگاہ بھی ڈال لی تھی۔"

"ویسے وہ لڑکی ہے خوب۔"

"ہاں، ہُوبہُو اپنے والد کا فوٹوگراف ہے اور اپنی والدہ کا فونوگراف۔"

"کئی سال سے اپنی عمر اٹھارہ برس بتا رہی ہے۔"

"جانتے ہو عورت کی عمر کے چھ حصّے ہوتے ہیں۔ بچی۔ لڑکی۔ نوعمر خاتون۔ پھر نوعمر خاتون۔ پھر نوعمر خاتون۔ پھر نوعمر خاتون۔"

لڑکیوں کے جھرمٹ میں اس لڑکی کی تعریفیں ہو رہی تھیں کہ چھچھوری ہے۔ بد دماغ ہے، چغلیاں کرتی رہتی ہے

"لیکن ہر پارٹی میں اسے بُلایا جاتا ہے اور ہر جگہ اس کی تعریفیں ہوتی ہیں۔"

"وہ اس لیے کہ اس کی آواز اتنی تیز ہے کہ جب وہ بول رہی ہو تو کسی اور کی بات سنائی نہیں دیتی۔ یہاں تک کہ اس کے سامنے ریڈیو کی آواز بھی دب جاتی ہے۔ وہ آگئی۔"

"آؤ بہن، سُنا ہے تمہاری منگنی ہونے والی ہے۔"

"جی نہیں! میری منگنی نہیں ہو رہی۔ لیکن اس افواہ کا شکریہ۔"

"لاؤ تمہاری ہتھیلی دیکھیں۔ تمہاری قسمت میں دس مرتبہ فلرٹ کرنا لکھا ہے۔ (باچھیں کھِل گئیں)، چار مرتبہ تمہیں محبت ہوگی۔ (مسکراہٹ ختم ہوگئی)، اور صرف ایک شادی ہوگی۔" (چہرہ اتر گیا)۔

"اوہ۔"

"کیوں؟"

"نہیں کچھ نہیں۔"

"کیا تم کبھی اپنے خوابوں کے شہزادے سے بھی ملیں۔ دنیا کے اس منفرد شخص سے جس سے مل کر تمہیں یہ محسوس ہوا ہو کہ تم اور وہ محض ایک دوسرے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔"

"ہاں۔ کئی مرتبہ۔"

کلب میں تقریریں ہوں گی۔ مَیں کچھ دیر سے پہنچا ہوں۔ بڑی رونق ہے۔ تالیاں بج رہی ہیں۔ ایک صاحب نے ابھی ابھی تقریر ختم کی ہے۔

بہت سی خواتین آگئیں اور ہمیں اگلی کرسیاں خالی کرنی پڑیں۔ مجھے آخری قطار میں جگہ ملی۔ لوگ متواتر باتیں کر رہے تھے اور سٹیج وہاں سے کافی دُور بھی تھی اس لیے تقریر صاف سنائی نہ دیتی تھی۔ ایک خاتون تقریر فرما رہی تھیں۔ تقریر کچھ یوں سنائی دے رہی تھی ——

"آج کا دن کتنا مُبارک ہے کہ میاؤں —— سب خواتین میاؤں میاؤں۔ عظیم الشان اجتماع —— ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔ نہایت مسرّت کا مقام ہے۔ وہ دن گئے کہ خواتین میاؤں —— مرد میاؤں —— اور دونوں میاؤں میاؤں میاؤں —— مَیں آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی —— صاف صاف سناتے دیتی ہوں —— عورت کا درجہ میاؤں —— اور اگر خدانخواستہ میاؤں میاؤں۔ تو پھر نہ صرف میاؤں —— بلکہ میاؤں میاؤں میاؤں۔ (تالیاں)، وہ دن دور نہیں ہے —— نسوانی وقار —— نسوانی دنیا۔ نسوانی میاؤں

اور اگر خدا نے چاہا تو بہت جلد میاؤں میاؤں۔ (تالیاں) مگر مجھے ڈر ہے کہ مردوں کی بے جا ضد۔ ہٹ دھرمی۔ اکھڑپن۔ اور میاؤں میاؤں۔ مگر ہمیں کوئی پرواہ نہیں۔ (تالیاں)، ماشاء اللہ میاؤں میاؤں ـــ انشاء اللہ میاؤں میاؤں ـــ سبحان اللہ میاؤں۔ جزاک اللہ میاؤں ـــ اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ میں التجا کرتی ہوں کہ سب کی سب میاؤں میاؤں متحد ہو کر ـــ ہم خیال ہو کر۔ میاؤں میاؤں۔ ہم ثابت کر دیں گی۔ پیاری بہنو ـــ میاؤں میاؤں۔" (تالیاں)

حاضرین زور زور سے باتیں کر رہے ہیں۔ بیرے آرہے ہیں۔ بیرے جا رہے ہیں۔ بچے شور مچا رہے ہیں۔ اب ایک حضرت تقریر فرما رہے ہیں۔ بڑی خونخوار مونچھوں اور بھاری پاٹ دار آواز کے مالک۔ وہ کچھ یوں تقریر کر رہے ہیں:

"مجھے بڑا افسوس ہے کہ بھوں بھوں ـــ ضد سے کام نہیں چلے گا۔ باہمی مفاہمت باہمی تبادلہ بھوں بھوں ـــ ایک دوسرے کی بھوں بھوں ـــ اور پھر آپس میں مل کر بھوں بھوں بھوں۔ (تالیاں) ہم سب شرائط ماننے کو تیار ہیں۔ ہمیں موقعہ ملنا چاہیے۔ مرد اتنے ہٹ دھرم ہرگز نہیں ہیں۔ میری مانیے تو بھوں بھوں۔ (تالیاں) دیکھیے نا کتنے سال گزر چکے ہیں۔ میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ عورت بھوں بھوں ـــ اور مرد بھوں بھوں ـــ ہرجائی پن ـــ تتلیاں ـــ فیشن۔ اور بھوں بھوں۔ (تالیاں) یہ لاینحل بھوں بھوں۔ عورتیں اب تک اپنی حفاظت ـــ مردوں کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ ہم منتظر ہیں کہ عورتیں کب بھوں بھوں۔ (تالیاں) جب وہ وقت آیا تو سب سے پہلے میں بھوں بھوں۔ (تالیاں) اس کے بعد سارے مرد بھوں بھوں۔ (تالیاں) یہ مساوات کا مسئلہ بہت پرانا ہے۔ کوئی آج کی بات نہیں۔ حالانکہ بھوں۔ لیکن بھوں۔ لہٰذا بھوں۔ خیر بھوں۔ تو پھر بھوں بھوں بھوں بھوں۔" (تالیاں)

ایک کمرے میں دو پختہ عمر کے معزز حضرات بیٹھے ہیں۔

"جلالی صاحب کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ میرے خیال میں تو وہ بے حد وسیع القلب اور وسیع الدماغ اور وسیع الخیال انسان ہیں۔"

"درست ہے۔ بے حد نیک اور بامروّت شخص ہیں۔ ایسے راست گو اور نیک خصلت انسان بہت کم ملتے ہیں۔"

"اور پھر ان کے چہرے کی نورانی مسکراہٹ کیسی ہے، جیسے ولی اللہ ہوں۔"

"اس روز آپ کے ہاں اتفاق سے ملاقات ہو گئی۔ شاید وہ آپ کے عزیز دوستوں میں سے ہیں۔"

"جی نہیں۔ ہم دوست تو نہیں ہیں۔ بس واقف ہیں۔"

"میں ان کو آپ کا عزیز سمجھتا رہا ہوں۔ اس دن اکٹھے دیکھا تھا۔"

"نہیں، وہ میرے عزیز نہیں ہیں۔ اس روز اتفاق سے مل گئے تھے۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتا رہا کہ وہ آپ کے واقف ہیں۔"

"جی نہیں! خیر، وہ آپ کے عزیز نہیں ہیں۔"

"ان کے متعلق کچھ افواہیں سننے میں آتی رہتی ہیں۔ خدا جانے جھوٹ ہیں یا سچ۔"

"میں نے بھی بہت سی باتیں سنی ہیں۔"

"اتنے سارے آدمی جھوٹ تو کیا بولتے ہوں گے۔ کچھ صداقت تو ہو گی ان افواہوں میں۔"

"میرے خیال میں تو یہ افواہیں درست ہیں۔"

"اگر سچ پوچھیے تو وہ نہایت ہی نامعقول شخص ہے۔"

"بالکل بجا فرماتے ہیں آپ۔ اور ساتھ ہی اوّل درجے کا رشوت خور اور چغل خور ہے۔"

"میرے خیال میں اس قدر بیہودہ اور شرارتی انسان کلب بھر میں نہیں ہوگا۔"

"واقعی بے حد مردود اور خبیث شخص ہے۔"

چند حضرات بیٹھے دوسرے ممالک کی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ کافی سیاحت کر چکے ہیں۔ مَیں اجنبی ممالک کے متعلق بہت سی باتیں جاننا چاہتا ہوں۔

"مشرق وسطیٰ کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟"

"وہاں پھل بہت سستے ہیں۔ خصوصاً کھجوریں تو بہت ارزاں اور مزے دار ہیں۔"

"سُنا ہے وُہ بے حد پُراسرار اور رومان انگیز جگہ ہے۔ پرانے شہروں میں اب بھی الف لیلہ کا سا ماحول ہے۔"

"وہاں سردے بہت اچھے ہوتے اور انگور تو نہایت ہی عمدہ ہوتے ہیں۔ سستے اور لذیذ۔ دو آنے دے کر پورا ٹوکرا لے لو۔"

"اور مصر کیسا ملک ہے؟ فرعونوں کے مقبرے، اہرام، ابوالہول۔ ان کے متعلق بتایئے۔"

"ان تاریخی مقامات پر خوانچے والے بہت پھرتے ہیں اور مسافروں کو خوب لُوٹتے ہیں۔ ہر چیز کی چوگنی قیمت وصول کرتے ہیں۔ ادھر اُونٹ والے ہر مسافر سے یہی کہتے ہیں کہ اہرام چلیے۔ یہاں سے پانچ میل ہے۔ لیکن آپ سے خاص رعایت ہے۔ آپ کے لیے صرف تین میل۔"

"اور شام و فلسطین؟ سنا ہے کہ وہاں جا کر انجیل کے سارے واقعات آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔"

"وہاں کاشتکاری بالکل نئے طریقوں سے کی جاتی ہے۔ چاروں طرف مشینیں ہی

مشینیں نظر آتی ہیں۔ مشینوں کو بھی مشینیں چلاتی ہیں۔"

"ترکی میں آپ نے کیا دیکھا؟"

"وہاں کھانے پینے کا انتظام بہت اچھا ہے۔ دنیا کے بہترین ہوٹل ٹرکی میں ہیں۔"

"اور ایران تو بہت ہی خوشنما جگہ ہوگی۔ سعدیؔ اور حافظؔ کا وطن۔ موسیقی۔ پھول۔ رنگینیاں۔"

"وہاں بادام اور کشمش نہایت اعلیٰ درجہ کے ملتے ہیں اور اس قدر ارزاں کہ یقین نہیں آتا۔"

"اور مراقش؟"

"اگر کسی کو کباب کھانے ہوں تو سیدھا مراقش چلا جائے۔ شامی کباب چپلی کباب۔ سیخ کباب۔"

کچھ دیر کے بعد کمرے میں ہم صرف تین رہ جاتے ہیں۔ وہ سیاح جس کا نام شاید کلیمؔ ہے۔ مَیں، اور ایک اور حضرت جو سیاح صاحب پر ناک بھوں چڑھاتے رہے ہیں۔ آخر وہ بھی اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔

کچھ دیر کے بعد پردے کے پیچھے سے انہی حضرت کی آواز آتی ہے۔ "وہ خبیث سیاح چلا گیا یا نہیں؟"

مَیں گھبرا جاتا ہوں اور جلدی سے جواب دیتا ہوں "جی ہاں۔ وہ خبیث سیاح تو کب کا چلا گیا۔ اس وقت تو یہاں کلیمؔ صاحب بیٹھے ہیں۔"

دوسرے کمرے میں سائنس کے پروفیسر ایک بزرگ سے کہہ رہے تھے۔ "گائے کا دُودھ ایک دم سُوکھ گیا ہے، شاید کسی کی نظر لگ گئی۔ اور میرا لڑکا امتحان میں لگاتار

فیل ہو رہا ہے۔ ان دونوں کے لیے تعویذ درکار ہیں۔ آپ پیر صاحب قبلہ سے تعویذ بنوا دیں گے نا؟"

"ضرور۔"

"تو پھر بھُولیے مت۔ دونوں تعویذ جلد بھجوا دیجیے۔ گائے کا تعویذ۔ اور میرے لڑکے کا تعویذ۔"

"بہت اچھا۔"

ایک صاحب جو سُن رہے ہیں اور غالباً نشے میں ہیں، نزدیک آکر تاکید کرتے ہیں۔

"اور دیکھیے۔ اس بات کا خیال ضرور رکھیے کہ تعویذ بدل نہ جائیں۔ کہیں گائے امتحان میں پاس ہو جائے اور خدانخواستہ لڑکا ——"

دو معمّر حضرات بیٹھے پی رہے ہیں۔

"وہ سست الوجود شخص دوپہر سے بے کار بیٹھا ہے۔ وہ جو اس کھڑکی میں سے نظر آرہا ہے۔ شاید اسے دُنیا میں کوئی کام نہیں۔"

"آپ کو کیا پتہ یہ دوپہر سے بے کار بیٹھا ہے؟"

"اس لیے کہ مَیں خود دوپہر سے اسے دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ آپ کا جامِ صحت ہے۔ CHEERS"

"چیرز۔"

"مَیں نے لوگوں کے جامِ صحت اس قدر پیے ہیں کہ اپنی صحت خراب کر لی ہے۔"

"تعجب ہے کہ لوگ دوسروں کی صحت کو محض پیتے کیوں ہیں، کھاتے کیوں نہیں؟ مثلاً اب مَیں ایک کیک لے کر کہوں۔ یہ رہی تمہاری صحت۔ یہ رہا تمہارا کیکِ صحت۔

اور کھانا شروع کر دوں۔"

"یہ ریڈیو پر کیا اُوٹ پٹانگ موسیقی ہو رہی ہے۔"

"غالباً پکّا گانا ہے۔ آپ کو فنونِ لطیفہ سے دلچسپی نہیں کیا؟"

"جی ہے تو سہی۔ مَیں ہمیشہ فنونِ لطیفہ کی عزّت کرتا ہوں، لیکن فنونِ لطیفہ کو بھی تو کچھ میرا خیال ہونا چاہیے۔ مجھے رقص پسند ہے۔ گھوڑا گلی۔ اور جھیکا گلی۔ دونوں قسم کے رقص پسند ہیں۔"

"غالباً آپ کی مراد کتھا کلی رقص سے ہے۔ خیر اسے چھوڑیے، اب مصوری کے متعلق ——"

"مصوری کے متعلق یہ ہے کہ مجھے ان چیزوں سے بڑی چڑ ہے جن سے مَیں ناواقف ہوں۔"

"مصوری کے بارے میں مَیں بھی اتنا کم جانتا ہوں کہ اس پر بحث کرتے ہوئے مجھے غصّہ تک نہیں آتا۔"

اتنے میں بیرہ آتا ہے۔ "ڈاکٹر صاحب آپ کو سلام بولتے ہیں۔"

"ان سے کہنا 'وعلیکم السّلام'۔"

"مِل آئیے ان سے۔ بڑے قابل ڈاکٹر ہیں۔ ان کی کافی پریکٹس ہے۔ سالہا سال سے پریکٹس کر رہے ہیں۔"

"معاف کیجیے مَیں ان کا قائل نہیں جو اب تک پریکٹس ہی کر رہے ہیں۔ مَیں تو ایکسپرٹ لوگوں میں اعتقاد رکھتا ہوں۔"

"یہ لیجیے سگرٹ۔"

"شکریہ۔ کون سا ہے؟"

"رُوسی سگریٹ ہے۔ میرا لڑکا فرانس سے بھیجا کرتا ہے۔ گھٹیا سگریٹ تو مَیں بِلکُل

نہیں پی سکتا۔ میرے خیال میں سگریٹ کے برانڈ کا اثر پینے والے پر ضرور پڑتا ہے۔ میرا بھتیجا قینچی مارکہ سگریٹ پیا کرتا ہے اور ہر وقت اس کی زبان کتر کتر چلتی ہے۔ مَیں خود چند سال پہلے کیمل سگریٹ پیا کرتا تھا۔ ایک روز مَیں نے محسوس کیا کہ سچ مچ میرا قد بڑھتا جا رہا ہے۔ مَیں نے فوراً وہ سگریٹ چھوڑ دیا۔"

"آپ درست فرماتے ہیں۔ میرے ایک دوست بالکل دبلے پتلے تھے۔ جب سے انہوں نے ہاتھی مارکہ سگریٹ پینے شروع کیے، وہ اس قدر موٹے ہو گئے ہیں کہ پہچانے نہیں جاتے۔"

"ویسے یہ روسی سگریٹ پیتے پیتے بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ مَیں کمیونسٹ بنتا جا رہا ہوں لیکن یہ نرا وہم ہی ہوگا۔"

"غالباً ہم فنونِ لطیفہ کا ذکر کر رہے تھے۔ کیا آپ کو شاعری سے بھی دلچسپی ہے؟"

"مَیں تو شاعری پر مفتون ہوں۔ مجھے فارسی شاعری بہت پسند ہے۔ وہ کیا شعر ہے ؎

میز پوشِ بہ لبِ بام نظر می آید
نہ بہ زورے نہ بہ زارے نہ بہ زر می آید"

"کیا کہنے ہیں فارسی شعروں کے لیکن اپنے شعر بھی کچھ کم نہیں۔ غالبؔ کا وہ شعر تو آپ نے سُنا ہوگا ؎

کچھ تو کھائیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہُوا"

"خوب ہے۔ اور وہ کس کا شعر ہے ؎

پیٹ میں درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیئے کیا یاد آیا"

"شاید یہ اسی شاعر کا ہے جس کا یہ شعر ہے ؎

ناحق ہم لنگوروں پر ہے تہمت خود مختاری کی
اور پتہ نہیں کیا ہوا کہ چاچا جب بدنام کیا"

"کل مَیں نے ریڈیو پر ایک نہایت دردناک غزل سُنی ــــ بلّیو مت رو یہاں آنسو بہانا ہے منع۔"

"غالباً فلمی چیز ہوگی ــــ دیکھیے نا اس میں لطافت غائب ہے۔ آنسو بہانا ہے منع۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہاں سگریٹ پینا منع ہے۔"

"آپ درست فرماتے ہیں۔"

اسی کمرے میں ذرا دُور دو اور حضرات بیٹھے ہیں۔ شراب تو ایک طرف یہ سگریٹ بلکہ لیمونیڈ تک نہیں پیتے۔

"مَیں برسوں سے اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہا ہوں۔"

"کبھی آپ نے اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہوئے پکڑا نہیں؟"

"ہرگز نہیں۔ مَیں بہت چالاک ہوں۔"

"میں مدّتوں سے سیلون (CEYLON) جانا چاہتا ہوں۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے۔"

"تو آپ کو منع کون کرتا ہے؟"

"آپ نہیں سمجھتے، میرے حالات کچھ ناتسلی بخش ہیں۔ ویسے ہیں بالکل معمولی سے، اور ان کے درست ہونے میں کوئی زیادہ دیر بھی نہیں لگے گی ــــ فقط مجھے چھ لڑکوں اور پانچ لڑکیوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ مکان بنوانا ہے۔ قرض اتارنا ہے۔ زمینیں خریدنی ہیں۔ چھوٹی سی جائداد بنانی ہے۔ بس۔"

"مگر سیلون جانے سے ان کا تعلق؟ میرے خیال میں آپ ابھی وہاں جا سکتے ہیں۔"

"جی نہیں ۔ مَیں فی الحال وہاں ہرگز نہیں جا سکتا۔ ابھی کچھ عرصہ لگے گا۔"

"آپ ابھی جا سکتے ہیں۔ اسی وقت۔ مَیں خود آپ کو اپنے ساتھ سیلون لے چلوں گا۔ یا ہم حجام کو یہیں کیوں نہ بُلا لیں۔"

"افوہ۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ مَیں اس سیلون کا ذکر نہیں کر رہا۔ مَیں لنکا کا ذکر کر رہا ہوں۔"

"اوہ۔ لنکا کا ذکر۔ آپ نے میرے منہ کی بات چھین لی، میری بھی یہی آرزو ہے۔ لنکا جانا میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہے۔ مَیں نے باقی سب تیاریاں کر رکھی ہیں، فقط ایک معمولی سی کسر باقی ہے۔"

"کیا؟"

"فقط روپوں کا انتظار ہے۔ ویسے میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس سال کے اختتام تک مجھے کہیں سے پچاس ساٹھ ہزار روپے ضرور مل جائیں گے۔"

"آپ نے کسی کاروبار میں روپیہ لگایا ہے یا حصے خریدے ہیں؟"

"نہیں تو۔"

"یا کسی نے آپ سے قرض لے رکھا ہے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر؟"

"بس ویسے ہی مجھے ایک عجیب سا احساس رہتا ہے کہ کسی دن جاتے جاتے مجھے راستے میں پچاس ساٹھ ہزار روپے مل جائیں گے یا کسی روز صبح اُٹھوں گا تو تکیے کے نیچے روپے رکھے ہوں گے یا کوئی چپکے سے میرے کوٹ کی اندرونی جیب میں روپے رکھ جائے گا اور جب یہ روپے مل گئے تو مَیں سیدھا لنکا کا رُخ کروں گا اور بقیہ عمر وہیں گزاروں گا۔"

"میرا ابھی یہی پروگرام ہے۔ وہاں تو ہم ملا کریں گے۔ آپ وہاں کلب کتنے بجے آیا کریں گے؟"

"یہی کوئی دوپہر کے لگ بھگ —— اور پانچ بجے واپس چلا جایا کروں گا۔ اور آپ؟"

"میں شام کو آیا کروں گا۔ کوئی چھ بجے کے قریب۔"

"تب تو ملاقات ہونی مشکل ہے۔ آپ ذرا پہلے نہیں آ سکتے؟"

"وہی مشکل ہے۔ اگر آپ کچھ دیر اور ٹھہر جایا کریں۔ پانچ کی بجائے سات بجے چلے جایا کریں۔"

"کلب میں شام کو شور و غل شروع ہو جایا کرے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اتنی دیر تک نہ ٹھہر سکوں گا۔"

"تب تو مَیں بہت اُداس رہا کروں گا۔ کاش کہ آپ کچھ دیر اور ٹھہر سکتے۔"

"تو آپ ہی ذرا جلدی آ جایا کریں۔"

"شاید مَیں اتنی جلدی نہیں آ سکوں گا۔ دیکھیے آپ اتنی سی بات نہیں مانتے۔ اچھا چلیے ساڑھے پانچ بجے سہی۔"

"اچھا۔ دیکھوں گا، مگر وعدہ نہیں کرتا۔ بہتر تو یہی ہوتا کہ آپ پانچ بجے آ جاتے۔"

"چلیے پانچ بج کر پینتیس منٹ سہی۔ بس؟"

"اچھا۔ مگر دیکھیے نا ——"

ایک معمّر حضرت سہ پہر سے جو پینا شروع کرتے ہیں تو آدھی رات تک پیتے رہتے ہیں۔ ان کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں۔ روایات مختلف ہیں، لیکن

سب کا لُبِ لباب یہ ہے کہ ان کی زندگی میں ٹریجڈی کو بہت دخل ہے اور وہ سدا کے غمگین ہیں۔ آج تک کسی نے انہیں مسکراتے نہیں دیکھا۔ تقدیر نے ان کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا ہے۔ زندگی نے ان کے ساتھ غداری کی ہے اور یہ کہ آج تک انہوں نے اپنی زندگی کی المیہ داستان کسی کو بھی نہیں سنائی۔

ایک شام کو نہ جانے کیوں مجھ پر مہربان ہو جاتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ میں نے ان کا جلتا ہوا سگار قالین سے اٹھا کر انہیں دے دیا۔ یا اس لیے کہ وہ شراب کی بوتل انگیٹھی پر بھول آتے اور میں نے اُٹھا کر پکڑا دی۔

ہم دونوں ایک تنہا گوشے میں بیٹھے ہیں۔ وہ بے تحاشا پی رہے ہیں میں ان سے ان کی زندگی کے متعلق سوال پوچھتا ہوں۔

"پہلے وعدہ کرو کہ یہ داستانِ تلخ سُن کر تم ہمدردی کا اظہار نہیں کرو گے جب کوئی مجھ سے اظہارِ ہمدردی کرتا ہے تو میرے لیے زندگی کا ایک ایک لمحہ کٹھن ہو جاتا ہے۔ تو سُنو۔ آج سے دس سال پہلے میں بے حد مسرور انسان تھا۔ آہ کیسے دن تھے وہ بھی۔ دنیا مجھ پر رشک کرتی تھی۔ سب یہی کہتے تھے کہ اس شخص کی مسکراہٹ میں سورج کی کرنوں کی سی چمک اور تازگی ہے۔ ان دنوں میرے پاس ایک ہرن تھا۔ کیا بتاؤں کیسا حسین اور پیارا ہرن تھا۔ ہم دونوں میں اتنا پیار تھا کہ میں اُسے دیکھ کر جیتا تھا اور وہ مجھے دیکھ کر۔ ان دنوں میں افریقہ میں تھا اور بے حد خوش تھا۔ پھر وہ منحوس رات آئی۔ جب میں نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔ میں نے نیا ملازم رکھا تھا۔ رات کو جاتے وقت وہ کم بخت ہرن کو باندھتا گیا۔ پہلے اسے کبھی نہیں باندھا گیا تھا۔ رات کو خدا جانے بھیڑیے آئے یا کیا بلا آئی۔ اگر ہرن آزاد ہوتا تو وہ کسی کو اپنے پاس بھی نہ آنے دیتا۔ علی الصبح میں نے اُٹھ کر دیکھا تو ہرن اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے دنیا اندھیر ہو گئی۔ مدتوں میں بے چین و بے قرار پھرتا رہا۔"

انہوں نے گلاس بھرا اور پینے لگے۔

"لیکن انسانی دل ایسی چیز ہے جو بہلائے سے بعض اوقات بہل جاتی ہے۔ ہرن کی جگہ ایک اور ہستی نے لے لی۔ یہ ایک طوطا تھا جسے میں سپین سے گزرتے وقت لایا تھا۔ یہ طوطا بس نام کو طوطا تھا۔ ویسے انسانوں سے بہتر تھا۔ ہم گھنٹوں بات چیت کیا کرتے۔ اس طوطے کو ادب سے لگاؤ تھا۔ میں اسے نظمیں سُناتا جنہیں وہ بار بار دہراتا۔ قصہ مختصر اس طوطے نے میری زندگی کو دوبارہ جینے کے قابل بنا دیا لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک دن طوطے کے پنجرے کے ساتھ میری گرم یونیفارم ٹنگی ہوئی تھی طوطے نے اس کا کچھ حصہ کتر ڈالا اور مجھ بدنصیب کو اتنی سی بات پر اتنا غصہ آیا کہ اسے بُرا بھلا کہا، ڈانٹا۔ ایک تنکے سے کچھ پیٹا بھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے اس نے اپنا سر سلاخوں سے باہر نکالا چونچ سے پنجرے کے دروازے کی کیل نکالی اور پھر سے اُڑ کر ایک درخت پر جا بیٹھا۔ میں نے اس کی بڑی منتیں کیں۔ پرانی رفاقت کا واسطہ دلایا۔ معافی مانگی، قسمیں کھائیں، وعدے کیے لیکن اس وحشیانہ سلوک سے اُس کا ننھا سا دل ٹوٹ چکا تھا۔ وہ اُڑ گیا۔ اور پھر کبھی نہ آیا۔ اس کے بعد میرا کیا حال ہوا۔ میں دن رات نشے میں رہنے لگا۔ میں نے شراب کے علاوہ اور منشیات بھی شروع کر دیں۔ جھوٹ بولنا شروع کر دیا۔ ذرا ذرا سی بات پر غصہ آنے لگا میری صحت بالکل گر گئی۔ ترقی رک گئی۔ میرا وہاں سے تبادلہ ہو گیا۔"

انہوں نے خالی گلاس پھر بھرا۔

"میں سمجھتا تھا کہ میرے لیے دُنیا ختم ہو چکی ہے لیکن زندگی میں پھر بہار آئی۔ میں پھر مسکرانے لگا۔ اس خوشگوار تبدیلی کی وجہ وہ پیاری پیاری دلآویز بطخیں تھیں جنہیں میں چین سے لایا تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ وہ بطخیں مجھے کس قدر عزیز تھیں۔ جب وہ چونچ موڑ کر کنکھیوں سے مجھے دیکھتیں تو میرا رواں رواں مسرت سے رقص کرنے لگتا۔ سیروں خون بڑھ جاتا۔ شام کو ہم تینوں سیر کرنے جاتے۔ میں پھر تندرست و توانا ہو گیا اور بڑی

سرگرمی سے اپنا کام کرنے لگا۔ لیکن قسمت کو میری یہ مسرت ایک آنکھ نہ بھائی۔ زندگی کی ٹھوکروں نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ بسا بسایا گھر اُجڑ گیا۔ اس مرتبہ اس کی ذمہ دار میری بیوی تھی جو اسی صبح اپنے وطن سے آئی تھی۔ اسے شکار کا شوق تھا۔ شام کو بندوق لے کر نکلی اور اسے شکار ملا تو گیا۔ وہی پیاری بطخیں جو جھیل پر تفریح کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ مَیں نے اپنی بیوی کا یہ گناہ کبھی معاف نہیں کیا۔ مَیں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔ ایسی پیاری بطخیں۔ ایسے پیارے رفیق زندگی میں صرف ایک مرتبہ آیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد مَیں نے جُوا کھیلنا شروع کر دیا۔ دوستوں کو دھوکا دینے لگا۔ اپنا غم غلط کرنے کے لیے مَیں نے کیا کچھ نہیں کیا۔"

ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے دوسری بوتل کھولی۔

"زندگی کی تلخ کامیوں کی داستان شاید ابھی ادھوری تھی۔ ابھی تقدیر کو اور کچوکے لگانے تھے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا پھر ملا۔ زندگی سوتے سوتے جاگ اٹھی اور دنیا مسکرانے لگی۔ میری زندگی میں ایک کُتا آیا۔ بے حد حسین و جمیل کُتا۔ نیک، وفادار، سمجھنے والا۔ اُس نے میرے صبح و شام بدل دیے۔ مَیں پرانے غم ایک حد تک بھُول گیا لیکن یہ سب کچھ عارضی تھا۔ میرا یہاں تبادلہ ہُوا اور مجھے ہوائی جہاز سے آنا پڑا۔ کُتا سکاٹ لینڈ میں رہ گیا جب میرا کنبہ لندن سے آیا تو ان کم بختوں میں سے کسی کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ میرے عزیز از جان پیارے کتے کو ساتھ لے آتا۔ مَیں نے تار دیے۔ رقم بھیجی۔ آخر کتا سمندر کے راستے سکاٹ لینڈ سے روانہ ہوا۔ جہاز والوں کی غلطی سے کتے کو کلکتے کی جگہ بمبئی اتار لیا گیا۔ مَیں خود کتے کو لینے کلکتے گیا اور مایوس لوٹا۔ پھر پتہ چلا کہ وہ بمبئی میں ہے۔ مَیں نے اسی روز اپنے بڑے لڑکے کو بمبئی بھیجا۔ وہ ناہنجار، بے ایمان لڑکا فرسٹ میں گیا، فرسٹ میں آیا، اتنی رقم ضائع کی لیکن کتے کا اتنا سا بھی خیال نہ رکھا۔ نہ اس کے آرام کی پروا کی، نہ اس کی خوراک میں احتیاط برتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کتے کی طبیعت جو سفر کی صعوبتوں کی وجہ سے پہلے ہی ناساز تھی،

بالکل علیل ہو گئی اور یہاں پہنچتے پہنچتے اُس نے دم توڑ دیا۔ اب کیا بتاؤں، مَیں زندگی کس طرح گزار رہا ہوں۔ بس دن پورے کر رہا ہوں۔ یوں تو میرے بچے ہیں، بیوی ہے، دوست ہیں۔ میرے پاس سب کچھ ہے۔ لیکن مجھے کسی چیز سے بھی دلچسپی نہیں۔ میرے لیے دن بھی اتنا ہی تاریک ہے جتنی کہ رات۔ مجھ سا بدنصیب تو زمانے میں نہ ہو گا۔"

ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔

یہ ان دنوں کا بھی ذکر ہے۔ جب مَیں کلب جانے سے پہلے گھنٹوں سوچا کرتا تھا کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ کیا سوشل بننا واقعی ضروری ہے۔ کیا مَیں اپنا فالتو وقت کسی اور طرح نہیں گزار سکتا۔

تمنّا

تمنّا وہ لڑکی تھی جسے جنوبی ایران میں پہلے میں نے دیکھا تھا۔ لیکن جب شیطان نے اسے شمالی ہندوستان میں دیکھا تو فوراً عاشق ہو گئے۔

جب شیطان نے مجھے تار دے کر چاء پر مدعو کیا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کسی پر عاشق ہو گئے ہیں۔ ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ تار دے کر مدعو کیا کرتے ہیں۔ سہ پہر کو مَیں وہاں پہنچا۔ وہ حسب معمول مجھے سٹیشن پر نہیں ملے۔ ان کے گھر پہنچ کر مَیں نے انہیں ہر جگہ ڈھونڈا، سوائے اس جگہ کے جہاں وہ تھے۔ دیر کے بعد مجھے خیال آیا کہ چھت پر دیکھوں۔ کیونکہ عاشق ہونے کے بعد شیطان اکثر چھت پر ٹہلا کرتے ہیں۔ اُوپر پہنچ کر دیکھا کہ وہ فرش پر بیٹھے ہیں۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں بیٹھنے کے لیے کوئی اور چیز نہیں تھی۔

جب وہ اپنے عشق کی داستان سنا رہے تھے تو مَیں خاموش بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ میرے خیال میں ان کی یہ حرکت بالکل فضول تھی اور ان کی باتوں کا نہ سر تھا نہ پیر۔ لیکن مَیں نے ان لطیف جذبات کا اظہار نہیں کیا۔

جب انہوں نے ناکامی کی صورت میں اپنے آپ کو اس دنیائے فانی سے ڈسمس کر دینے کی دھمکی دی تو مَیں چونکا۔

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟" مَیں نے اخبار کو تہہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے مدت سے ایسی لڑکی کی تلاش تھی جو تعلیم یافتہ ہو، سلیقہ شعار ہو، اور خوبصورت ہو۔"

"تو یہ کیوں نہیں کہتے کہ تمہیں تین لڑکیوں کی تلاش تھی۔"

"دفعتہً مجھے وہ لڑکی مل گئی! مَیں موٹر سائیکل پر جا رہا تھا۔ راستے میں مَیں نے اس کی پُشت دیکھی جو بلا شبہ دُنیا کی حسین ترین پُشت تھی۔ مَیں نے قریب جا کر لفٹ کے لیے پوچھا اور کہا کہ مَیں آپ ہی کے راستے جا رہا ہوں۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور غش کھاتے کھاتے بچا۔ پھر مَیں نے کہا کہ مَیں اس جگہ اجنبی ہوں کیا آپ اپنے مکان تک میری رہنمائی کر دیں گی؟ اُس نے اپنے گھر کا مفصّل پتا بتا دیا اور بولی۔ خبردار جو میرا تعاقب کیا ہے تو۔ اس کے بعد جو کچھ ہُوا وہ اس شعر سے ظاہر ہے ؎

از بال و پرِ غبارِ تمنّا فشردہ ایم
بر شاخِ گُل گراں نہ بود آشیانِ ما"

انہوں نے یہ شعر بالکل بے موقعہ پڑھا تھا۔ غالباً انہیں اس کے معنی بھی نہیں آتے تھے۔ محض اس لیے پڑھ دیا کہ فارسی کا شعر تھا اور اس میں تمنّا کا ذکر تھا۔

انہوں نے مجھے تمنّا کی تصویریں دکھائیں۔ مَیں نے بتایا کہ مَیں اسے واجبی طور پر جانتا ہوں اور وہ حسین ہرگز نہیں ہے۔

"وہ حسین ضرور ہے اگر اسے ایک خاص زاویے سے دیکھا جائے۔"

"وہ زاویہ کون سا ہے؟"

"اس کے صرف چند پوز اچھے نہیں آتے۔ ایک سامنے کا، ایک سائڈ کا اور ایک

ترچھے رُخ سے لیا ہُوا۔ بس۔ ان کے علاوہ باقی سب پوز نہایت حسین آتے ہیں۔"

اتنے میں ایک بزرگ تشریف لے آئے جو پولیس میں ملازم تھے۔ انہوں نے اپنے تھانے کے بڑے دروازے پر "خوش آمدید" لکھ رکھا تھا۔ اور "کبھی تھانے میں تشریف لائیے" ان کا تکیہ کلام تھا۔

ان کے آنے پر موضوع بدل گیا اور خانگی قسم کی گفتگو شروع ہو گئی۔ مِلٹن، گاربو اور شیکسپیئر کا ذکر چھڑ گیا۔

اگلے روز شیطان مجھے تلخؔ صاحب کے ہاں لے گئے۔ راستے میں مجھے معلوم ہُوا کہ خوش قسمتی سے شیطان کی ملاقات دُنیا کی عظیم ترین ہستی سے ہو گئی ہے۔ تلخ صاحب سماج کے سب سے بڑے باغی ہیں۔ ملک کے سب سے بڑے انسان ہیں۔ ان کی تحریروں میں جادو ہے۔ ان کے قلم میں زہر ہے۔

پیچ دار راستوں سے اور تنگ گلیوں سے گزر کر ہم ایک بوسیدہ سے تاریک مکان میں پہنچے، جہاں ایک مُنحنی سا زرد رُو سیکنڈ ہینڈ انسان عینک لگائے کچھ لکھ رہا تھا۔ سامنے چند حضرات بیٹھے اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ایک کونے میں ایک مریل سا کتّا بیٹھا دُم ہلا رہا تھا۔

شیطان نے میرا تعارف کرایا۔

"آپ نیشنلسٹ ہیں یا سوشلسٹ؟" اس شخص نے پوچھا۔

"پتہ نہیں"۔ مَیں نے جواب دیا۔

"تو پھر امپیریلسٹ ہوں گے۔"

"جی نہیں۔"

"تو پھر آپ ہیں کیا؟"

"انسان ہوں۔"

"آپ انسان ہرگز نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ کم از کم کمیونسٹ نہ ہوں۔"

"ان سب میں فرق کیا ہے؟"

"تو گویا آپ کو فرق بھی معلوم نہیں، غضب خدا کا۔"

"سچ مچ۔ مَیں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ ایک رائیلسٹ ایک مارکسسٹ سے کیوں خفا ہے؟ ایک فاشسسٹ ایک انارکسٹ سے اچھی طرح کیوں نہیں پیش آتا۔ رئیلسٹ کیوں علیحدہ رہتے ہیں؟"

"چچ چچ چچ ــ ہمارے نوجوان کس قدر بے بہرہ ہیں، کتنے افسوس کی بات ہے۔"

"تلخ صاحب۔ انہیں چھوڑیے۔ اپنا مضمون سُنائیے۔" ایک صاحب بولے۔

تلخ صاحب نے اپنا مضمون شروع کیا۔ "دنیا کی سب سے بڑی لعنت بیوروکریسی ہے جو کسی بیمار دماغ کا بیمار خواب معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ ڈیموکریسی اس سے بھی بڑی آفت ہے، مگر میرا خیال ہے کہ اگر آج ڈپلومیسی کا خاتمہ ہو جائے تو دنیا میں امن پھیل جائے۔ سچ پوچھیے تو دنیا کی بیہودہ ترین چیز ارسٹوکریسی ہے۔ اور ــ"

"لیکن آپ کی کوئی پالیسی ہونی چاہیے۔" مَیں ڈرتے ڈرتے بولا۔

"مَیں پالیسی کے بھی خلاف ہوں۔ پالیسی پر لعنت ہے۔ مَیں باغی ہوں مَیں سماج کے خلاف ہوں۔ اس فرسودہ نظام کے خلاف ہوں۔ نظامِ شمسی کے خلاف ہوں۔ زمین و آسمان، اس خدائی کے خلاف ہوں۔ لوگ مجھے دہریہ سمجھتے ہیں۔ ہاں مَیں دہریہ ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ مَیں دہریہ ہوں۔ ذرا سوچیے تو سہی کہ کس نے

میری زندگی سے لطافتیں چھین لیں۔ کس نے میری ناک پر عینک لگا دی۔ کس نے میرا ہاضمہ تباہ کر دیا۔ کس نے اس کمرے میں مکڑی کے جالے لگا دیے۔ کس نے میرے معصوم کتّے کا یہ حال کر دیا کہ وہ بعض اوقات مجھے پہچانتا بھی نہیں، اجنبی سمجھتا ہے۔ یقیناً یہ کسی کا قصور ہے۔ اس کہنہ نظام اور اس فرسودہ خدائی کا قصور ہے۔"

واپسی پر شیطان نے بتایا کہ وہ تلخ صاحب کے ساتھ مل کر ایک رسالہ نکال رہے ہیں جس کا نام تمنا رکھیں گے۔

بڈی اپنی بیہودہ سی موٹر میں آیا جس کی ہر چیز شور مچاتی تھی سوائے ہارن کے۔ سپیڈو میٹر عرصے سے کام نہیں کر رہا تھا۔ رفتار یوں معلوم کی جاتی تھی کہ بیس میل فی گھنٹے پر دہنا مڈگارڈ ہلتا تھا۔ پچیس میل پر بایاں اس کا ساتھ دیتا۔ تیس میل پر فٹ بورڈ تھرتھرانے لگتا اور پینتیس پر سب کچھ۔ اس سے زیادہ تیز نہ غالباً موٹر چل سکتی تھی نہ ہم اسے چلانے دیتے تھے۔

موٹر میں اس قدر بھیڑ ہوتی کہ یہ معلوم کرنا محال ہو جاتا کہ اسے چلا کون رہا ہے۔ وہیل کسی کے ہاتھ میں ہے۔ بریک پر کسی کا پاؤں ہے تو کلچ پر کسی کا۔ ذرا ذرا دیر کے بعد غل مچتا۔ "میں گیئر بدلوں گا، تم ذرا کلچ دبانا۔" "ذرا بریک دبانا، مَیں موڑنے لگا ہوں۔"

تلخ صاحب کے اعزاز میں پارٹی ہو رہی تھی جس میں تمنا خانم بھی اپنے عزیزوں سمیت مدعو تھیں۔ ہم وہاں پہنچے تو صرف چند ترقی پسند شعرا اور ادیب بیٹھے تھے۔ تلخ صاحب اور خواتین کا انتظار ہو رہا تھا۔ ایک ادیب شیطان کے پرانے ہم جماعت نکلے۔ انہیں

دیکھتے ہی اُچھل پڑے۔"ان چند سالوں میں تم کتنے بدل گئے ہو؟ مَیں نے صرف تمہارے ہیٹ سے پہچانا۔"

"یہ ہیٹ بڑا دیرپا اور مضبوط ہے۔ کئی مرتبہ کھویا گیا، بدلا گیا، ضائع ہو گیا۔ پھر بھی ویسے کا ویسا رہا۔" شیطان نے بتایا۔

رسالے کی باتیں ہونے لگیں۔ شیطان بولے۔"رسالے کے سرورق پر یہ ضرور لکھا جائے۔ بیادگار تمنّا خانم۔"

مَیں نے انہیں بتایا کہ بیادگار تو تب لکھتے ہیں جب کسی کا انتقال ہو جائے۔

"تو پھر۔ زیرِ سرپرستی تمنّا خانم۔ لکھا جائے۔"

"اس سے بزرگی ٹپکتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے تمنّا خانم ساٹھ ستّر برس کی ہوں۔"

"رسالے کا نام صرف تمنّا رکھا جائے۔" بڈی نے مشورہ دیا۔

ایک صاحب جو رسالے کے ہونے والے منیجر تھے، فائل کھولنے لگے۔

"حضرات مَیں نے رسالے کے کچھ قواعد و ضوابط مرتب کیے ہیں۔ سنیئے۔ نمبر ایک یہ ماہنامہ ہر ماہ کی آخری تاریخ کو شائع ہو گا۔ نمبر دو۔ مضمون نگار حضرات سے التماس ہے کہ فی الحال مضمون بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نمبر تین۔ صرف ترقی پسند اشتہار شائع کیے جائیں گے۔ نمبر چار۔ دفترات کے تین بجے بند کر دیا جائے گا، اس کے بعد کوئی صاحب تشریف نہ لائیں۔ نمبر پانچ۔ دُکھ پہنچانے والی تنقیدیں اور دلآزار مضامین اکثر شائع ہُوا کریں گے۔"

"اور نقصان کی صورت میں نفع برابر برابر تقسیم کیا جائے گا۔ اسے نمبر چھ رکھیے۔" ایک صاحب جو مالی امداد دے رہے تھے بولے۔

"یہ فیصلہ باقی ہے کہ اسے مصوّر مجلّہ بنایا جائے یا نہیں۔ یہ دیکھیے مَیں چند تصویریں

لایا ہوں۔" مستقبل کے منیجر نے کہا۔

ایک ترقی پسند تصویر پر شیطان چونک پڑے۔"اس کا مصوّر کون ہے؟"

"ریمبرآنٹ۔"

"یہ تصویر ضرور چھاپی جائے۔ آپ ریمبرانٹ صاحب سے اس کا سودا کر لیجیے۔"

"ان کا تو انتقال ہو چکا ہے۔"

"افوہ، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ بات یہ ہے کہ مَیں ان دنوں اخبار نہیں پڑھتا۔"

"ان کے انتقال کو تو مُدّتیں گزر چکی ہیں۔" کسی نے بتایا۔

بڈی نے مشورہ دیا کہ بالکل نئی وضع کا پرچہ نکالا جائے جس میں ہر قسم کے مضامین ہوں۔ افسانوں کا علیحدہ حصّہ ہو، ٹھوس مضامین کا علیحدہ، غزلیں اور نظمیں علیحدہ ہوں، اسی طرح خواتین کے لیے بھی کچھ جگہ چھوڑی جائے۔ سب نے اس تجویز کو پسند کیا۔ طے ہُوا کہ ہر حصّے کا علیحدہ اڈیٹر مقرر ہو جیسے امریکن رسالوں میں ہوتا ہے۔ اس پر امریکہ کی باتیں ہونے لگیں۔ ایک بزرگ بڈی سے بولے۔"بھئی تمہاری فلموں سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہاں یا تو کاؤبوائے ہوتے ہیں یا GANGSTER۔" "ہمارے ہاں بھی آپ کے ملک کے متعلق طرح طرح کی الٹی سیدھی باتیں مشہور ہیں کہ یہاں یا تو راجے مہاراجے رہتے ہیں یا سادھو اور فقیر۔ لوگ اُڑن کھٹولوں پر سفر کرتے ہیں اور ہر وقت بین بجاتے ہیں۔ ہاتھی، شیر، چیتے، گلیوں میں چہل قدمی کرتے ہیں۔ مَیں خود اس علاقے میں آنے سے پہلے صرف دو ہندوستانیوں کو جانتا تھا۔ مہاتما گاندھی کو اور فلم سٹار SABU کو۔ کیا واقعی یہاں حرم ہوتے ہیں؟ اور لوگ کئی کئی بیویاں رکھتے ہیں؟"

"آپ کے ہاں ایک معمولی حیثیت کا شخص کتنی بیویاں رکھ سکتا ہے؟"

"ایک ــ وہ بھی بڑی مشکل سے۔"

"یہاں تو پھر بھی مقابلتاً غربت ہے۔ آپ خود شادی شدہ ہوں گے، آپ کو تجربہ ہو گا۔"

"جی نہیں۔ مَیں کنواری ہوں۔" بڈی نے شرما کر بتایا۔ "دراصل مجھے اب تک کسی سے محبت نہیں ہوئی، اس لیے شادی نہیں کی۔ بھلا آپ دونوں کیوں بیرنگ ہیں؟"

"تمہارے ملک میں محبت کرنا جتنا آسان ہے اتنا ہی یہاں مشکل ہے۔ ہندوستان میں محبت کرتے وقت سب سے پہلے مذہب آئے گا۔ اگر دونوں فریق ہم مذہب ہیں تو محبت ہو سکے گی ورنہ ہرگز نہیں۔ آپ سر پٹخیے، اپنا سینہ کوٹیے، خودکشی کر لیجیے۔ لیکن آپ کسی غیر مذہب سے محبت نہیں کر سکتے۔ مذہب کے بعد ذات پات آئے گی اور پھر اقتصادیات کا قضیہ یعنی آپ کی مالی حالت۔ پھر اونچے گھرانے اور نیچے گھرانے کا سوال ہوگا۔ اور آخر میں سب سے اہم نکتہ آئے گا۔ اباجان! ہندوستان میں اباجان کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر اتنی رکاوٹوں کے باوجود آپ میں محبت کرنے کا حوصلہ ہے تو ـــ"

"اونچے گھرانے سے تمہاری مراد وہ لوگ تو نہیں جو اُوپر کی منزل میں رہتے ہیں؟" بڈی نے پوچھا۔

"نہیں۔ بلکہ وہ لوگ جن کی مالی حالت اچھی ہے۔"

"مَیں نے ہندوستانی فلمیں دیکھی ہیں۔ میرے خیال میں یہاں پرندوں کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ پرندوں پر گانے گائے جاتے ہیں۔ پرندوں کو دیکھ کر ہیرو کو ہیروئن یاد آجاتی ہے اور ہیروئن کو کوئی اور۔ پرندے چاہیں تو کہانی کا رُخ بدل سکتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ پرندوں کو انسانوں سے ذرا سی بھی دلچسپی نہیں، اور یہ ہماری اتنی سی پروا نہیں کرتے۔"

"تمہارے ہاں آب و ہوا کس قسم کی ہے؟ وہاں کے ذرائع آمد و رفت، برآمد و درآمد، ذرائع معاش بیان کرو۔" ایک صاحب جو جغرافیے کے اُستاد تھے بولے۔

"جہاں میرا گھر ہے وہاں کی آب و ہوا ایسی عجیب ہے کہ نہ آب کا یقین ہے نہ ہوا کا

اعتبار۔ صبح لُو چل رہی ہے تو شام کو برف پڑ رہی ہے۔ مشہور تھا کہ ایک رات اتنی سردی پڑی کہ سڑکوں پر ایستادہ آہنی مجسّمے کانپنے لگے اور انہوں نے اپنے ہاتھ اپنی جیبوں میں چھپا لیے۔ ایک برف کا بنا ہوا مجسمہ بھاگ کر سامنے کے مکان میں جا چھپا۔ ایک روز برفباری ہوئی۔ مَیں اپنے بھائی کے ساتھ باہر گیا۔ اچانک اتنی تیز دھوپ نکلی کہ ہم باری باری ایک دوسرے کے سائے میں بیٹھے تھے۔ ایک اور واقعہ مشہور ہے۔ ہمارے گاؤں کے باہر ایک جھیل ہے۔ ایک تیراک نے اونچی چوٹی سے اس میں چھلانگ لگائی۔ ذرا نیچے آکر اسے پتہ چلا کہ پانی خشک تھا اور پتھر نظر آرہے تھے۔ وہ بڑا سٹپٹایا۔ دیکھتے دیکھتے ایک بادل آیا، برسا اور جھیل میں پانی بھر گیا۔ لیکن اتنی سردی ہو گئی کہ پانی یخ ہو گیا۔ چھلانگ لگانے والے کا اور بھی بُرا حال ہو گیا۔ دفعتہً سورج نکل آیا، فوراً برف پگھل گئی اور اس نے چھلانگ پانی میں لگائی۔ لیکن جب وہ کنارے پر پہنچا تو اتنی گرمی ہو گئی تھی اسے سرسام ہو گیا۔"

"آپ امریکن زندگی کے متعلق ایک مضمون لکھیے۔ اس رسالے کے لیے۔" ہونے والے منیجر بولے۔

"وہاں کے سکولوں کی زندگی کے متعلق بھی کچھ بتائیے۔" وہی اُستاد بولے۔

"ہمارا اسکول دریا کے کنارے تھا۔ سردیوں میں دریا جم جاتا۔ ہم لوہے کے خاص جُوتے پہن کر بازوؤں سے بادبان باندھ کر برف پر ہوا کے زور سے پھسلتے اور دُور دُور چلے جاتے۔ گرمیوں میں ایک چھوٹی سی کشتی لے کر نکل جاتے اور کئی کئی دنوں کے بعد لَوٹتے۔ دریا کے کنارے کنارے لکھ پتی تاجروں کی کوٹھیاں تھیں۔ عین ان کے سامنے ہم بڑی استادی سے ہچکولے دے کر کشتی کو خود ڈبوتے۔ وہ لوگ گھبرا کر ہمیں دریا سے نکالتے اپنے ہاں لے جاتے۔ بڑی خاطر تواضع ہوتی۔ ایک مرتبہ غلطی سے ہم نے کسانوں کے مکان کے سامنے کشتی اُلٹا دی۔ انہوں نے نکالا تو سہی لیکن خوب کان مروڑے، ڈرایا دھمکایا کہ اگر کشتی چلانی نہیں آتی تو باہر کیوں نکلتے ہو۔ جب موسم خوشگوار ہوتا تو ہڑتالوں کا موسم شروع

ہو جاتا۔ خفیہ جلسے ہوتے۔ یہ طے کیا جاتا کہ کس بہانے ہڑتال کی جائے۔ بعض اوقات ہوسٹل کی اُوپر کی منزل آگ کے شعلوں اور دھوئیں سے بھر جاتی۔ اُونچی منڈیروں پر ننھے بچے چہل قدمی کرتے۔ ہجوم اکٹھا ہو جاتا۔ دفعتہً "آگ، دُھواں، بچے" سب غائب ہو جاتے۔ آگ اور دُھواں سائنس کے طلبا ادویات سے پیدا کرتے تھے۔ سکول کے پستہ قد لڑکوں کو بچّوں کے کپڑے پہنا کر اُوپر بھیج دیا جاتا۔ نیچے سے وہ بالکل ننھے منے معلوم ہوتے۔ سکول کے بڑے ہال میں جھوٹ بولنے کا مقابلہ ہوتا۔ ایک مرتبہ مَیں نے یہ مقابلہ صرف ایک فقرے سے جیت لیا۔ مَیں نے کہا کہ مَیں نے آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"

"اور آپ کے اُستاد۔ وہ کس قسم کے تھے؟"

"خوب تھے۔ ایک استاد اپنے ساتھ ہر صبح کوئی آٹھ دس سٹون پختہ کتابیں لایا کرتے اور ہر شام واپس لے جاتے۔ سکول میں ڈرامہ ہوا۔ نقل اتاری گئی۔ دو لڑکے زرد کپڑے پہن کر اونٹ بنے اور ایک اونٹ والا بنا۔ اونٹ والے کو کسی نے بلایا اور سامان اٹھانے کو کہا۔ سودا طے ہو گیا تو اونٹ والے نے پوچھا کہ سامان کہاں ہے؟ جواب ملا کہ ہمارے فلاں استاد کی کتابیں ہیں۔ اس پر اونٹ مچل گیا۔ سر ہلا کر بولا۔ ہرگز نہیں۔۔۔ اور بھاگ گیا۔ ایک اور استاد سبزی خور تھے۔ وہ ہمیشہ سبزیوں کی تعریف کیا کرتے اور گوشت کی برائیاں۔ ایک روز لیکچر دے رہے تھے کہ سبزیاں بہترین غذا ہیں۔ سبزیاں مکمل غذا ہیں۔ مثال کے طور پر ذرا گھوڑے کی طرف تو دیکھو جو سبزی خور ہے۔ ایک لڑکا اُٹھ کر بولا۔ اور مثال کے طور پر ذرا شیر کی طرف تو دیکھو جو گوشت خور ہے۔ ہماری جماعت کو ایک ادھیڑ عمر کی خاتون بھی کبھی کبھی پڑھاتیں۔ ناک پر عینک، بالوں کو اکٹھا کر کے گنبد سا بنایا ہوا، بات بات پر آنکھیں مٹک رہی ہیں، انگلیاں تھرک رہی ہیں، ہاتھ ہل رہے ہیں، بازو ہل رہے ہیں۔ نہایت خشک باتیں کرتیں۔ ایک روز کلاس میں آئیں تو انہوں نے دیکھا کہ ایک لڑکا ویسی ہی عینک لگائے، ویسے ہی زنانہ کپڑے پہنے، ویسے ہی بال سر پر رکھے داخل ہُوا۔ اس کے پیچھے

دوسرا آیا، اسی حلیے میں۔ پھر تیسرا، چوتھا۔ غرضیکہ ساری جماعت انہی کی طرح بنی ہوئی تھی انہوں نے بات کر کے ہاتھ مٹکایا، سب لڑکوں نے اسی طرح ہاتھ مٹکایا۔ انہوں نے دِیدے گھمائے، سب نے دیدے گھمائے۔ انہوں نے انگلی سے چھت کی طرف اشارہ کیا، دوسرا ہاتھ فرش کی طرف گیا۔ سب نے نقل کی۔ ان کا لیکچر بہت جلد ختم ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے عمداً ہمیں کبھی نہیں پڑھایا۔"

"آپ نے وہاں کی سوشل زندگی کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔" ایک ترقی پسند ادیب بولے۔

"سوشل زندگی مَیں نے وہاں کبھی نہیں دیکھی۔ مَیں دیہاتی ہوں۔ دیہات میں بے تکلفی بہت زیادہ ہے کیسی کو ناشتے پر مدعو کرنا بے تکلفی کی انتہا سمجھی جاتی ہے۔ گھریلو قسم کی پارٹیاں ہوتی ہیں جن میں شمولیت کی شرط یہ ہے کہ آپ اس وقت جس طرح بھی ہوں۔ اسی طرح آنا پڑتا ہے۔ کوئی شب خوابی کے لباس میں آتا ہے۔ کوئی تیرنے کے لباس میں تو کسی نے ورکشاپ کے کپڑے پہنے ہوتے ہیں۔"

"آپ نے اپنا کوئی رومان نہیں سنایا۔ ذاتی رومان۔" ایک ترقی پسند شاعر نے کہا۔ سب نے اصرار کیا کہ ضرور سُنیں گے۔

بڈی کچھ دیر شرماتا رہا۔ پھر بولا۔ "ہالی وڈ کا ذکر ہے۔ چاندنی رات تھی۔ مَیں باغ کے ایک گوشے میں کھڑا تھا۔ میرے سامنے گارآبو تھی۔ معطر پھولوں کی خوشبو، ہوا کے خنک جھونکے، چاندنی کا نور۔ بس چاروں طرف رومان برس رہا تھا۔ میں نے بڑھ کر گارآبو کے ہونٹ چوم لیے، گال چومے۔ پیشانی چُومی، گردن چُومی۔ اسے اس قدر چُوما کہ میرا چہرہ فریم کے دوسری طرف نکل گیا اور تصویر پھٹ گئی۔"

تلخ صاحب آتے۔ آتے ہی فرمایا۔ خدا کے لیے رُوفی صاحب، آپ اس طرح مت

مسکرائیے۔ آپ کا چہرہ مسکراہٹ کے بغیر بہتر معلوم ہوتا ہے۔"

"آپ بھولتے ہیں کہ انسان ہی ایسا جانور ہے جو مسکراتا ہے اور ہنستا ہے۔" روفی نے کہا۔

"مَیں فقط اتنا جانتا ہوں کہ انسان جانور ہے۔" تلخ صاحب بولے۔

کاغذات نکالے گئے اور کارروائی شروع ہوگئی۔ بڈی کے مشورے کو قبول کرلیا گیا۔ رسالے کو کئی حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ شیطان نے اصرار کیا کہ انہیں خواتین کے صفحات کا مدیر بنایا جائے۔ وہ ایک زنانہ رسالے کی ایڈیٹر کو جانتے ہیں، اس سے کافی مواد لے آئیں گے۔ دوسرے یہ کہ رسالے کے سرورق پر — از بال و پرِ غبارِ تمنّا فشردہ ایم — والا شعر لکھا جائے۔

تلخ صاحب نے پہلی بات مان لی، لیکن دوسری کے لیے انکار کردیا۔

"مَیں ہر روز چوبیس گھنٹے کام کیا کروں گا۔ اگر ہوسکا تو اس سے بھی زیادہ۔" شیطان پُرجوش لہجے میں بولے۔

"یہ سب کام آپ حضرات کے ذمے ہیں، ورنہ مَیں تو بے حد مصروف انسان ہوں۔ یہاں تک کہ جب موت کا فرشتہ آیا تو اسے بھی یہی کہوں گا کہ دس منٹ کے بعد آنا۔"

تلخ صاحب نے اپنا تھیلا اٹھایا اور چلے گئے۔

بڈی نے تلخ صاحب کو بالکل پسند نہیں کیا اور بتایا کہ "اس کو ہر دم یہی خیال رہتا ہے کہ یہ اس وقت کسی اور جگہ ہوتا تو بہتر تھا۔ اور یہ اپنے آپ کو اس وقت بے حد مصروف سمجھتا ہے جب اسے کوئی کام نہ ہو۔"

تمنّا خانم آئیں مگر بڑی دیر کے بعد۔ ان کے ساتھ اور خواتین بھی تھیں۔ چائے دوبارہ شروع ہوئی۔ بڈی ہمیشہ خواتین کے نزدیک بیٹھا کرتا۔ کہتا کہ خوشبوؤں کا لطف آجاتا ہے۔

تمنّا سے میرا تعارف کرایا۔ اُس نے فوراً کہا "مَیں نے آپ کو پہلے کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ تب آپ کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہُوا کرتی تھی۔ اس کی نیلگوں آنکھیں تھیں اور بال سنہری۔ اس کا لباس شوخ ہوتا تھا اور جوتے ہمیشہ نئے فیشن کے۔ کانوں میں عموماً لمبے طلائی بُندے ہوتے اور گلے میں جڑاؤ ہار۔ اس کی دہنی کلائی میں چار چوڑیاں ہوتیں اور بائیں میں تین۔ وہ ہر وقت مسکراتی رہتی تھی۔"

"آپ اسے جانتی ہیں؟" مَیں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ مَیں نے تو اس سے کبھی بات تک نہیں کی۔"

شیطان تمنّا کو ایک طرف لے گئے۔ "اور تم نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ مجھے دیکھ کر تمہیں مسرّت ہوئی، افسوس ہوا یا کیا ہُوا؟"

"تمہیں دیکھ کر مجھے مسرّت ہوئی، افسوس ہوا یا کیا ہوا۔" تمنّا بولی۔

"آہ ایران — میرے خوابوں کی سرزمین۔ جہاں لوگ پہاڑوں پر قالین بچھا کر پھول سونگھتے ہیں اور مرتبانوں میں چائے پیتے ہیں۔ جہاں کا ایگریکلچر دنیا کے قدیم ترین کلچروں میں سے ہے۔ جہاں کا بیوٹی کلچر بہترین ہے۔ جہاں کلچر ہی کلچر ہے۔"

"اچھا مَیں آپ سے کل ملوں گی۔ خدا حافظ۔"

"تم مجھ سے ابھی کیوں نہیں ملتیں۔ کاش کہ تم میرے جذبات کا اندازہ لگا سکتیں۔ تمہارے لیے میرے دل میں کس قسم کے جذبات ہیں۔ کاش کہ مَیں بتا سکتا۔"

شیطان نے دفعتہً ایک گھٹنا زمین پر ٹیک دیا اور ایک ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔ لیکن شاید وہ پھسل گئے — انھوں نے ایک قلابازی سی کھائی، ایک ٹہنی پکڑ کر اُٹھے، اور ہوا میں جھُول گئے "یُوں سمجھ لو کہ کچھ اس قسم کے جذبات ہیں۔"

"مگر آپ مجھے صرف تین ہفتوں سے جانتے ہیں۔"

"یہ صرف تین ہفتے نہیں ہیں۔ اس عرصے میں ہم دس دس گھنٹے روزانہ ملتے رہے

ہیں یعنی ہم نے تقریباً دو سو گھنٹے اکٹھے گزارے ہیں۔ ویسے عام طور پر محبّت کرنے ہفتے میں دو یا تین مرتبہ مل سکتے ہیں، وہ بھی صرف ایک آدھ گھنٹے کے لیے۔ پھر لوگوں کی مداخلت بھی ہوتی ہے اور کبھی کبھی موسم بھی اچھا نہیں ہوتا۔ ان تین ہفتوں میں موسم بھی خوشگوار رہا ہے اور لوگوں نے بھی تنگ نہیں کیا۔ لہٰذا اس صورت میں جبکہ محبوب شروع شروع میں فی ہفتہ تین گھنٹے کے لیے مل سکتے ہوں تو مَیں حساب کی رُو سے تمہیں ستر ہفتوں سے جانتا ہوں یعنی تقریباً ڈیڑھ سال سے۔"

"خدا کے لیے آپ یوں مت مسکرائیے۔"

"مجھے ایران بہت پسند ہے۔ میرے ایک دوست کے بزرگ ایران سے آئے تھے۔ مَیں پھر وہیں واپس جانا چاہتا ہوں۔ قالینوں اور مرتبانوں کی سرزمین، جہاں صبح سے شام تک چائے پی جاتی ہے اور فارسی بولی جاتی ہے۔ آہ ایران۔"

جس صحت افزا مقام پر شیطان چھٹیاں گزارنے آئے تھے، اس کے متعلق لوگوں کی یہ رائے تھی کہ وہ سطح سمندر سے کئی ہزار فٹ نیچے ہے۔ وہاں گرمیوں میں تو کیا سردیوں میں بھی سردی نہیں ہوتی تھی۔ ایک سال پہلے شیطان کرسمس کی چھٹیوں میں وہیں آئے تھے۔ ایک ہوٹل میں ٹھہرے اور منیجر سے کہا "مَیں یہاں سردیاں گزارنے آیا ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے۔ ہمارے ہاں سردیاں نہیں ہوتیں۔" جواب ملا۔

اس مرتبہ پھر اسی ہوٹل میں ٹھہرے جو بالکل سٹیشن کے ساتھ تھا۔ انجنوں کا شور، متواتر سیٹیوں کی آواز، آتی جاتی ٹرینوں کی گڑگڑاہٹ۔ شیطان نے رات کو کھڑکی سے جھانک کر منیجر سے پوچھا "کیوں قبلہ، یہ ہوٹل اگلے سٹیشن کتنے بجے پہنچے گا؟"

ہوٹل مہنگا بھی بہت تھا۔ خواہ مخواہ بات بات پر چارج کر لیتے تھے۔ ایک روز

ہم منیجر سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک شخص نے چھینک ماری۔ شیطان فوراً بولے "حضرت یہاں چھینک مت ماریے ورنہ یہ لوگ آپ کو چارج کر لیں گے۔"

چلتے وقت شیطان نے ایک آنہ منیجر کے ہاتھ پر رکھ دیا اور کہا "مَیں نے غلطی سے آپ کا ایک انگور کچل دیا تھا۔"

چند دنوں میں تنگ آ گئے۔ ہوٹل چھوڑ کر ایک مکان کرائے پر لیا۔ مَیں اور بڈی ہر سنیچر کو شیطان سے ملنے جاتے اور اتوار کی شام کو لوٹ آتے۔

شیطان ناشتے پر سکنجبین کے ساتھ ٹوسٹ کھاتے، ٹوسٹ سکنجبین میں ڈبو ڈبو کر۔ کبھی انڈے بھی ہوتے، لیکن اتنے ہلکے اُبلے ہوئے کہ بس نوکر انڈے لے کر ایک مرتبہ گرم کچن سے گزر جاتا۔ کہیں باہر جاتے تو بچّوں کی دودھ کی بوتل بھر کر ساتھ لے جاتے۔ اسے یوں چوستے جیسے سگار پی رہے ہوں۔ کہیں بوتل نکالی، تھوڑا سا دُودھ پیا، پھر جیب میں رکھ لی۔

دوپہر کو فرش پر شطرنج کھیلی جاتی جسے شیطان 'اِن ڈور گیم' کہا کرتے۔ ہر دفعہ بڈی کی موٹر کے پیچھے بے شمار کتّے لگ جاتے۔ بڈی کا خیال تھا کہ کتّوں کو ہمیشہ تجسّس رہتا ہے۔ کتّا سائیکل یا موٹر کے پیچھے محض تفریحاً نہیں دوڑتا۔ وہ دراصل یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ اگر ایسے موقعے پر کتّے کو مخاطب کر کے صاف صاف بتا دیا جائے کہ کہاں جا رہے ہو اور کتنی دیر کے لیے جا رہے ہو تو وہ فوراً پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اور کچھ نہیں کہتا۔ بڈی یہ نسخہ اکثر استعمال کیا کرتا۔ ایک مرتبہ کتّوں سے گفتگو کرتے کرتے حادثہ ہو گیا۔ سپاہی نے پوچھا "موٹر کون چلا رہا تھا؟"

ہم نے لاعلمی ظاہر کی اور کہا کہ ہم سب تو پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔

شیطان کے مکان کے سامنے کسی تھوک فروش کا بورڈ لگا ہوا تھا جسے وہ ہمیشہ تھوک فروش پڑھتے۔ اس دکان میں اسمبلی ہال کی ایک لمبی چوڑی تصویر آویزاں تھی جسے

دیکھ کر بڈی ہمیشہ پوچھتا کہ کیا ہے اور شیطان بتاتے کہ "اس عمارت میں بحث مباحثے ہوتے رہتے ہیں۔ مدتوں سے۔"

وہ پھر پوچھتا۔ "اب تک کوئی فیصلہ ہوا؟"

شیطان سر ہلا کر کہتے۔ "نہیں۔"

شیطان دوستوں کو عجیب و غریب طریقے سے فون کرتے۔ نمبر لے کر اسے فون پر بلا لیتے اور کہتے، ذرا ٹھہرنا۔ وہ غریب رسیور پکڑے کھڑا رہتا۔ شیطان موٹر سائیکل پر اس کے گھر جا پہنچتے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہوتے کہتے۔ "ہاں تو بات یہ تھی کہ ـــ"

ہم نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ اخبار ہرگز نہیں پڑھیں گے۔ بڈی کا خیال تھا کہ وہی پرانے حادثے، وہی پرانی باتیں، سب کچھ وہی بار بار ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہر مرتبہ مختلف جگہوں پر ہوتا ہے اور مختلف انسانوں کے ساتھ پیش آتا ہے۔ بہت دن گزر جاتے تو بڈی اخبار خریدتا اور کہیں کہیں کی سرخیاں ملا کر پڑھتا۔ مثلاً "چین کے مشہور لیڈر کی جاپان کے وزیر اعظم سے ملاقات" ـــ "جنوبی برما میں خوفناک وبا پھیل گئی" ـــ "حفظانِ صحت کے فروغ پر امریکن ماہرین کا بیان" ـــ "برازیل میں بے شمار کتے پاگل ہو گئے۔"

تھوک فروش صاحب کے برابر ایک بیہودہ سا ہوٹل تھا جس میں خوب شور مچتا۔ ہم بھی وہاں جاتے۔ بڈی کی رائے تھی کہ وہاں بڑے باذوق حضرات آتے ہیں۔ کسی میز پر قہقہہ پڑتا تو بڈی دوڑ کر جاتا اور پوچھتا کہ لطیفہ کیا تھا؟ کیونکہ اس کی رائے کے مطابق لطیفہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا۔ جو کوئی اچھا سا لطیفہ سنے اسے چاہیے کہ آگے چلتا کر دے۔

جب کسی میز پر دو حضرات سرگوشیوں میں باتیں کرتے اور بار بار ہاتھ ملاتے تو بڈی کو شبہ ہو جاتا کہ یہ کسی بیہودہ موضوع پر باتیں کر رہے ہیں۔ بڈی کا یہ شبہ اکثر صحیح نکلتا۔

اگلے ہفتے تلخ صاحب کے ہاں مجلس ہوئی۔ طے ہوا کہ انہیں رسالے کا مواد سنایا جائے۔ شائع صرف وہی کچھ ہوگا جسے وہ پسند فرمائیں گے۔ سب سے پہلے شیطان نے فائل نکالی "حضرات یہ چیزیں ایک مشہور زنانہ رسالے کے دفتر سے لایا ہوں۔ یہ سب غیر مطبوعہ ہیں اور طبع زاد ہیں۔ ایک مضمون جادو اور ٹونوں کی اہمیت پر ہے۔ ایک عورت اور پردے پر ہے، دوسرا پردے اور عورت پر۔ ایک افسانہ ہے جس میں ساس اور بہو کے خوشگوار تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں تقریباً سارے کھانوں کے نام ہیں اور ہر قسم کے زیورات اور کپڑوں کا ذکر ہے۔ شادی کی مکمل رسم بھی بیان کی گئی ہے۔"

"یہ سب فرسودہ چیزیں ہیں۔" تلخ صاحب بولے۔

"اچھا ـــ 'محفلِ خواتین' کے عنوان سے جو کچھ چھپے گا اس کا ایک حصہ سناتا ہوں۔ ایک خاتون نے لکھا ہے کہ ان کے کان لمبے ہوتے جا رہے ہیں اور ناک چھوٹی ہوتی جا رہی ہے۔ اگر کسی بھائی یا بہن کو کوئی نسخہ یاد ہو تو پرچے میں چھپوا دیں۔ انہیں آپریشن سے ڈر لگتا ہے۔ اس لیے کوئی دوائی لکھیں۔ ایک خاتون لکھتی ہیں ـــ میں نہایت مسرت سے اطلاع دیتی ہوں کہ میری منجھلی ممانی کی خالہ زاد بہن کے ہاں ایک ننھی منی سی بچی پیدا ہوئی ہے۔ بچی اور بچی کی ماں دونوں بفضلِ خدا تعالیٰ خیریت سے ہیں۔ بچی کے ابا بھی بفضلِ خدا خیریت سے ہیں۔ سب بہنیں دعا فرمائیں کہ خدا اس نوشگفتہ کلی کو نیک ہدایت دے اور صراطِ مستقیم دکھائے۔ آمین! اس خوشی میں چار روپے کی حقیر رقم بھیجتی ہوں۔ نیز بڑے افسوس کی بات ہے کہ میرے سوتیلے خالو کے سگے بھتیجے کے دادا جان کا انتقال ہو گیا ہے۔ مرحوم کی عمر صرف ستانوے برس کی تھی۔ اس پرچے کو خاص طور پر منگایا کرتے تھے اور بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ اس غم میں تین روپے کی حقیر رقم ارسال ہے۔ ایک اور خاتون نے لکھا ہے میرے ابا جان خان بہادر شمس الدین

نے بلا کسی ٹکٹ کے اپنے حریف خان صاحب قمرالدین کو تقریباً چار سو بیس ووٹ سے شکست فاش دی ہے۔ نیز مجھے فلم "شاہی ڈاکو" کی "دیکھا کیے وہ مست نگاہوں سے بار بار" والی غزل درکار ہے۔ ایک محترمہ فرماتی ہیں۔ یہاں مچھّر بہت ہو گئے ہیں۔ کیا کوئی بہن یا بھائی اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہیں۔ نیز مجھے جلیبیاں پکانے کا بہت شوق ہے۔ اگر کسی کو کوئی ترکیب معلوم ہو تو بذریعہ رسالہ ہٰذا مطلع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ ایک صاحبہ نے لکھا ہے۔ میں کس زبان سے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کروں کہ اس نے ہم سب کی دعائیں سُنیں اور ہمارے چھوٹے بھائی کی منگنی خان بہادر قلندر بخت صاحب کی گیارھویں صاحبزادی سے ہو گئی ہے۔ نیز مجھے وہ گیت درکار ہے جس کے شروع کے بول ہیں۔

"ابھی تو میں جوان ہوں۔"

"سب فرسودہ ہے۔"

"دو اشتہار بھی ہیں۔۔۔ ایک استانی صاحبہ کا بیگ کھو گیا ہے، وہ لکھتی ہیں۔ پچھلے ہفتے میں سینما سے تانگے میں آ رہی تھی۔ مجھے سینما کا اتنا شوق تو نہیں ہے۔ بس کبھی کبھی چلی جاتی ہوں۔ ہوا تیز چل رہی تھی اور میں نے عینک نہیں لگا رکھی تھی۔ میری نگاہ کمزور نہیں ہے، بس یونہی شوقیہ لگا لیتی ہوں۔ میں نے عینک کے لیے بیگ کھولنا چاہا کیونکہ بیگ میں صرف عینک رکھی تھی، میک اپ کی چیزیں نہیں تھیں۔ میں میک اپ نہیں کرتی۔"

"یہ اشتہار ترقی پسند نہیں ہے۔"

"دوسرا اشتہار ایک عامل بزرگ نے دیا ہے، ایک تعویذ کے لیے جو دافعِ شرّیات و بلّیات ہے۔"

"دافعِ بلّیات ہو یا دافعِ کُتّیات۔ شائع نہیں ہوگا۔ میں زنانہ چیزیں شامل کرنے کے خلاف ہوں۔"

"میں ایک جدید نظم سناتا ہوں۔" ایک ترقی پسند شاعر نے سب کو ایک ایک کاغذ

دیا جس پر نظم لکھی ہوئی تھی۔

"سُنیے۔ نظم کا عنوان ہے۔۔ "اُٹھ میری جان"۔۔ عرض کیا ہے:

اُٹھ میری جان سحر آ پہنچی۔
اُٹھ میری جان کہ شب ختم ہوئی
چاندنی پھیکی ہے تاروں کی چمک مدھم ہے
صبح صادق کا اُجالا پھیلا
اُٹھ مری جان چمن جاگ اُٹھا
مسکراتے ہوئے غنچے جاگے
کلیاں شرمانے لگیں
اور اِٹھلانے لگی بادِ نسیم
پھول انگڑائیاں لیتے اُٹھے
تیری آنکھوں میں مچلتے ہوئے خواب
تیرا مخمور شباب
تیرے عارض کے گلاب
ابھی مدہوش ہیں مخمور ہیں، خوابیدہ ہیں
اُٹھ مری جان سحر آ پہنچی

اُٹھ کے کچھ چائے بنا۔"

"پھر وہی عشق و محبت کا بے کار موضوع۔ وہی رونا پیٹنا، بیہودہ قسم کی رومان پسندی۔ یہ نظم ہرگز ترقی پسند نہیں ہے۔ ترقی پسند شاعری میں تلخاب، زہراب، پژمردہ شباب، خون بھرا جام، حیات و موت کی کشمکش۔۔۔ اور اسی قسم کے دیگر لوازمات ہوتے ہیں۔

مجھے یہ نظم پسند نہیں آئی۔" تلخ صاحب نے کہا۔

"مَیں نے داڑھی پر مضمون لکھا ہے۔" ایک ادیب اپنی عینک درست کرتے ہوئے بولے "جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے۔ ایک مرتبہ مَیں نے گرمیوں کی چھٹیوں میں یونہی داڑھی رکھ لی۔ کالج کھلا تو عربی کے پروفیسر نے میری اتنی تعریفیں کیں کہ بس! داڑھی سے چہرہ نورانی معلوم ہوتا ہے۔ انسان مَرد دکھائی دیتا ہے۔ شیر معلوم ہوتا ہے"۔

"کون سا شیر؟ سرکس کا یا جنگل کا؟" شیطان نے پوچھا۔

"غالباً جنگل کا۔ خیر خوب تعریفیں ہوئیں۔ اسی شام کو سگریٹ سلگاتے ہوئے مَیں نے داڑھی کا کچھ حصّہ جلا لیا۔ آئینہ دیکھا تو حالات اس قدر نازک ہو چکے تھے کہ مجھے مکمل داڑھی صاف کرنی پڑی۔ اگلے روز وہی پروفیسر جو میرے پیچھے پڑے ہیں۔ اس مردود کی شکل تو دیکھو کیسی نحوست برس رہی ہے۔ بدبخت، ناہنجار، بدنصیب، منحوس۔ خدا جانے کیا کچھ کہا۔ سالانہ امتحان ہوا مَیں عربی میں فیل تھا تو اس روز مَیں نے تہیّہ کر لیا کہ داڑھی کے متعلق اپنے خیالات ضرور چھپواؤں گا۔ کالج میں ایک داڑھی والے حضرت نئے نئے آئے تھے۔ وہ ساری دوپہر لائبریری میں گزارتے۔ پروگرام کے مطابق میں نے پونے دو روپے کی ایک مصنوعی داڑھی خریدی اور لگا کر اسی میز پر بیٹھنے لگا۔ ایک دوپہر کو ہمارے پروگرام کے مطابق چند دوست آئے ایک بولا "بھئی گرمی بہت ہے ٹوپی اتار دو۔" سب نے ٹوپیاں اتار دیں۔ کچھ دیر کے بعد دوسرا بولا۔ "توبہ توبہ کتنی گرمی ہے۔ کوٹ اتار دو۔" سب نے کوٹ اتار دیے۔ پھر تیسرا کہنے لگا۔ "پسینے میں شرابور ہو رہے ہو اور داڑھی پہن رکھی ہے اتار دو اسے۔" مَیں نے داڑھی اتار دی۔ میرا داڑھی اتارنا تھا کہ سب ان حضرت کے پیچھے لگ گئے۔ "آپ بھی داڑھی اتار دیجیے۔ اتنی گرمی ہے۔ ہم سے دیکھا نہیں جاتا، اب اتار بھی دیجیے داڑھی۔"

"بالکل بوسیدہ خیالات ہیں۔ بھلا داڑھی سے سماج کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟" تلخ

صاحب بولے۔

اب بڈّی کی باری تھی۔ اس نے جیب سے کاغذ نکالے "مَیں نے اپنے کالج کے چند واقعات لکھے ہیں۔ گھر سے کالج آتے وقت ہمیں بس میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹے کا سفر ہوتا۔ کبھی کبھی میرا ایک دوست کونے میں ایک کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور اسے بڑے غور سے پڑھنے لگتا۔ پڑھتے پڑھتے قہقہہ مار کر ہنستا، پھر یک لخت سنجیدہ ہو جاتا۔ کچھ دیر کے بعد زار و قطار رونے لگتا۔ مسافر اس کی طرف متوجّہ ہو جاتے۔ وہ چپ چاپ نظریں جھکائے صفحے الٹتا رہتا۔ کبھی جھنجھلا کر اپنے بال نوچتا۔ کبھی مسکرا کر سر مٹکانے لگتا۔ پھر رونا شروع کر دیتا۔ ہر ایک مسافر کی یہی کوشش ہوتی کہ کسی طرح اسے اس عجیب و غریب کتاب کا نام معلوم ہو جائے۔ لیکن وہ اسے چھُپائے رکھتا۔ سفر کے اختتام پر بڑے اطمینان سے کتاب سب کے سامنے کھول دیتا۔ کتاب کے سارے صفحے خالی ہوتے۔ کسی صفحے پر ایک لفظ بھی نہ ہوتا۔ پھر ہم چند دوستوں نے ایک بنچ خریدی اور کالج کے سامنے والے باغیچے میں رکھ دی۔ جب کوئی پولیس والا نظر آتا تو ہم بنچ اٹھا کر چوروں کی طرح بھاگتے۔ وہ ہمارا تعاقب کرتا۔ بڑی مصیبتوں کے بعد جب ہمیں پکڑتا تو ہم اسے بنچ کی رسید دکھا دیتے۔"

"یہ بھی کچھ نہیں۔ اس میں نہ جدّت ہے نہ افادیت۔ ایسی چیزیں پڑھنے والوں کو سوائے ایک وقتی تفریح کے اور کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ مجھے ترقی پسند ادب چاہیے۔"

"ایک پلاٹ میرے ذہن میں ہے۔" شیطان نے بتایا "اس میں چار کردار ہیں۔ ایک کسان، ایک سرمایہ دار، ایک طوائف اور ایک مریل سا نوجوان جیسے دنیا بھر کی بیماریاں ہیں۔ یہ لوگ ایک خفیہ جماعت بناتے ہیں۔ پھر ان کا تجزیہ نفسی ہوتا ہے۔ ان کے تحت الشعور اور لاشعور تباہ ہو جاتے ہیں۔ دو کردار تو خودکشی کر لیتے ہیں۔ دو ایک دوسرے کو ہلاک کر دیتے ہیں اور سماج ——"

تلخ صاحب بولے "بس بس —— مجھے ایسی کہانیاں درکار ہیں۔ اسے تم اگلی اشاعت

کے لیے لکھنا۔۔۔اس اشاعت میں صرف میری چیزیں ہوں گی۔"

مَیں نے بڈی سے مشورہ کر کے ایک پروگرام بنایا۔ تلخ صاحب سے ہم نے التجا کی وہ ازراہِ کرم ہر اتوار کو ہمیں اپنے ہاں رہنے کی اجازت دے دیں۔ وہ متعجب ضرور ہوئے لیکن انہوں نے اجازت دے دی۔ ان کے ہاں رہ کر ہمیں معلوم ہوا کہ وہ ہر دو گھنٹے کے بعد ایک گرم اور میٹھی چیز پیتے ہیں اور یہ ان کی خوش فہمی ہے کہ وہ اسے چاء کہتے ہیں۔ دوپہر کو بھاری بھرکم لنچ کھاتے ہیں۔ سارا دن عینک لگائے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کا فرنیچر خستہ حالت میں ہے۔ کپڑوں پر استری نہیں ہوتی۔ دیواروں کا رنگ اُڑ چکا ہے۔ بلب فیوز ہو چکے ہیں۔ فقط ایک بلب ہے وہ بھی ٹمٹماتا ہوا۔ ہر وقت انہیں اپنے کتے کا وہم رہتا ہے، جسے وہ کبھی دُور سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہیں کبھی نزدیک آ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھُورتے ہیں۔ انہیں یہ یقین ہو چکا ہے کہ کتا انہیں نہیں پہچانتا، اجنبی سمجھتا ہے اور کتا سارا دن سر جھکائے دنیا کی بے ثباتی پر غور کرتا رہتا ہے۔ نہ اسے کچھ کھانے کو ملتا ہے نہ اسے کبھی باہر نکالا جاتا ہے۔ کبھی تلخ صاحب کا جگر خراب ہو جاتا ہے، کبھی دل بیٹھنے لگتا ہے۔ کبھی گردے ستیہ گرہ کر دیتے ہیں۔ ان کے پاس طب کی چند کتابیں ہیں جن کا وہ باقاعدگی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ جو نئی بیماری پڑھتے ہیں وہ فوراً انہیں ہو جاتی ہے۔

بڈی بولا۔ "اگر اس شخص کو ہم درست کر سکے تو یہ بہت بڑی سوشل خدمت ہو گی۔ اگر بہت جلد کچھ نہ کیا گیا تو یہ رسالے کے ذریعے اپنی بیزاری دُور دُور تک پھیلا دے گا۔"

سب سے پہلے ہم نے کتے کو لیا۔ ہم نے تلخ صاحب سے کہا کہ کتے کی بینائی کمزور ہو چکی ہے اور اسے عینک کی ضرورت ہے۔ تلخ صاحب بسورنے لگے۔ "اگر اس کی پیاری پُرشفقت وفادار آنکھوں پر عینک لگ گئی تو اس کی خوبصورتی میں فرق آ جائے گا۔"

"ہم فرق نہیں آنے دیں گے۔ ہم اسے بغیر فریم کی عینک لگائیں گے جس سے یہ اور بھی حسین معلوم ہو گا۔"

"مگر اس کی بینائی کس طرح ٹسٹ ہو گی؟ حروف تو یہ پڑھ نہیں سکتا۔"

"ہم اس کی ایک آنکھ بند کر کے اسے مختلف فاصلوں سے ہڈیاں دکھائیں گے۔ جہاں تک اسے ہڈی نظر آئی یہ دوڑے گا۔ اس فاصلے کو ناپ کر اس کی دوسری آنکھ دیکھی جائے گی۔ پھر کسی ڈاکٹر سے عینک کا نمبر لے آئیں گے۔"

"مگر اس کے چہرے پر عینک کی جگہ ہے کہاں۔ اس کی ناک بیٹھی ہوئی ہے اور کان اتنے ملائم ہیں۔ عینک کہاں ٹھہر سکے گا۔"

"آپ بے فکر رہیے۔"

ہم نے جھوٹ موٹ بینائی ٹسٹ کی اور ایک فضول سی عینک بنا کر کتے کے منہ پر لگا دی۔ عینک کی کمانیاں کانوں کے گرد لپیٹ کر کس دی گئیں۔ تلخ صاحب کتے کی طرف سے بالکل مطمئن ہو گئے۔

پھر طب کی ساری کتابیں کباڑیے کے ہاں پہنچا دی گئیں۔ دیواروں پر سفیدی کرائی گئی، کہیں کہیں چمکیلا وال پیپر بھی لگایا گیا۔ فرنیچر پالش کرایا گیا۔ نہایت تیز بلب جگہ جگہ لگائے گئے۔ ایک سیکنڈ ہینڈ اِستری خرید کر لائے۔ نوکر کو اِستری کرنا سکھایا اور اسے تاکید کی گئی کہ صبح شام دو وقت کپڑوں پر اِستری کیا کرے اور ہوٹل سے چاء لانے کے بجائے ہلکی سی چاء خود بنا کر تلخ صاحب کو دیا کرے۔ تلخ صاحب کی عینکیں بالکل میلی رہتی تھیں۔ نوکر کو ایک ملائم سا کپڑا دیا گیا کہ شیشے صاف کر دیا کرے۔

تلخ صاحب کی حالت پہلے سے بہتر ہو گئی لیکن ان کا ہاضمہ درست نہ ہوا۔ بڈی کہنے لگا کہ دوائیاں خریدیں گے، لیکن مَیں نے مشورہ دیا کہ ان کا لنچ بند کرا دیا جائے۔ ہم ان کے پاس گئے اور بڑے پُردرد لہجے میں بولے۔ "ہم سماج کے نام پر ایک التجا کرنے

آئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمیں مایوس نہیں لوٹایا جائے گا ۔ سماج ، جنتا ، سوسائٹی ۔ ان کا تقاضا ہے کہ آپ لنچ چھوڑ دیجیے۔"

"آخر کیوں؟"

"کیا آپ نہیں جانتے کہ ملک میں ایسے انسان بھی ہیں جنہیں ایک وقت بھی کھانا نہیں ملتا اور آپ ہیں کہ تین مرتبہ کھانا کھاتے ہیں اور سارا دن چاء پیتے رہتے ہیں۔"

"مگر میرے لنچ چھوڑ دینے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟"

"آپ تو جانتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے ارادوں سے بڑی بڑی تبدیلیاں ظہور میں آتی ہیں۔ آپ لنچ چھوڑیں گے، ہم دونوں نے پہلے ہی چھوڑ رکھا ہے۔ دیکھا دیکھی اور لوگ بھی چھوڑنے لگیں گے۔ ممکن ہے کہ سارا ملک لنچ کھانا چھوڑ دے اور آہستہ آہستہ سارا ایشیا۔ اور پھر کسی دن ساری دنیا۔"

تلخ صاحب مان گئے۔"

شیطان کا خیال تھا کہ پہلے پرچے کے ساتھ ہی تمنّا خانم کا نام جاوداں ہو جائے گا۔

اُدھر تمنّا کی بے رُخی بڑھتی جا رہی تھی۔ شیطان ہر روز اس سے ملنے جاتے۔ ایک اور لڑکی کے متعلق مشورہ لینے۔ تمنّا کو بتاتے کہ آج اس لڑکی نے یہ کہا ہے۔ پھر پوچھتے مجھے بتاؤ کہ مَیں اسے کیا کہوں۔ اگلے روز جا کر سناتے کہ میرے یہ کہنے پر اس لڑکی نے یوں کہا مَیں نے یہ کہا تو وہ یہ بولی۔ اب بتاؤ میں اسے کیا کہوں؟ کچھ روز تو یوں ہوتا رہا۔ پھر ایک روز تمنّا نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ لڑکی وڑکی کوئی بھی نہیں ہے یہ مجھ سے ملنے کا بہانہ ہے۔

شیطان بولے۔ تمہارا قیاس درست ہے لیکن میں کروں بھی تو کیا کروں۔ اوّل تو

تم ملتی نہیں۔ جب کبھی ملتی ہو تو سہ پہر کو ملتی ہو۔ بھلا گرمیوں کی سہ پہر کو مَیں تمہیں کیونکر اپنے اوپر عاشق کرا سکتا ہوں۔ کاش کہ ہم ایران میں ملتے۔ سرو کے درختوں اور قالینوں کے انبار میں۔ مرتبانوں پر بیٹھ کر چائے پیتے۔ آہ ایران۔ میرے ایک بوڑھے دوست کی نانی اماں ایران کی ہیں۔ مجھے ان نانی اماں سے۔"

"لفظ نانی کافی ہے۔ اس میں اماں لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور پھر یہ آپ بار بار ایران کا ذکر کیوں لے بیٹھتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو ایران مجھے خود پسند نہیں ہے۔"

"مگر ایران تو۔"

"بہتر ہوگا کہ آپ ایران کا ذکر بالکل نہ کیا کریں۔"

"لیکن۔"

"پہلے ہی آپ کے احسانات کافی ہیں۔ آپ نے جو کچھ کیا ہے اس کے لیے شکریہ۔"

"مگر مَیں نے تو ابھی تک کچھ بھی نہیں کیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ایرانی ایسے ہوتے ہیں۔"

"خدا کے لیے آپ آئندہ مجھ سے کسی قسم کی گفتگو مت کیجیے۔"

"بہت بہتر۔" شیطان اپنا ہیٹ اٹھا کر بولے "جو کچھ ہوا، اس کا مجھے افسوس ہے لیکن جو کچھ نہ ہو سکا، اس کا تو بہت ہی زیادہ افسوس ہے۔"

اسی شام کیفے میں چاۓ پیتے وقت بڈی کے لیے فون آیا۔ ہم کان اس طرف کر کے سُننے لگے۔ بڈی کسی خاتون سے گفتگو کر رہا تھا "جی ہاں! یہ مَیں ہی ہوں جی نہیں یہاں نہ تلخ صاحب ہیں نہ رومی میاں۔ آپ بتائیے۔ اُف یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ کو رومی سے نفرت ہے؟ مَیں انہیں بتا دوں؟ نہیں معاف کیجیے مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔ تلخ صاحب آپ کو ملے تھے۔۔۔؟ وہ ہر روز آپ سے ملتے ہیں؟ کیا کہا؟۔۔ آپ کو وہ اچھے لگتے

ہیں۔ آپ ایک دوسرے سے محبّت کرتے ہیں؟ — جی نہیں وہ حسین ہرگز نہیں ہیں۔ آپ نے انہیں غور سے نہیں دیکھا۔ آپ تلخ صاحب سے شادی کرنے والی ہیں — ؟ بڑی خوشی کی بات ہے۔ اچھّا تمنّا خانم، آداب عرض۔"

اسی قسم کے فون دو تین مرتبہ اور آئے۔

اس کے بعد بہت کچھ ہوا۔ رسالے کی اشاعت التوا میں پڑ گئی۔ شیطان اور تلخ صاحب کی دوستی ختم ہو گئی۔ جو صاحب رسالے کو مالی امداد پہنچانے والے تھے وہ کہیں غائب ہو گئے۔ تمنّا کا ذکر کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا۔ تلخ صاحب کے کمروں میں روشنی ہونے لگی۔ ان کا کتّا انہیں پہچاننے لگا۔ ان کی صحت بہتر ہو تی گئی۔

بڈّی کا تبادلہ ہو گیا۔ شیطان کا کالج کھل گیا۔ مَیں نے بھی تبادلہ کرا لیا اور ہم سب تمنّا کو بھُول گئے۔ لڑکی کو بھی اور رسالے کو بھی۔

ہم ایک ہوٹل کے بڑے کمرے میں بیٹھے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد کافی کا دَور چل رہا تھا۔ ہمیں ایک فلک شگاف قہقہہ سنائی دیا۔ مُڑ کر دیکھا تو ایک موٹا تازہ تندرست شخص ہنس رہا تھا۔ یونہی وہم سا ہوا۔ ہم نے بیرے کو بھیجا کہ ان صاحب سے پوچھنا کہ ان کا اسم شریف تلخ صاحب تو نہیں ہے؟

بیرے نے آکر بتایا کہ تلخ صاحب ان کا پرانا اسم شریف تھا۔ اب انہیں مسرور صاحب کہا جاتا ہے۔

مسرور صاحب نے ہمیں دیکھا تو ہنستے ہوتے آئے اور ہم سے لپٹ لپٹ کر ملے۔

انہوں نے بتایا کہ آج کل وہ بزنس کرتے ہیں اور کافی امیر ہو گئے ہیں۔ ہم نے مضمون نگاری کے متعلق دریافت کیا۔ بولے۔ "مَیں تم دونوں کا احسان عمر بھر نہیں بھُولوں گا۔ جب سے مَیں نے لنچ چھوڑا ہے۔ میرا ہاضمہ درست ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مضمون نگاری کی شکایت بھی جاتی رہی۔ اب خدا کے فضل سے بالکل درست ہوں اور مجھے کوئی بیماری نہیں رہی۔ ضعفِ جگر، مالیخولیا مضمون نگاری، اختلاجِ قلب۔ سب دفع ہوئے — اور ہاں وہ ماہنامہ تمنّا کا سائن بورڈ میرے ہاں پڑا ہے، اپنا پتہ بتا دو تو مَیں بھجوا دوں گا۔"

"یہ آپ نے کیا یاد دلا دیا۔" شیطان بولے "مجھے تمنّا یاد آگئی۔ گو اُس نے میرے ساتھ اتنا اچھا سلوک نہیں کیا پھر بھی مَیں نے اسے معاف کر دیا تھا ایرانی واقعی ہم سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی عادات، ان کے خیالات، ان کا رویّہ سب اور طرح کے ہوتے ہیں مگر مجھے ایران سے الفت ہے۔ مَیں یہاں ہوں، لیکن میرا دل ایران میں ہے۔ ایران جو میری تمنّا کا وطن ہے۔"

"لیکن وہ لڑکی ایرانی تو نہیں تھی۔" تلخ صاحب چونکے۔

"سچ مچ۔"

"ہاں سچ مچ۔ وہ ایسی ہی ایرانی تھی جیسے تم روسی ہو یا مَیں چینی ہوں۔"

"تو پھر اس کے آباد اجداد ایران سے آئے ہوں گے۔"

"اس کے آباد اجداد ضرور آئے تھے لیکن ایران سے نہیں، بلکہ شیخو پورہ سے آئے تھے۔ ویسے یہ لوگ تجارت کے سلسلے میں کبھی کبھی ایران —"

"آپ کو شروع سے اس کا علم تھا؟" شیطان چمک کر بولے۔

"ہاں۔"

"تو آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ اور پھر جب آپ جانتے تھے کہ مَیں اس کی جانب ملتفت ہوں، تو آپ کو عاشق ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ خیر — مَیں نے آپ کو

معاف کیا۔"

"کون عاشق اور کس کا عاشق۔" تلخ صاحب نے کہا "مَیں تمنّا پر کبھی عاشق نہیں ہُوا۔ اگر دُنیا میں طوفان آجاتا ___ اور طوفان کے بعد کرّہ ارض پر صرف مَیں اور تمنّا رہ جاتے، تب بھی مَیں اس پر عاشق نہ ہوتا۔ مگر یہ عاشق ہونے کی اُڑائی کس نے تھی؟"

"بات دراصل یہ ہے۔" بڑی شرماتے ہوتے بولا "وہ جو ٹیلیفون پہ باتیں ہوا کرتی تھیں، وہ سب بناوٹی تھیں۔ تمنّا نے مجھے کبھی فون نہیں کیا۔ مَیں اس سے رُونی کی برائیاں بھی کرتا رہا ہوں، لیکن محض اس لیے کہ ___"

"تو بڑی تم بھی ایسے نکلے؛ خیر جاؤ مَیں نے تمہیں بھی معاف کیا۔ مَیں نے سب کو معاف کیا، لیکن وہ لڑکی خوب تھی۔ کیا مجال جو اس سے کوئی ایسی ویسی بات تو کرلے بڑے سخت اصول تھے اس کے۔ ایک مرتبہ اتفاق سے میری انگلیاں اس کی انگلیوں سے چھو گئیں۔ اس قدر خفا ہوئی کہ بس۔"

"لیکن اُس رات تم۔" تلخ صاحب میری طرف مخاطب ہوکر بولے۔ مَیں نے جلدی سے ان کا پاؤں دبا دیا۔

"اُس رات کیا ہُوا تھا؟" شیطان نے کڑک کر پوچھا۔ "بتاؤ کیا ہُوا تھا اُس رات؟"

"بات یہ ہے رُونی۔" مَیں سر جھکا کر بولا۔ "ایرانیوں کے رسم و رواج تو تم جانتے ہی ہو۔ رخصت ہوتے وقت چُومنے کا رواج ___"

"وہ ایرانی نہیں تھی۔" شیطان چلّائے۔ "خیر مَیں نے تمہیں بھی معاف کیا۔ خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے ایسے مخلص اور جاں نثار دوست عطا فرمائے ہیں مَیں ان کو معاف کرتا ہوں۔ یہ ناسمجھ ہیں۔ بے بہرہ ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ مَیں نے ان کو معاف کیا تو بھی معاف فرما۔"

شیطان اُٹھ کھڑے ہوتے اور ٹہلنے لگے۔ ٹہلتے ٹہلتے بالکنی میں جا کھڑے ہوتے۔

چودھویں کا چاند بالکل ان کے سر کے پیچھے تھا۔ جب وہ "از بال و پرِ غبارِ تمنّا" والا شعر بار بار پڑھ رہے تھے تو ان کے چہرے پر عجب شان تھی۔ عجب پژمردہ سا وقار تھا ___ عجب بے نیازی تھی ___ جو سب کچھ تج دینے والوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

ان کے چہرے پر وہ نور تھا جو صرف کسی ولی اللہ کے چہرے پر آیا کرتا ہے ___ مستقل طور پر یا تھوڑے عرصے کے لیے۔

ان کے سر کے گرد چاند نورانی ہالہ بنائے ہوئے تھا۔

لیکن ہم یہی سوچ رہے تھے کہ ان کا چہرہ مسکراہٹ کے بغیر بہتر معلوم ہوتا ہے۔

حماقتیں

مَیں ڈرتا ڈرتا MESS میں داخل ہوا۔ برّا کوٹ اتارا، پوستین اتاری، کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ موڈی جونز انگیٹھی کے پاس بیٹھا اپنے بچپن کے قصّے سنا رہا تھا۔ "جب مَیں چھوٹا سا تھا تو بزرگوں نے میری آئندہ تعلیم کے متعلق تصفیہ کرنا چاہا کہ مَیں انجنیئرنگ پڑھوں یا قانون؛ دادا جان نے فرمایا کہ بچّہ خود اپنی پسند بتائے گا۔ انہوں نے میری نرس آیا کے ایک ہاتھ میں ترازو دی اور دوسرے ہاتھ میں انجنیئروں کا ایک آلہ، اور مجھ سے کہا جو پسند آئے چُن لو۔ مَیں کچھ دیر سوچتا رہا۔ بڑے غور و خوض کے بعد جانتے ہو مَیں نے کیا کیا؟ مَیں نے نہایت لاجواب انتخاب کیا۔ مَیں نے نرس کو چُن لیا۔"

مُوڈی نے پائپ کا ایک کش لگایا اور بولا۔ "بچپن میں مجھے پرندوں کا بڑا شوق تھا۔ ایک روز مَیں اپنے چھوٹے سے گاؤں سے ایک بڑے سے شہر میں گیا۔ وہاں کے باغ میں سیر کر رہا تھا کہ ایک نہایت خوشنما طوطا دکھائی دیا جو ایک شاخ پر بے خبر بیٹھا تھا۔ مَیں پکڑنے کی نیّت سے دبے پاؤں قریب پہنچا۔ آہستہ سے پتّوں میں ہاتھ ڈالا اور پکڑنے ہی لگا تھا کہ طوطے نے ایک دم پیچھے مُڑ کر کہا "کیا چاہیے؟" مَیں نے کبھی کسی پرندے کو بولتے ہوئے نہیں سُنا تھا، لہٰذا اتنا گھبرا گیا کہ جلدی سے اپنی ٹوپی اُتار کر عاجزی سے بولا۔ "مُعاف کیجیے جناب! مَیں سمجھتا تھا کہ آپ کوئی پرندے ہیں۔"

"یہ LANKY کہاں چلا گیا؟" کسی نے پوچھا۔ لینکی میرا نام تھا۔ مَیں ان سب میں لمبا تھا اور ان دنوں کچھ دُبلا بھی تھا۔

"ٹونی کے ہاں ہو گا۔ بڑا انتظار کرانا ہے۔" مَیں واقعی ٹونی کے ہاں سے آ رہا تھا۔ باہر اندھیرا تھا اور سخت سردی پڑ رہی تھی۔ دروازہ کھول کر چوروں کی طرح اندر جھانکنے لگا۔ سب کے سب مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا گیا۔ اب تک کہاں تھے؟ سچ بتاؤ کہاں سے آ رہے ہو؟ ضرور ٹونی کے ہاں گئے ہو گے۔ اکیلے کیوں گئے تھے؟ جُولی ملی کیا؟ کیا حال ہے جولیٹ کا؟ یہ اکیلے ہی اکیلے۔

مَیں نے اقبالِ جرم کر لیا تو وہ بولے۔ "اچھا تو جُولی کی نئی تصویریں نکالو۔" مَیں نے کہا کہ "ابھی نہیں مِلیں"۔ کہنے لگے "ضرور لاتے ہو، ہمیں دکھاتے نہیں۔" مَیں نے ایک تصویر جیب سے نکالی "یہ ایک تصویر ہے ٹونی کی جو شکار سے واپسی پر اتاری گئی تھی۔ اس تصویر میں ٹونی اپنی بیہودہ سی موٹر کے ساتھ کھڑے ہیں"۔ ایک پاؤں موٹر کے پائدان پر تھا اور دوسرا زمین پر۔ ہاتھ میں بندوق تھی۔ چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور سامنے ایک چھوٹا سا پرندہ مرا پڑا تھا۔ ان کی موٹر بالکل خستہ حالت میں تھی۔ ہم حیران ہُوا کرتے کہ یہ چلتی کیونکر ہے۔ ضرور اسے کوئی روحانی طاقت چلاتی ہو گی۔ تصویر پر مختلف تبصرے ہوتے۔ "اتنا چھوٹا سا پرندہ مار کر اتنے خوش کیوں ہیں؟" ایک طرف سے آواز آئی۔

"اس میں خوش ہونے یا فخر کرنے کی بات کون سی ہے؟ آخر مارا کیا ہے انہوں نے؟" کسی نے پوچھا۔

موڈی بولا "پرندہ ورندہ کچھ نہیں۔ ٹونی موٹر مار کر لاتے ہیں۔"

اور واقعی وہ موٹر تھی ہی ایسی۔

بِل نے ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا "اور تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"میرا دوسرا ہاتھ ہے۔" مَیں نے دونوں ہاتھ دکھا دیے۔ ان دنوں سب مجھ پر شبہ کرتے تھے۔

ہم کھانا کھا رہے تھے۔ مچھلی کے یورپی طرز کے سالن میں شوربا ہی شوربا تھا۔ موڈی نے بیرے سے کہا "ذرا میرے کمرے سے دوڑ کر مچھلیاں پکڑنے کی ڈور تو لے آؤ۔ یوں تو کچھ پلّے نہیں پڑ رہا۔ اور لینکی تم کھا نہیں رہے۔ آج جولیٹ کو جی بھر کے دیکھا ہو گا۔ بخدا کیا لڑکی ہے اور پھر یہی اس کے دن بھی ہیں۔ عورت کی زندگی کے بہترین دس سال بیس برس سے پچیس برس تک ہیں۔"

"جولیٹ نے آج پہن کیا رکھا تھا؟" ایک طرف سے آواز آئی۔

"کپڑے۔" مَیں نے جواب دیا۔

"کپڑے کیسے تھے؟" پوچھا گیا۔

"اُون سے بنے ہوئے تھے۔" مَیں نے بتایا۔

"تمہیں لڑکیوں کے لباس میں سب سے زیادہ کیا پسند ہے؟" کسی نے پوچھا۔

"لڑکیاں۔" مُوڈی جونز نے جواب دیا۔

"شارٹی ہسپتال میں داخل ہو گیا ہے۔" بِل بولا۔

"اچھا، کب تک واپس آ جائے گا؟"

"ابھی دیر لگے گی۔ شاید کافی دیر لگے گی۔"

"کیوں کیا تم وارڈ کے ڈاکٹر سے ملے تھے؟"

"نہیں! مَیں نے وارڈ کی نرس دیکھی تھی۔"

"یار عجیب انسان ہے یہ شارٹی۔ بھُوتوں سے ڈرتا ہے۔ یہی مرض لے کر ہسپتال میں داخل ہُوا ہے۔" پوزی بولا۔

"مجھے بھی اُس نے بتایا تھا۔" مُوڈی نے کہا کہ "ایک بھُوت خواب میں آ کر اس کے بستر کے سامنے کرسی پہ بیٹھ جاتا ہے اور رات بھر اسے گھُورتا رہتا ہے۔ مَیں نے تو یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ کرسی وہاں سے ہٹا دو، بلکہ کمرے کی سب کرسیاں نکال دو۔"

"بھلا یہاں کہاں رکھے ہیں بھوت ؟ اور پھر ایسی سردی میں۔" بل بولا۔

"یہ تو تم مت کہو۔" موڈی نے کہا "بھوت تو یہاں ہیں۔ ابھی چند دنوں کا ذکر ہے کہ مجھے رات بھر بھوتوں نے ڈرایا۔ میرا تعاقب کیا۔ مجھے پیٹنے کی دھمکی دی۔ میرا منہ چڑایا۔"

"تم سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے ؟"

"سو رہا تھا، یہ سب خواب میں ہوا۔"

"تو تم جاگ کیوں نہ اُٹھے ؟"

"واہ! جاگ اُٹھتا اور بھوتوں پر یہ ظاہر کرتا کہ میں بزدل ہوں۔"

"یہ تو خواب تھا۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ اس علاقے میں بھوت نہیں ہیں میں نے جغرافیے میں پڑھا تھا۔" کسی نے کہا۔

"ابھی کچھ دن ہوتے۔" موڈی بولا "میں آدھی رات کو سنیما سے سیکنڈ شو دیکھ کر واپس آ رہا تھا۔ بڑا سخت اندھیرا تھا۔ سڑک بالکل سنسان پڑی تھی اور میں بے خبری میں آ رہا تھا۔ اچانک ایک بھاری بھرکم جسم سے میری ٹکر ہوئی۔ میں نے چونک کر کہا بھئی تم نے تو مجھے ڈرا دیا، میں سمجھا تم بھوت ہو۔ وہ جسم بولا۔ تو اور میں کیا ہوں ؟ یہ کہہ کر غائب ہو گیا۔"

"اچھا!" پوزی کے ہاتھ سے چمچہ گر گیا۔

"یہ کس جگہ کا ذکر ہے ؟" فیٹی نے سہم کر پوچھا۔

"ٹونی کے بنگلے کے ساتھ جو موڑ ہے وہاں کا۔" اب پھر ٹونی کا ذکر شروع ہو گیا۔

موڈی کہنے لگا۔ "ویسے ٹونی نہایت نفیس انسان ہیں۔ انسان کو شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ان کے پاس ہے! جامہ زیبی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان پر لباس بہت سجتا ہے! اچھی آواز کی ضرورت ہے۔ ان کی آواز بہت اچھی ہے! اعلیٰ دماغ کی ضرورت ہے۔ ان کی آواز بہت اچھی ہے!"

"اور اپنے بچّے TICH ۔ وہ کیسے ہیں ؟"

"ان کا ذکر کرتے وقت مجھے کیمپ کی ڈیوٹی یاد آ جاتی ہے۔ شاید اس مرتبہ میری باری ہے۔ اسی فکر میں میں کئی دنوں سے بالکل نہیں سویا۔" موڈی نے کمانڈنگ افسر کا نام سن کر کہا۔

"کئی دنوں سے نہیں سوئے، یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟"

"اس لیے کہ میں ہمیشہ رات کو سویا کرتا ہوں۔" موڈی بولا۔ "اور وہ کم بخت کیمپ اس قدر اُجاڑ تھا کہ وہاں سنتری رات کو ذرا سی آہٹ پا کر چلّا اٹھتے تھے کہ "ہالٹ!" میں بھی تمہارے ساتھ آتا ہوں۔" کل رات میں نے خواب میں دیکھا کہ ہف کیمپ پر جا رہا ہے، لیکن ٹونی نے اسے روک لیا اور چلّا کر کہا کہ ۔۔۔"

"کیا کہا ؟" ہف نے بے صبر ہو کر پوچھا۔

"بس اتنا ہی خواب دیکھا تھا۔ بقیہ خواب آج رات کو دیکھ کر بتاؤں گا ۔۔۔ چلو ریڈیو سنتے ہیں۔"

ہم کافی کی پیالیاں لے کر ریڈیو کے کمرے میں چلے گئے۔ موڈی کو ڈھولک کے گیت بہت پسند تھے۔ ان گیتوں پر وہ خوب ناچتا تھا۔ میں نے سٹیشن بدلے اور کہیں سے ڈھولک کا گیت نکال ہی لیا جس پر موڈی نے نہایت اچھا RUMBA ناچا۔ گیت کے بعد کوئی صاحب طبلہ بجانے لگے۔ صرف طبلہ بج رہا تھا۔ نہ جانے تین تالہ تھا یا چار تالہ یا پانچ تالہ۔ کچھ ایسی آواز آ رہی تھی۔ تیرٹ تم۔ تیرٹ تم۔ تیرٹ تم۔ تیرٹ تم۔

اچانک موڈی بولا۔ "یہ شخص MISFIRE کر رہا ہے۔" موڈی کو کاروں کی مشینری سے بڑی دلچسپی تھی۔

پوزی اور فیٹی سیکنڈ شو کے لیے مصر تھے۔

لیکن بل کہہ رہا تھا چلو شارٹی سے ملیں، وہ نرس بھی وہیں ہو گی۔ ہف کو زکام تھا۔ اس لیے وہ جلدی سونا چاہتا تھا۔ آخر موڈی بولا "اچھا ٹاس کر لو۔"

اس ٹاس سے موڈی نے بڑے بڑے جھگڑے چکائے تھے۔ اس نے جیب سے سکّہ

نکال کر اچھالا اور کہا۔ چہرہ ۔ چہرہ ہی تھا!

پھر مُوڈی نے رات کی دعا مانگی جو وہ ہر شب مانگتا تھا۔ "یا خدا موڈی جونز پر رحم فرما۔ اس موڈی جونز پر نہیں جو مانچسٹر میں رہتا ہے بلکہ اس موڈی جونز پر جو اس پہاڑی کیمپ کے مَیس کے دس نمبر کمرے میں رہتا ہے۔"

مُوڈی کا ایک ہم نام واقف مانچسٹر میں رہتا تھا۔

ہمارا قیام پہاڑی علاقے میں تھا، جہاں ہر سال برفباری ہوا کرتی۔ ہمارا مَیس ایسا تھا جہاں سب کچھ ممکن تھا اور اکثر وہ سب کچھ ہو بھی جایا کرتا تھا۔ مَیس کے باغیچے میں جگہ جگہ لکھا تھا۔ "براہ کرم گھاس پر چلیے۔" "پھُول ضرور توڑیے، شکریہ۔" باہر دروازے پر لکھا تھا "کتّوں کو لانا منع تو نہیں ہے، لیکن ہمارے ہاں پہلے ہی بے شمار کتّے اور بلّیاں موجود ہیں۔" اس نوٹس کو پڑھ کر ایک مرتبہ ایک حسّاس کتّا واپس چلا گیا تھا اور ہمیں اسے منا کر لانا پڑا۔ ایرانی بلّیاں اتنی موٹی ہو گئی تھیں کہ دُور سے کتّے معلوم ہوتی تھیں اور کئی کتّے تو ان سے ڈرتے بھی تھے۔ کمروں کے باہر کئی جگہ لکھا تھا۔ "خاموش ہرگز مت رہیے، عنایت ہو گی۔"

مَیس میں ہر وقت دھما چوکڑی رہتی۔ کئی حضرات شغل کے طور پر بڑھئی کا کام سیکھ رہے تھے۔ چند حضرات بڑی ہیبت ناک آواز کے ساز بجایا کرتے۔ ہر کمرے میں ریڈیو یا گراموفون ضرور تھا اور پھر کتّوں اور بلّیوں کا آپس میں تبادلۂ خیالات، شکر رنجیاں اور خفگیاں، پالتو پرندوں کا شور۔

مَیس میں ہم چالیس کے قریب تھے۔ لیکن ہماری پارٹی کے صرف سات ممبر تھے۔ موڈی، ہفتہ، شنارکی، بل، پوزی، فیٹی اور مَیں۔ پہلے میں ایک بڑے سارے کمرے میں

رہا کرتا تھا جس میں ایک صاحب رات کو سوتے سوتے بولا کرتے تھے اور دوسرے صاحب سوتے سوتے ان کی باتوں کا جواب دیا کرتے۔ وہ کمرہ میں نے تبدیل کر لیا اور مُوڈی کے کمرے کے قریب چلا آیا۔ اسی ہفتے موڈی اور مَیں دوست بن گئے۔ ہُوا یوں کہ مَیں کھانا ختم کر چکا تھا اور میرے سامنے مُوڈی بیٹھا تھا۔ مَیں نے پوچھا۔ اگر مَیں سگریٹ پیوں تو اسے بُرا تو نہیں معلوم ہو گا؟ اس نے مسکرا کر کہا۔ بُرا تو بعد میں لگے گا پہلے ایک سگریٹ مجھے بھی دو ۔!

رات کو ڈنر کے بعد گانے گائے گئے۔ مُوڈی نے ایک عجیب سا گانا شروع کیا جس کے شروع کے بول تھے ۔ 'کاش کہ مَیں ایک کنگرو ہوتا۔' اس گانے میں کسی نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مَیں نے فوراً گانا شروع کر دیا۔

باقی کے پانچ دوست ناشتے پر دیر سے آنے کی وجہ سے بنے۔ ہم ساتوں ناشتہ دیر سے کیا کرتے تھے۔ ملازموں کو انتظار کرنا پڑتا اور وہ ہم سے کافی تنگ آئے ہوئے تھے۔

مَیس میں اگر کوئی منہ بناتا یا بیزار نظر آتا تو موڈی اسے جھنجھوڑ ڈالتا اور کہتا کہ ہنسو، مسکراؤ۔ بیزار ہونا چاہتے ہو تو کہیں علیحدہ جا کر بخوشی ہو لو۔ بھلا اوروں کو بیزار کرنے کا تمہیں کیا حق ہے؟ اگر کوئی تنہا چُپ چاپ غمگین بیٹھا ہوا مل جاتا تو موڈی آہستہ سے اس کے پاس جا کر بڑی سنجیدگی سے پوچھتا۔ یہ کب کا ذکر ہے؟ مرحوم کی عمر کیا تھی؟ علاج کون کر رہا تھا؟ بڑا افسوس ہُوا۔ اب آپ ہی صبر کیجیے۔ اگلے کیسے ہیں کس کو دخل ہے؟

لہٰذا موڈی سے سب ڈرتے تھے۔ جونہی وہ مَیس میں داخل ہوتا سب مسکرانے پر مجبور ہو جاتے۔

موڈی کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ اس کی بیوی کا عرصے سے انتقال ہو چکا تھا اس لیے اس کا اصرار تھا کہ اسے بھی کنواروں میں شمار کیا جاتے وہ کہا کرتا کہ میرا تبادلہ بہت جلد ہو جاتا ہے۔ ابھی کہیں سے آیا ہوں، کسی لڑکی سے علیک سلیک ہوتی ہے فوراً

کہیں تبادلہ ہوگیا۔ ان لگاتار تبادلوں کی وجہ سے میں دوبارہ شادی نہیں کرسکا۔

اس کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی اور مسکراہٹ بھی ایسی کہ جیسے وہ باقاعدہ ہنس رہا ہو۔ سب کا خیال تھا کہ موڈی سوتے ہوئے بھی مسکراتا رہتا ہوگا۔ وہ سر میں مانگ نکالتا تھا اور وہ مانگ چھ انچ چوڑی ہوتی کیونکہ وہ "فارغ البال" تھا، یعنی سر سے بال غائب تھے۔

صبح صبح ناشتے کی میز پر موڈی ہمیں دیکھ کر کہا کرتا۔ کل اتوار تھا، آج پیر ہے۔ کل منگل ہوگا اور پرسوں بدھ۔ دیکھا، نصف ہفتہ تو یونہی گزر گیا اور ہم نے کچھ بھی نہیں کیا۔

کسی جگہ اسے کوئی ڈاکیہ نظر آجاتا وہ فوراً لپک کر اس سے پوچھتا کہ کوئی خط ہے؟ ڈاکیہ پوچھتا، کس کے نام کا؟ یہ کہتا نام وام کچھ نہیں۔ اگر کوئی خط ہے تو دے دو۔

موڈی مَیس میں بیٹھ کر یوفونیم بجایا کرتا۔ ایک بہت بڑا سا بے ڈھنگا ساز جس کو جسم کے چاروں طرف لپیٹ کر زور سے پھونک مارتے ہیں تو بڑی بھدی اور بے سُری آواز نکلتی ہے۔ سب کے سب اس ساز سے تنگ آئے ہوتے تھے، لیکن موڈی کا یہ محبوب ترین ساز تھا۔ وہ کہا کرتا کہ یہ ایک ایسا ساز ہے جس کو نومشق اور استاد ایک ہی طرح بجاتے ہیں۔ پچ TICH کا یہ خیال تھا کہ کچھ ساز یوفونیم سے بھی برے ہیں اور وہ ہیں دو یوفونیم۔

پچ جب کبھی ہمیں کچھ سمجھاتے تو بعد میں پوچھتے۔ کوئی سوال کرنا چاہے تو بے شک کر سکتا ہے سوائے موڈی کے۔

موڈی کے پاس کئی کتے تھے۔ ایک تو انگلش بل ڈاگ تھا جس کو بقول موڈی کے انگلش کا ایک لفظ بھی نہ آتا تھا۔ ایک اور اونچا سا خوبصورت کتا تھا جس کو ہم طرح طرح کے تماشے کرنا سکھاتے۔ وہ باقاعدہ ہاتھ ملا سکتا تھا، پنجے سے سلام کرسکتا تھا۔ دو ٹانگوں پر کھڑا ہوکر نقلیں اتار سکتا تھا۔ منہ میں پائپ دبا کر ساتھ ساتھ چل سکتا تھا۔

شارٹی زندگی سے بیزار رہتا اور سست بھی تھا۔ بقول موڈی کے وہ فوٹوگرافی کی طرح تھا۔ یعنی ڈارک روم میں بیٹھ کر انتظار کیا کرتا تا کہ دیکھیے کیا DEVELOP ہوتا ہے۔

بعض اوقات تو وہ اتنا بیزار ہوجاتا کہ برآمدے میں بیٹھا رہتا اور کسی کو پتہ تک نہ چلتا کہ شارٹی بیٹھا ہے۔ اور سستی کی یہ حالت تھی کہ سال میں صرف ایک مرتبہ دعا مانگتا تھا اور ہر رات "ایضاً" کہہ کر سوجاتا۔

بل دُبلا پتلا اور بے حد باتونی تھا۔ اتنا باتونی کہ ضرور اسے گراموفون کی سوئی سے ٹیکا کیا گیا ہوگا۔ وہ خود کہا کرتا کہ میں بچپن میں اس قدر دُبلا تھا کہ استاد اکثر میری غیر حاضری لگا دیا کرتے تھے۔

پوزی اور فیتی دونوں ایک سے تھے۔ موٹے تازے اور مسخرے۔ پوزی بہت پیتا تھا۔ موڈی کہا کرتا کہ خدا کے لیے کوئی اس کے پاس جلتی ہوئی دیا سلائی مت لانا ورنہ اس میں اس قدر الکحل ہے کہ یہ بھک سے اڑ جائے گا۔ پوزی سکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا۔ پیتے پیتے وہ کہا کرتا۔ میں نصف تو سکاچ ہوں اور نصف ۔۔۔ نصف سوڈا ہوں۔

ہف نہایت بھولا بھالا اور خاموش طبیعت لڑکا تھا۔

کبھی کبھی موڈی کا ایک دوست ملنے آیا کرتا تھا ۔۔۔ ایک امریکن حبشی۔ جس کا نام سنو وائٹ تھا۔

مَیس کے بالکل نزدیک ٹونی کا بنگلہ تھا۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی اور تین لڑکیاں رہتی تھیں۔ جوئی، روزی اور لزا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جوئی اس جگہ، اس علاقے، بلکہ اس طول بلد اور عرض بلد کی حسین لڑکی ہے۔ اور لوگوں کا خیال صحیح تھا۔

سب لڑکے جوئی پر فریفتہ تھے لیکن وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ جوئی کی نظروں میں

آنے کے لیے ہم سب کیسے کیسے جتن کرتے۔ صبح سے شام تک ہر وقت بس یہی خبط رہتا۔ جب جوآلی گھوڑے کی سواری کیا کرتی تو ہم سائیکلوں پر اِدھر اُدھر چکر لگایا کرتے۔ وہاں اور گھوڑے تھے تو سہی، لیکن کم بخت اتنے اُونچے تھے کہ ان پر سواری کرنے سے پہلے پیراشوٹ باندھنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

پھر ایک روز عجب تماشا ہوا۔ مَیں کلب کے تالاب میں تیر رہا تھا اور وہ کنارے پہ آ بیٹھی۔ کچھ دیر تک دیکھتی رہی۔ اسے دیکھ کر مَیں نے خوب تیرنا شروع کر دیا۔ اسے میرا سٹائل بہت پسند آیا۔ بولی ٹارزن کی فلموں میں بالکل یہی سٹائل ہوتا ہے۔ مَیں نے کہا۔ یہ تو بہت آسان ہے۔ اگر تم چاہو تو چند دنوں میں سیکھ لوگی۔ اگلے روز سے میں اِسے سکھانے لگا۔ اور سب حضرات جل بھُن کر کوئلہ ہو گئے۔ سہ پہر کو مَیں دھُوپ میں کھڑا ہو کر شیشے سے سُورج کی کرنیں جوُلی کے کمرے میں پھینکتا اور وہ چلی آتی۔ جب ہم تیرتے تو بقیہ حضرات کنارے پر کرسیاں بچھا کر بیٹھ جاتے۔ کئی ایک تو تیرتے بھی، لیکن عجب اوٹ پٹانگ طریقے سے۔ جوآلی کو جو سٹائل ایک مرتبہ پسند آیا وہ پسند رہا۔ مَیں نے وعدہ تو چند دنوں کا کیا تھا، لیکن ہفتے گزر گئے تھے اور ابھی دوسرا سبق تھا۔

ایک اور کُنبہ بھی ہمارے نزدیک ہی رہتا تھا۔ سُندرم کا کُنبہ۔ سُندرم جنوبی ہند کے تھے۔ ان کی تین لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا جو کہیں باہر تھا۔ ہمارے میس میں ایک لڑکا اپوتم جنوبی ہند کا تھا وہ ہر وقت سندرم کی منجھلی لڑکی راج کا ذکر کیا کرتا۔

سہ پہر کو مَیں اور جوُلی تیرنے گئے۔ سُورج خوب چمک رہا تھا۔ تالاب کے چاروں طرف پھُول ہی پھُول تھے۔ پھُول اتنی خوبصورتی سے لگائے گئے تھے کہ جیسے کوئی خوشنما قالین بچھا ہوا ہو۔ جوُلی تیرنے کے لباس میں بالکل جَل پری معلوم ہو رہی تھی۔ آج غوطہ لگانے کا سبق

تھا۔ تالاب میں ایک طرف تو پانی بالکل پایاب تھا اور دوسری طرف بہت گہرا۔ جوآلی کو گہرے پانی سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ جب مَیں نے کہا کہ چلو تمہیں گہری طرف لے چلوں تو بولی اور جو جی گھبرا گیا تو؟ مَیں نے کہا کہ مَیں جو ساتھ ہوں، تم میرا بازو تھام لو۔ ہم دونوں گہرے پانی میں چلے گئے۔ تہہ میں ایک گول سا پتھر چمک رہا تھا۔ کہنے لگی غوطہ لگا کر اسے لے آئیے۔ مَیں نے کہا دونوں چلیں گے۔ مَیں اسے تہہ میں لے گیا جہاں اُس نے خود پتھر اُٹھا لیا۔ اب اسے غوطہ لگانا آ گیا تھا۔ ہم شرط لگا کر پتھر گہرے پانی میں پھینکتے کہ دیکھیں پہلے کون اُٹھا کر لاتا ہے۔ بعض اوقات تو تہہ میں پتھر کے لیے چھینا جھپٹی بھی ہوتی۔ جب تھک جاتے تو چھلانگ لگانے والے تختے پر لیٹ کر دھُوپ سینکنے لگتے۔

میس میں اکثر شور و غل مچتا۔ لینکی تم اتنے خود غرض کیوں ہو؟ کسی اور کو بھی موقع دو۔ واہ! اچھے دوست ہو۔

اپوتم راج کا ذکر شروع کر دیتا۔ اتنی تعریفیں کرتا کہ بس ایشیا بھر میں اگر کوئی حسین لڑکی ہے تو راج ہے۔ اور اتنی اچھی باتیں کرتی ہے، اتنا اچھا لباس پہنتی ہے، اتنا اچھا گاتی ہے اور رقص کی بھی ماہر ہے۔

مَیں سندرم کے ہاں جایا کرتا تھا اور راج کو جانتا تھا، لیکن مَیں نے اسے ناچتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ جب کبھی ان کے ہاں جاتا ہمیشہ بیک گراؤنڈ میں ہلکی ہلکی موسیقی سنائی دیا کرتی، بچّوں کے رونے کی۔ ان میں سے ایک کی تو نہایت خود غرض آواز تھی جو اوروں سے بالکل علیحدہ اور نمایاں ہوتی۔ بچّے کئی طرح روتے ہیں۔ کئی بچّے ایک تالہ میں روتے ہیں کئی تین تالہ میں۔ کئی الاپ سے شروع کرتے ہیں اور الاپ پر ختم کر دیتے ہیں۔ کئی ترانے گاتے ہیں اور کئی بحرِ طویل میں ہلکے پھلکے راگ گاتے ہیں۔ لیکن ان کے ہاں گانوں کا مِلا جُلا پروگرام ہوا کرتا تھا۔ آخر ایک روز مَیں نے پوچھ ہی لیا کہ یہ بچّے کتنے ہیں اور کیوں روتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ گھر میں صرف ایک بچّہ ہے۔ سندرم کے بڑے لڑکے کا بچّہ

جو دانت نکال رہا ہے۔ اور مجھے یقین نہ آیا کہ یہ صرف ایک بچّہ اس خوبصورتی کے ساتھ رہ سکتا ہے جو کبھی سو لو معلوم ہو کبھی ڈُو ڈیبیٹ اور کبھی کورَس۔

سنیچر کی رات کو کلب میں ڈانس ہوا ـــــ ہم سب گئے۔ کافی رونق تھی۔ میٹرن بھی اپنی نرسوں سمیت آئی تھیں۔ مُوڈی کو ایک پارے کی طرح مچلتی، تڑپتی اور بل کھاتی ہوئی نرس پسند آئی۔ یہ وہی نرس تھی جس نے ہسپتال میں شارٹی کا قیام طویل کر دیا تھا۔ مَیں اور موڈی ایک محراب کے نیچے کھڑے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ یکایک ایک صاحب بھاگے بھاگے آئے اور زور سے ایک مُکّہ موڈی کے رسید کیا۔ موڈی نے پلٹ کر دیکھا، وہ شرمندہ ہو کر بولے "معاف کیجیے غلطی ہوئی، مَیں سمجھا آپ برڈی ہیں"۔

موڈی نے فوراً کہا "اگر مَیں برڈی بھی ہوتا تب بھی آپ کو اتنے زور سے مُکّہ مارنے کا کوئی حق نہیں"۔

وہ صاحب بولے "اب جبکہ آپ برڈی نہیں ہیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ مَیں برڈی کو کتنے زور سے مُکّہ مارتا ہوں"۔

موسیقی شروع ہو گئی۔ مُوڈی مجھے لے کر میٹرن کے پاس پہنچا۔ مجھے تو ان کے حوالے کیا اور خود اسی نرس کے ساتھ رقص کرنے لگا۔ یہ میٹرن کافی قبر رسیدہ تھیں، لیکن مجھے مجبوراً ان کے ساتھ ناچنا پڑا۔ انہوں نے باتیں بھی کیں، لیکن اس انداز سے کہ آؤ ہم دونوں میرے متعلق باتیں کریں۔ رقص کے بعد مَیں نے موڈی کو جا پکڑا۔ مَیں مُوڈی اور وہ نرس تینوں ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ موڈی اس سے کہہ رہا تھا "تم مجھے اپنی زندگی کے متعلق بتاؤ زندگی کے منصوبوں کے متعلق بتاؤ۔ زندگی کے منصوبوں کے متعلق بتاؤ۔ اپنی اُمیدوں اور تمنّاؤں کے متعلق بتاؤ اور اپنے ٹیلی فون کے نمبر کے متعلق بتاؤ۔" پھر اسے پکچر کی دعوت دی؛

وہ بولی "شکریہ! لیکن بھلا مَیں ایک مکمل اجنبی کے ساتھ کیونکر جا سکتی ہوں"؟ موڈی نے شرما کر کہا "یہ کون کہتا ہے کہ مَیں مکمل ہوں"۔ اس نے بتایا کہ وہ دو تین دن تک چند ماہ کی ٹریننگ کے لیے باہر چلی جائے گی۔ موڈی بولا "پھر تو لازمی طور پر پہلی نگاہ میں محبت ہو جانی چاہیے، کیونکہ وقت بہت تھوڑا ہے"۔

موسیقی شروع ہو گئی اور وہ دونوں ناچنے لگے۔ مَیں وہیں بیٹھا رہا حتیٰ کہ میٹرن میرے ساتھ آ بیٹھیں اور بولیں "آؤ ہم دونوں میرے متعلق باتیں کریں"۔ اور پھر دفعتہً جیسے آنکھوں کے سامنے بجلی کوند گئی۔ جُولی ہال میں داخل ہوئی اور سب کچھ ماند پڑ گیا۔ سب کی نگاہیں اس کی جانب اٹھیں اور وہیں جم کر رہ گئیں۔ چاروں طرف ہلچل سی مچ گئی۔

"ہلو لینگی بوائے"۔ مسز ٹُونی نے میری طرف ہاتھ ہلایا۔ ذرا سی دیر میں مَیں اور مسز ٹُونی ناچ رہے تھے۔ وہ سوچ رہی ہوں گی کہ نہ جانے اس لڑکے کا دھیان کس طرف ہے۔ اور مَیں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے آج کس کا منہ دیکھا تھا کہ پہلے میٹرن ملیں اور اب مسز ٹُونی۔ اُدھر ہف اور جولی ناچ رہے تھے۔ اتنے میں بِل نے آگے بڑھ کر ہف کے کندھے کو چھُوا، اسے ہٹا کر خود جولی کے ساتھ ناچنے لگا۔ پوزی اور فیٹی بھی منتظر تھے۔ اب یہ ہو رہا تھا کہ ایک لڑکا جولی کے ساتھ بمشکل ایک منٹ ناچتا ہو گا کہ دوسرا اسے ہٹا کر خود ناچنے لگتا۔ پھر تیسرا آ جاتا۔ ساتھ ہی چبھتے ہوئے فقرے بھی ہو رہے تھے۔ ہف نے جولی سے کہا "میری تصویر اخبار میں چھپی تھی"۔ بل نے جھٹ پوچھا۔ "اچھّا! بھلا انہوں نے انعام کیا مقرر کیا تھا"؟ ہف بل سے بولا "کاش کہ تم سے ملنے سے پہلے میرا انتقال ہو چکا ہوتا"۔ پوزی بل سے کہہ رہا تھا۔ "اگر تمہیں اپنی زندگی دوبارہ بسر کرنے کا موقع ملے تو انکار کر دینا"۔ فیٹی پوزی سے بولا "تمہاری حرکتیں کسی بیل جیسی ہیں اور تمہارا دماغ بھی ویسا ہی ہے"۔ بل نے کہا "مَیں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ کسی نے درست کہا ہے کہ عقلمند ہمیشہ ایک طرح سوچتے ہیں"۔ ہف نے بات کاٹی۔ "اور بیوقوف کبھی ایک دوسرے سے اختلاف نہیں کرتے"۔

پوزی کہہ رہا تھا۔"تم لوگوں سے بحث بے کار ہے۔ تم تو ایک شتر مرغ کو بھی بیزار کر دو گے۔" مُوڈی ہمیں گھُور گھُور کر دیکھ رہا تھا۔ رقص کے بعد وہ ہم سب کو ایک طرف لے گیا اور ڈانٹنے لگا۔"افسوس آتا ہے تم لوگوں پہ۔ تمہاری حرکتیں دیکھ دیکھ کر مَیں بیزار ہو جاتا، طیش میں آجاتا، خفا ہو جاتا، اگر مَیں خود اس قدر مصروف نہ ہوتا۔ تم آپس میں فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے؟"

"فیصلہ کس طرح کیا جائے۔ یہ معمّہ تو ایسا پیچیدہ ہے کہ ارسطو کو بھی پریشان کر دے۔" شارٹی نے جواب دیا۔

موڈی کہنے لگا۔"میں فیصلہ کیے دیتا ہوں۔ شارٹی تم قد میں جولی سے چھوٹے ہو، اس کے ساتھ ناچتے ہوئے بہت بُرے معلوم ہوتے ہو۔ بل تم نے مہینوں سے حجامت نہیں کرائی۔ عجب وحشی معلوم ہو رہے ہو، بالکل پتھر دھات کے زمانے کے۔ تم بھی ایک طرف بیٹھو۔ پوزی تم بہت پی گئے ہو۔ فیٹی تمہارا لباس ایسا ہے جیسے ابھی گٹھڑی سے نکالا نکالا گیا ہو۔ بے شمار سلوٹیں پڑی ہوئی ہیں۔ اب رہ گئے لینکی اور ہیف۔ تم دونوں واقعی اچھے معلوم ہو رہے ہو۔ تمہارے لیے مَیں ٹاس کیے دیتا ہوں۔" مَیں نے موڈی کو اشارہ کیا۔ اُس نے آہستہ سے میرے کان میں کہا۔"چہرہ"! مُوڈی نے جیب سے سکّہ نکال کر اُچھالا مَیں نے چہرہ مانگا۔ چہرہ ہی تھا۔ جب مَیں اور جولی رقص کر رہے تھے تو سب ہمیں دیکھ رہے تھے۔ جولی بولی۔"یہ سب مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟ مَیں نے کوئی شوخ چیز پہن رکھی ہے کیا؟"

مَیں نے کہا۔"ہاں ایک چیز بہت شوخ ہے۔"

پوچھنے لگی۔"کیا ہے بھلا؟" مَیں نے کہا۔"تمہارا چہرہ"! ہم رقص کرتے ہوئے موڈی کے سامنے سے گزرے۔ وہ نرس سے کہہ رہا تھا۔"یہ تھے میری زندگی کے حالات۔ اگر ان میں سے کچھ ایسے ہوں جو تمہیں پسند نہ آئے ہوں تو مَیں انہیں دوبارہ بسر کرنے کو تیار ہوں کہو

تو آج سے نئے سرے سے زندگی شروع کر دوں۔"

جب والز شروع ہوا تو روشنی مدھم کر دی گئی۔ مَیں نے اسے وہ نظم سنائی۔"اے میری محبوب! اگر مَیں بادشاہ ہوتا۔" اُس نے پوچھا۔"تم نے پہلے بھی یہ نظم کسی کو سنائی تھی؟" مَیں نے کہا۔"ہاں سنائی تھی کئی مرتبہ۔ لیکن تب تک مَیں نے اس حسین و جمیل جولیٹ کو نہیں دیکھا تھا۔" کہنے لگی۔"مَیں خوش ہوں کہ تم نے ایک تو سچ بولا۔"

اگلی صبح کو مُوڈی نے ہم سب کو پھر ڈانٹا۔ بولا۔"آئندہ جب کبھی ڈانس پر جانا ہو تو پہلے سے فیصلہ کر لیا جائے کہ جولی کے ساتھ کون ناچے گا، اور ہر بار ایک قسم کا ٹورنمنٹ منعقد ہوا کرے۔" لڑکوں نے اعتراض کیا۔"اور یہ لینکی؟ یہ تو اس کے ساتھ تیر بھی لیتا ہے۔ ہمیں ایسے موقعے کیوں نہیں ملتے؟"

مُوڈی بولا۔"تمہاری قسمت۔ اگلے ڈانس کے لیے ٹورنمنٹ کل سے شروع ہو گا۔ برج کھیلا جائے گا۔ شرائط مَیں بتا دوں گا۔"

سہ پہر کو مَیں اور موڈی چائے کے لیے آرہے تھے۔ دیکھتے ہیں کہ راستے میں ایک جگہ فٹ بال کا میچ ہو رہا ہے۔ ہم دونوں ٹھہر گئے۔ تماشائیوں میں سنو وائٹ بھی کھڑا تھا۔ موڈی نے آواز دی، وہ آگیا۔ کہنے لگا۔"بھئی ناحق آپ دونوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ یہ لوگ گول نہیں کریں گے۔ مَیں ہفتے سے ہر روز یہاں آرہا ہوں۔ نہ یہ اُن کو گول کر سکتے ہیں اور نہ دوسری ٹیم نے اس قسم کی گستاخی کی ہے۔"

موڈی بولا۔"تو پھر تم کیوں روز آتے ہو؟"

وہ بولا۔"اسی امید پر کہ شاید کسی روز گول ہو جائے۔ سوا چار بج کر تین منٹ ہو چکے ہیں، اب انٹرول ہونے والا ہے۔"

سنو وائٹ ہمیشہ وقت عجیب طریقے سے بتایا کرتا تھا۔ پونے آٹھ بجنے میں چار منٹ ہیں۔ بارہ بج کر بیس منٹ ہونے میں دس منٹ باقی ہیں۔ ہم نے اسے چاء کے لیے کہا۔

"مَیں تیار ہوں لیکن اگر میری غیر موجودگی میں کوئی گول ہو گیا تو مجھے بہت افسوس ہو گا۔"

ہم تینوں مَیس کی طرف چل دیے۔ سنو وائٹ سردی کی شکایت کرنے لگا کہ اس قدر سردی ہے کہ تھرما میٹر پڑھنے کے لیے اسے گرم پانی میں ڈالنا پڑتا ہے۔

"اور تمہاری جیپ کہاں ہے؟"

"اسے میرا افسر لے گیا ہے۔ کچھ دن ہوئے جیپ پر بجلی گری تھی۔ بجلی کی مرمت کرائی گئی۔"

"رات کو تم ڈانس پر نہیں آئے؟" مَیں نے پوچھا۔

"پچھلے ہفتے عجب تماشا ہوا۔" وہ بولا۔ "ایک لڑکی نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہیں ناچنا آتا ہے؟ لطف یہ ہے کہ مَیں اور وہ لڑکی اس وقت ناچ رہے تھے۔ اسی لیے مَیں رات نہیں آیا۔"

مَیس میں پہنچے۔ بل ایک کونے میں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ سنو وائٹ نے پوچھا۔

"کیا پڑھ رہے ہو؟"

"شیکسپیئر!" بل بولا۔

"شیکسپیئر۔" سنو وائٹ نے کہا "خوب! اسے کس نے لکھا ہے؟"

"تمہیں دودھ پسند ہے؟" مَیں نے چاء کے سلسلے میں پوچھا۔

"ہاں! اگر اس میں کافی ملی ہو۔" سنو وائٹ نے جواب دیا۔

"اور نمک؟"

"ہاں! اگر انڈوں پر چھڑکا ہوا ہو۔"

"اور کالی مرچ؟"

"ہاں! اگر مچھلی کے قتلوں پر تھوڑی سی چھڑک دی جائے۔"

سنو وائٹ شارٹی کو تلاش کر رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ سویا ہوا ہے۔ سنو وائٹ نے کھڑکی سے کود کر اسے بمشکل جگایا اور بولا "سناؤ کیا حال ہے؟" شارٹی آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا۔ "اچھا ہے۔ کوئی خاص بات تھی کیا؟"

سنو وائٹ کہنے لگا "نہیں۔ بس یونہی مَیں نے کہا ذرا حال پوچھتے چلیں — اب تم بے شک سو جاؤ۔"

ہم چائے پی رہے تھے کہ ہف آ گیا۔ کہنے لگا "چاء پر انڈے اور مچھلی۔ یعنی تم لوگ چاء پیتے نہیں، چاء کھاتے ہو۔ یہ آج تمہارے بیرے نے کپڑے دوہرے پہن رکھے ہیں۔"

"یہ کپڑے دوہرے نہیں، بیرا دوہرا ہے۔" موڈی بولا۔ اتنے میں بیرے نے موڈی کے کپڑوں پر کچھ گرا دیا۔

"دیکھتے نہیں؟ تم نے میرے کپڑوں پر مارملیڈ گرا دیا ہے۔"

"اوہ! یہ مارملیڈ تھا، مَیں سمجھا جام ہے۔" بیرا بولا۔

"تمہارے ہاں بھی نہایت نامعقول بیرے ہیں۔" سنو وائٹ نے بتایا۔ "کل مَیں نے اپنے بیرے سے کہا کہ جوتوں کو یوں چمکاؤ کہ چہرہ نظر آنے لگے۔ وہ بولا یوں چمکا تو دوں گا لیکن آپ اپنے عکس کو پسند نہیں کریں گے۔"

سنو وائٹ سگریٹ بہت پیتا تھا۔ دن میں سو سو سگرٹیں پی جاتا تھا — اپنی عادت کو کوس رہا تھا "تبھی تو میری صحت اچھی نہیں رہی۔ مَیں بیزار رہتا ہوں۔ قنوطی بن گیا ہوں۔ تصویر کا ہمیشہ تاریک رخ دیکھتا ہوں۔ کل مَیں اتنا بیزار تھا کہ جب صبح آئینہ دیکھا تو میرا عکس بولا۔ چچ۔ چچ۔ بیچارہ!"

"لیکن یہ سگریٹ کی عادت تمہیں کس نے ڈال دی؟"

"دو چیزوں نے!"

"وہ کیا ہیں؟"

"سگریٹ اور ماچس۔"

انویم بتایا کرتا کہ راج اس پر بُری طرح فریفتہ ہے اور آج کل بیچاری کی حالت مخدوش ہے۔ راج یوں خط لکھتی ہے۔ یوں ملاقات کے لیے منتیں کرتی ہے۔ انویم دیکھنے میں کافی بجھا ہوا تھا۔ اس نے ہم سب کو اتنا تنگ کیا کہ مُوڈی نے مجھے کہا کہ اسے خاموش کرنے کا انتظام ہونا چاہیے۔ مَیں اگلے روز سندرم کے ہاں گیا اور راج سے سنیما کے لیے کہا۔ وہ بولی، امّی سے اجازت لے لیجیے۔ مَیں نے مسز سندرم سے پوچھا۔ وہ کچھ ہچکچانے لگیں۔ بولیں، جانے میں تو کوئی حرج نہیں۔ ویسے کہیں لوگ باتیں نہ بنانے لگیں۔ مَیں نے ننھی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ اگر مَیں ننھی کے ساتھ جاؤں، تب تو لوگ باتیں نہیں بنائیں گے، وہ ہنس دیں، بولیں "اچھا تم راج کو لے جاؤ۔" اس شام راج خوب بن سنور کر میرے ساتھ نکلی۔ پہلے ہم نے سائیکلوں پر مَیس کے گرد کئی چکّر لگاتے تا کہ انویم ہمیں اچھی طرح دیکھ لے۔ جب اُس نے دیکھ لیا تو سنیما گئے۔ راج نے مجھے خوب ہنسایا۔ اس کے سامنے ایک صاحب بہت بڑا صافہ سر پہ رکھے بیٹھے تھے جس سے اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ان سے بولی "براہ کرم اس صافے کو اتار لیجیے۔" انہوں نے صافہ اتار لیا۔ وہ پکچر نہایت ہی فضول تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد راج ان صاحب سے بولی "براہ کرم صافہ پھر سر پہ رکھ لیجیے، شکریہ۔"

سندرم کے ہاں سے مَیس میں ڈرتا ڈرتا پہنچا تو مجھے گھیر لیا گیا۔ مُوڈی نے میرے ہاتھ میں ایک نیلے رنگ کا لفافہ دے دیا۔ یہ لفافہ روفی کا تھا۔ روفی کی طرزِ تحریر بالکل زنانہ ہے۔ مَیں کھول کر خط پڑھنے لگا۔

مُوڈی نے پوچھا "کیا یہ اب تک تم سے محبت کرتی ہے؟"

"محبت کرتی ہے؟ کون؟"

"یہی جس نے خط لکھا ہے۔"

"یہ تو روفی ہے، میرا دوست۔"

"اچھا تو اب تم یہ اصرار کرو گے کہ روفی کوئی لڑکا ہے۔"

"تم یہ بتاؤ۔" بل بولا "کہ تم نے آج کل یہ کیا وطیرہ اختیار کر رکھا ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہی کہ تم صبح ایک لڑکی کے ساتھ دیکھے جاتے ہو۔ دوپہر کو کسی اور لڑکی کے ساتھ تیرتے ہو۔ شام کو اور لڑکیوں کے ساتھ سیر کرتے ہوئے پائے جاتے ہو اور رات کو پکچر میں تمہارے ساتھ کوئی اور لڑکی ہوتی ہے۔"

"میرے پاس سائیکل جو ہے۔" مَیں نے کہا۔

"سائیکلیں تو ہم سب کے پاس ہیں۔ بس بات یہ ہے کہ تم اوّل درجے کے ہرجائی ہو۔ تمہارا دل ہوٹل کی طرح ہے جس میں ایک اور مسافر کے لیے ہمیشہ جگہ رہتی ہے۔ کیوپڈ تمہاری مرتبہ تیر استعمال نہیں کرتا بلکہ مشین گن سے کام لیتا ہے۔"

اگلے روز چھٹی تھی۔ رات کو سب نے پینا شروع کر دیا۔ مجھے اور ہیف کو ساتھ بٹھایا گیا۔ ہم دونوں اتنی سردی میں لیمن سکواش پی رہے تھے۔ مُوڈی بتا رہا تھا "کل مجھے ہلکی سی حرارت ہو گئی تھی جس نے اس سردی میں مجھے گرما سا دیا۔ بڑی فرحت حاصل ہوئی۔"

بل نے کہا "مَیں اپنے کمرے کے باہر ایک نوٹس لگا رہا ہوں۔ وائیلن اور ٹرمبون برائے فروخت۔"

پوزی جو بل کا پڑوسی تھا، بولا۔ "اور میں اپنے کمرے کے باہر ایک نوٹس لگا رہا ہوں "ہُرّاہ!"

ایک طرف سے فیٹی کی آواز آئی۔ "موڈی تم نہایت مسخرے ہو اور تم پر کبھی مُوڈ سوار نہیں ہوتا۔ اس لیے تم موڈی ہرگز نہیں ہو، البتّہ تمہیں جوزز کہا جا سکتا ہے۔"

مُوڈی نے فرشی سلام کے ساتھ شکریہ ادا کیا۔ بیرے کو آواز دی کہ کوئی نمکین چیز لاؤ۔ اس نے آکر بتایا "صاحب آج نمکین چیز تو صرف جنگلی بٹیر ہے۔"

مُوڈی گلاس ختم کرتے ہوئے بولا "جنگلی چھوڑ کر وحشی یا دیوانہ بٹیر بھی لے آؤ تو کوئی مضائقہ نہیں۔" آہستہ آہستہ سب کو چڑھ رہی تھی۔ موڈی کہہ رہا تھا "سنا ہے کہ ایک نیا گراموفون ایجاد ہوا ہے جو اتنا سستا ہے کہ موجد کا دعوٰی ہے کہ سارے ریکارڈ توڑ دے گا۔"

شارٹی بولا "مُوڈی میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ کسی روز تمہارا یوفونیم اُٹھا کر تمہارے سر پر دے ماروں۔ پھر خیال آتا ہے کہ مفت میں یوفونیم ٹوٹ جائے گا۔"

بل اٹھا، موڈی کے چمکتے ہوئے سر میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے اپنی ٹائی درست کی اور بولا "موڈی تمہیں آج کل سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ملتی ہو گی، کیونکہ تمہارے سر پر کچھ ہے ہی نہیں۔"

موڈی نے بتایا "مَیں چند سال سے ایک بال اُگانے کی دوا سر پر لگا رہا ہوں جس سے بڑا فائدہ ہوا ہے۔ پہلے میرے سر میں تین جگہ سے بال غائب تھے۔ اب صرف ایک جگہ سے غائب ہیں۔"

ریڈیو پر جنوبی ہند کے کسی سٹیشن سے آرکیسٹرا کی گت بجنے لگی۔ انوپم جو خوب پی رہا تھا تڑپ کر اٹھا۔ چھلانگ مار کر میز پر چڑھ گیا اور کتھا کلی ناچنے لگا۔ ادھر سے پوزی لپکا۔ وہ بھی میز پر چڑھ گیا۔ پوزی انوپم کی نقل کر رہا تھا۔ ہم نے جلدی جلدی رکابیاں

چمچے اور پیالے ہٹائے۔ جتنی دیر گت بجتی رہی۔ پوزی اور انوپم کتھا کلی ناچتے رہے۔ بیف کو اور مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ ہم دونوں ان سب کو چھوڑ کر دوسرے کمرے میں کھانے کے لیے چلے گئے۔ ابھی پڈنگ باقی تھی کہ ساتھ کے کمرے سے رونے پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم بھاگے۔ جا کر دیکھتے ہیں تو سب زار و قطار رو رہے ہیں اور مَیس سارجنٹ باری باری ہر ایک کو چُپ کرا رہا ہے۔ جتنی وہ غریب منتیں کرتا اتنا ہی وہ اور دھاڑیں مار مار کر روتے۔ معلوم ہوا کہ ابھی مَیس سارجنٹ کو خط ملا کہ آئرلینڈ میں اس کے پڑدادا کا انتقال ہو گیا۔ اس نے کہیں یہ خبر ان سب کو سنائی دی۔ یہ خمار میں اس قدر حسّاس اور جذباتی بنے ہوئے تھے کہ رونے لگے۔ غریب سارجنٹ کو مصیبت پڑ گئی۔ بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ — "لِلّٰہ! آپ صبر کیجیے!" لیکن صبر کون کرتا۔ عجب چیخم دھاڑ مچی ہوئی تھی۔ رات کے دو تین بجے کہیں سونا میسّر ہوا۔

اگلے دن بڑی دیر میں جب آنکھ کھُلی تو بارہ بجے ہوئے تھے۔ مُوڈی کو جگایا آواز دی کہ اُٹھو بارہ بج چکے ہیں۔ کمرے سے آواز آئی۔ "بارہ بج چکے؟ آج کے؟"

ابھی تک کوئی اور بھی نہیں اُٹھا تھا۔ موڈی بولا "ان نالائقوں کو جگانا چاہیے۔ برج کھیلیں گے۔"

موڈی بل کے دروازے سے منہ لگا کر بولا "بل تمہارے لیے نہایت اہم پیغام ہے۔ بے حد ضروری پیغام!" اور اس نے فوراً اُٹھ کر دروازہ کھول دیا — "کیا پیغام ہے؟"

"یہی کہ اُٹھ کھڑے ہو۔" پھر پوزی کے دروازے پر گیا "پوزی تمہارے لیے ایک نہایت ضروری خبر ہے۔" پوزی بستر سے نکل آیا اور پوچھنے لگا "کیا خبر ہے؟"

"یہی کہ اُٹھ کھڑے ہو۔"

ہف کھڑکی سے سر نکال کر بولا "صبح بخیر!"

"صبح بخیر؟ غضب خدا کا۔" موڈی نے کہا۔ "دن ڈھل رہا ہے اس لیے سہ پہر بخیر کہو۔"

اُٹھ کر بیک وقت کسی نے ناشتہ کیا، کسی نے لنچ کھایا اور کسی نے چاء پی۔ پھر برج شروع ہوا۔ مَیں اور مُوڈی پارٹنر تھے۔ ہم دونوں نے سیاہ چشمے پہن رکھے تھے۔ ہف کسی گہری سوچ میں تھا۔ مُوڈی بولا "ہف! آہیں بھرنی فضول ہیں۔ یہ آہیں اور سسکیاں پچھلی صدی کے عاشقوں کے حربے تھے۔ اب تو مصوّری سیکھو، تیرنا سیکھو، باتیں بنانا سیکھو۔ لینکی کو دیکھ لو۔ جب لزا اور روزی کو تصویریں بنانی سکھاتا ہے تو وہ دونوں اس سے کتنی قریب ہوتی ہیں۔ بال چھُو رہے ہیں، رُخسار چھُو رہے ہیں، انگلیاں چھُو رہی ہیں اور پھر جُولی کے ساتھ گھنٹوں تیرنا۔ اتفاق سے کل مَیں نے خواب میں دیکھا کہ ہف جُولی کو بلا رہا ہے اور جُولی ـــ"

"ہاں، ہاں جُولی؟" ہف نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"بس اتنا ہی خواب تھا۔ باقی کا خواب آج دیکھ کر بتاؤں گا۔"

"کیا سچ مچ کوئی بات ہے ہف؟" مَیں نے پوچھا۔

"نہیں تو!" وہ شرما گیا۔

"دوستی میں محبت زیادہ ہوتی ہے، بہ نسبت محبت میں دوستی کے۔ اس لیے بھئی ہم تو جُولی کی دوستی پر قانع ہیں۔ لینکی تم روزی اور لزا کو دراصل سکھاتے کیا ہو۔؟" مُوڈی بولا۔

"کارٹون بنانے۔ تمہارا کارٹون بنا کر دکھاؤں؟" مَیں نے جواب دیا۔

"نہیں۔ کل مَیں نے اپنا ایک نہایت دلچسپ کارٹون دیکھا جو دیوار پر آویزاں تھا۔ خوب مسخرا کارٹون تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ تو آئینہ تھا اور مَیں اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ یہ

انوپم تمہیں کیوں گھُور رہا ہے؟"

واقعی انوپم بُری طرح مجھے گھُور رہا تھا۔ پھر مُوڈی نے بتایا "تمہیں کچھ پتہ بھی ہے، مجھ سے کہا گیا تھا کہ اگر یہاں سے تبادلہ کرانا چاہوں تو ہو سکتا ہے۔"

"پھر تم نے کیا کہا؟" ہم سب چونک پڑے۔

"مَیں نے انکار کر دیا۔ مجھے دو باتوں کا ڈر تھا۔ ایک تو یہ کہ شاید تم میرے جانے سے اُداس ہو جاؤ اور دوسرے یہ کہ شاید تم اُداس نہ ہو۔"

"اور وہ نرس؟"

"وہ نرس ٹریننگ کے لیے گئی ہے۔ اب باقاعدہ رجسٹرڈ نرس بن کر آئے گی۔ لیکن بخدا جب وہ میرے پاس ہو تو مجھے ذرا پروا نہیں ہوتی کہ وہ رجسٹرڈ ہے یا نہیں۔"

پوزی اور فیٹی نے انوپم اور شارٹی کو ہرا دیا۔ ادھر مَیں نے اور مُوڈی نے بل اور ہف کو ہرا دیا۔ اب دوسرا میچ شروع ہوا۔ سہ پہر تک مَیں نے اور موڈی نے پوزی اور فیٹی کو نکال دیا۔ اب فائنل کا فیصلہ باقی تھا۔ مَیں نے موڈی کے کان میں کہا۔ مُوڈی تم بہت اچھے دوست ہو، اس دفعہ مجھے جتا دو۔ اگلا ڈانس تمہارا رہا۔ موڈی چپکے سے بولا "چہرہ مانگنا۔" اس نے جیب سے سکّہ نکال کر ہوا میں اچھالا۔ مَیں نے چہرہ مانگا۔ چہرہ ہی تھا۔

ٹونی اور ان کی بیوی نے ہمیں پک نک پر بلایا۔ آٹھ دس میل پرے پہاڑوں میں ایک جھیل تھی۔ طے ہوا کہ وہاں مچھلیاں پکڑیں گے اور پہاڑوں پر چڑھیں گے۔ ہم سائیکلوں پر ٹونی کے ہاں گئے۔ ساتھ مُوڈی کا وہ اُونچا سا کتّا بھی تھا۔ ان کا ارادہ اپنی اس مشہور کار کو ساتھ لے جانے کا تھا، لیکن پھر سائیکلوں کا پروگرام بن گیا۔ جھیل تک چڑھائی ہی چڑھائی تھی۔ کچھ دُور تو ساتھ ساتھ گئے۔ پھر تھکاوٹ کے آثار شروع ہو گئے۔ مَیں اور جولی آگے نکل

گئے۔ مَیں بے تحاشا سائیکل چلا رہا تھا اور جُولی نے میرا بازو تھام رکھا تھا۔ "بھلا تم سیاہ چشمہ کیوں لگاتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"اس لیے، دنیا کی سب سے حسین لڑکی کا چہرہ اس قدر روشن اور جگمگاتا ہوا ہے کہ میری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔"

"کون ہے وہ لڑکی؟"

"تم۔"

"تم سے خفا ہونے کو میرا جی بہت چاہتا ہے۔ کسی روز مَیں تم سے خوب لڑوں گی۔"

"تم مجھ سے خفا ہولو، لڑلو، جھگڑلو، نفرت کرنے لگو۔ لیکن بس دن میں ایک مرتبہ اپنا چہرہ دکھا دیا کرو۔"

اس نے ہلکا سا تھپڑ مارنے کی کوشش کی، لیکن سائیکلیں اُلجھ گئیں، ہم گرتے گرتے بچے۔ ہم کافی آگے نکل آئے تھے، وہ بولی "اب تو میرا یہ بازو بھی شل ہو گیا ہے۔ سہارا بھی نہیں لیا جاتا۔"

"لاؤ مَیں تمہیں سہارا دوں۔" جب ہم جھیل پر پہنچے تو خوب تھک چکے تھے۔ گھاس پر لیٹ گئے۔ کچھ دیر میں وہ سب آ گئے۔ موڈی نے مچھلیاں پکڑنے کا سامان نکالا۔ ایک اور ٹولی بھی وہاں آئی ہوئی تھی۔ موڈی نے ان میں سے ایک سے پوچھا۔

"کیوں صاحب، یہاں مچھلیاں پکڑنا منع تو نہیں ہے؟"

"منع؟" وہ بولے۔ "یہاں مچھلیاں پکڑنا ایک معجزہ ہے۔"

اب معجزوں کا ذکر شروع ہو گیا۔ موڈی کہہ رہا تھا "مَیں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ یہ معجزہ کیا ہوتا ہے؟"

ٹونی بولے۔ "مَیں سمجھاتا ہوں۔ فرض کیا ایک شخص کسی دو منزلے مکان سے گرتا ہے اور اسے چوٹ نہیں لگتی۔ تم اسے کیا کہوگے؟"

"مَیں اسے ایک معمولی سا واقعہ کہوں گا۔" موڈی نے جواب دیا۔

"اگر وہ اگلے روز پھر اسی مکان سے گر پڑے اور اسے پھر بھی چوٹ نہ لگے۔ تب اسے کیا کہوگے؟"

"ایک حادثہ!"

"اگر تیسرے روز وہ پھر اسی مکان سے گر پڑے اور اسے پھر چوٹ نہ لگے۔ تب؟"

"تب مَیں اسے عادت کہوں گا۔"

ٹونی بولے "یہ مثالیں تو مَیں فقط مثال کے طور پر بیان کر رہا تھا۔ ویسے معجزے ہوتے ضرور ہیں۔ کبھی فرصت کے وقت تمہیں سمجھاؤں گا۔"

ایک معمر حضرت دوڑے دوڑے آتے اور موڈی سے ہاتھ ملا کر بولے "ہلو ڈینی! اُفوہ تم کتنے بدل گئے ہو؟ تمہارے سر پر گھنے بال تھے۔ اب تم گنجے ہو گئے ہو۔ تم کافی موٹے تھے، اب تمہارا وزن کم ہو گیا ہے۔ تمہاری مونچھیں سیاہ تھیں، اب بھوری ہو گئی ہیں۔"

"مَیں ڈینی نہیں ہوں۔ موڈی جونز ہوں۔"

"اچھا تو تم نے اپنا نام بھی بدل ڈالا۔"

موڈی نے ان کو سمجھایا تو وہ بولے "لیکن ڈینی سے تم بہت ملتے ہو۔ ہو بہو اسی کا چہرہ ہے، اسی کی آنکھیں، اسی کے کان، اسی کی ناک، اُسی کی گردن۔"

"جی ہاں! ڈینی کی اتنی چیزیں میرے پاس ہیں کہ جب مَیں باہر نکلتا ہوں تو وہ بے چارہ ایک بند کمرے میں بیٹھ کر انتظار کیا کرتا ہے!" موڈی نے بتایا۔

اب مچھلیاں پکڑنے بیٹھے۔ شرط لگی کہ دیکھیں پہلے کون پکڑتا ہے۔ اتنے میں شارٹی کا پاؤں پھسلا اور وہ سیدھا جھیل میں گیا۔ تھوڑے پانی میں گرا تھا، خود نکل آیا۔ موڈی بولا "بھئی غوطہ لگا کر پکڑنے کی شرط نہیں ہے۔ دُور سے پکڑو۔"

موڈی تصویر اتارنے لگا۔ گروپ میں کتے کو بھی شامل کیا۔ جب ہم سب تیار

ہوتے، تو کتا ایک طرف کو چل دیتا۔ مُوڈی جتنی دیر میں اسے پکڑ کر لاتا۔ سب اِدھر اُدھر ہو جاتے۔ کئی مرتبہ اسی طرح ہُوا۔ آخر موڈی نے کتے کو ڈانٹ کر کہا "گدھے تجھے معلوم بھی ہے کہ آج کل فلمیں کتنی مصیبتوں کے بعد ملتی ہیں اور تو ہے کہ فلم ضائع کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ نامعقول بیوقوف کتے، یہ ادائیں کسی اور روز دکھانا۔" اور کتا سچ مچ سہم کر کھڑا ہو گیا۔

اونچے پہاڑوں پر برف پڑی ہوئی تھی۔ ٹونی بولے "اس چوٹی کے پیچھے ضرور برف ہو گی۔ چلو دیکھتے ہیں۔"

اب چڑھائی شروع ہو گئی۔ کچھ تو پہلے ہی تھکے ہوئے تھے۔ کچھ یہ سخت چڑھائی۔ سب ہانپنے لگے۔ شارٹی ایک گہرے کھڈ کی طرف دیکھ کر بولا "اور جو یہاں سے گر پڑیں تو کیا ہو؟"

"اس کا دارومدار تمہارے گزشتہ اعمال پر ہے۔" موڈی نے فوراً جواب دیا۔

بڑی مصیبتوں سے چوٹی پر پہنچے، وہاں برف ورف کچھ نہیں تھی۔ دفعتاً موڈی چلّا کر بولا۔ "آہا وہ رہی برف!" سب دوڑ کر اس کے پاس پہنچے۔ "کہاں ہے؟"

"وہ رہی سامنے! اُن اُونچی اُونچی چوٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

رات کو ڈانس تھا۔ میں ایک طرح کا سوئمبر جیت چکا تھا اس لیے مجھے کسی نے نہیں ٹوکا۔ ویسے سب کے سب دیکھ دیکھ کر جلتے رہے۔ مَیں جولی کے ساتھ رہا اور جولی میرے ساتھ۔ ہم نے خوب باتیں کیں۔ پھر روشنی مدھم ہو گئی اور والٹز شروع ہوا۔ ہلکی ہلکی مدھم سروں میں گت بج رہی تھی۔

"یہ کیسا خوشگوار حادثہ تھا کہ اتنی تیز دنیا میں جو کئی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے

گھوم رہی ہے تم مجھے مِل گئیں۔ جانتی ہو جُولی تم جیسی لڑکی صدی میں ایک مرتبہ دُنیا میں آتی ہے۔"

"آج جھوٹ بولنے کو تمہارا جی چاہ رہا ہے۔" وہ بولی۔

"چلو باہر چلیں، اسی طرح رقص کرتے ہوئے اس ستون کی اوٹ لے کر دروازے سے باہر نکل جائیں گے۔ باہر چاند نکلا ہوا ہے۔ اسی موسیقی پر چاندنی میں رقص کریں گے۔"

ہم دونوں باہر آ گئے۔ ہلکی ہلکی چاندنی تھی۔ تارے بھی چمک رہے تھے۔ موسیقی کی مدھم سی صدائیں معلوم ہوتی تھی جیسے تاروں سے آ رہی ہو۔

"جولی صرف آج کی رات بھُول جاؤ کہ مَیں تم سے چھوٹا ہوں، شریر ہوں، تم مجھے زیادہ پسند نہیں کرتیں، تمہیں میری کچھ اتنی پرواہ بھی نہیں۔ صرف آج تم مجھے وہ لڑکا سمجھ لو، جس سے تم محبّت کرتی ہو، جو کہیں اور ہے۔"

"مَیں تمہیں پسند تو ضرور کرتی ہوں، لیکن محبّت؟"

"اچھا چلو تم مجھ سے محبّت مت کرو۔ صرف مجھے پسند کر لو۔"

اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ "بڑے شریر ہو۔ مجھے تمہاری ایک بات پر بھی یقین نہیں۔"

"تمہیں اس پر بھی یقین نہیں کہ تم نہایت پیاری لڑکی ہو۔" اور اس نے پھر ایک ہلکا سا تھپڑ میرے گال پر مارا۔

قریب ہی ایک اور مَیس بھی تھا۔ ان کے ہاں کوئی تقریب تھی جس پر انہوں نے ہم سب کو بلایا۔ ٹونی اور سندرم بھی گئے۔ پہلے تو کھیل تماشے ہوئے۔ پھر پینے پلانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ساری محفل میں صرف مَیں اور رہف ہی تھے جو بار بار لیمونڈ پیتے تھے۔

ورنہ سب لنڈھا رہے تھے۔ ان کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب تک کوئی یہ کہتا رہے کہ "شکریہ، بس مجھے اب اجازت دیجیے۔" وہ یہی سمجھتے تھے کہ میزبانی کا حق ادا نہیں ہوا۔ اسے اور پلاؤ۔ لیکن جب کوئی یہ کہتا کہ "مَیں تو یہیں سوؤں گا" تب اسے گھر بھیجتے تھے۔

رات کافی گزر گئی تھی۔ انہوں نے ٹونی اور سندرم کو میرے حوالے کیا اور کہا کہ انہیں ان کے بنگلوں تک چھوڑ آؤ۔ ویسے سندرم اور ٹونی بار بار یہی کہتے تھے کہ "مجھے ذرا نہیں چڑھی چاہوں تو ایک بوتل اور پی سکتا ہوں۔"

ہم تینوں پیدل روانہ ہوئے۔ دُور چوک میں روشنی ہو رہی تھی اور کچھ چیزیں ہل رہی تھیں، جن کے سائے ہم تک پہنچ رہے تھے۔ ٹونی نے فزکس کی ایک تھیوری شروع کر دی۔ روشنی اور سایوں کی ترتیب کے متعلق وہ فرما رہے تھے کہ جو چیز روشنی کے جتنی نزدیک ہوگی اتنا ہی لمبا اس کا سایہ ہوگا۔ اب یہ چیزیں جو چوک میں ہیں بالکل اونٹ معلوم ہو رہی ہیں، حالانکہ یہ بہت چھوٹی چھوٹی ہوں گی۔" آگے چل کر دیکھتے ہیں تو چوک میں سچ مچ اونٹ چلے آ رہے تھے۔

ٹونی کے قدم بھی کچھ ڈگمگا رہے تھے، لیکن جلد ہی ان کا بنگلہ آگیا اور وہ شب بخیر کہہ کر چلے گئے۔

سندرم نہایت عالمانہ انداز میں گفتگو کر رہے ہیں۔ "دیکھو لینکی مَیں ڈارون کی تھیوری کو مانتا ہوں۔ واقعی انسان پہلے بندر تھا اور اس سے پہلے کچھ اور تھا۔ لیکن اس تبدیلی کو ظہور میں آئے مدتیں گزر چکی ہیں، اس لیے اب اس سلسلے میں شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مگر مَیں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ آج کل یہ تبدیلی یکلخت کیوں بند ہو گئی ہے۔ آج کل ہم بالکل تبدیل نہیں ہو رہے۔ ہم سب ایک جگہ آکر رُک کیوں گئے ہیں؟ کئی ہزار سال سے بندر بندر ہی ہیں اور انسان انسان ہی ہیں۔ نہ کوئی بندر انسان بنتا ہے اور نہ انسان آگے ترقی کرتا ہے۔ یہ کیوں ہے؟ یہاں یہ تھیوری کیوں ختم ہو جاتی ہے؟ اچھا روح کے غیر فانی ہونے پہ

تمہارا اعتقاد ہے یا نہیں؟ میرا تو ہے۔ یہ رُوح کا قضیہ بھی خوب ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے دنیا میں اگر کسی چیز پر اعتقاد ہے تو وہ چاکلیٹ پر ہے۔ مجھے چاکلیٹ بہت پسند ہیں۔ ٹافی کچھ زیادہ میٹھی ہوتی ہے۔ ویسے گلاب جامن بھی خوب چیز ہے۔ ملٹن اور شیلے میں سے تمہیں کون پسند ہے؟ مجھے تو ان دونوں میں سے کیٹس زیادہ اچھا لگتا ہے۔ امید ہے کہ تم مجھ سے اس نکتے پر متفق ہو گے کہ جب تک بندوق میں بڑے چھرّے والا کارتوس استعمال نہ کیا جائے، یہ ریچھ وغیرہ بالکل نہیں مرتے۔ اچھا لینکی تمہیں ایک راز بتاؤں۔ میری زندگی کا سب سے بڑا راز۔ مجھے پٹاخے والا پستول بہت پسند ہے اس کی آواز خوب ہوتی ہے اور سستا بھی ہوتا ہے۔" وہ رُک گئے، پھر چپکے سے میرے کان میں بولے "لینکی! تم بہت اچھے لڑکے ہو۔ تمہیں جتنی دیا سلائیوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے لو۔ جتنے چمچے چاہئیں، جتنی ململ چاہیے، بلاتکلف مجھے بتا دو۔" پھر وہ سسکیاں لینے لگے۔ ان کا بنگلہ آگیا تھا۔ مَیں نے پھاٹک کھولا۔ ہم دونوں باغیچے میں سے گزر رہے تھے کہ وہ زور زور سے رونے لگے۔ پھر انہوں نے دھاڑیں مارنی شروع کر دیں اور مَیں انہیں وہیں چھوڑ کر سرپٹ بھاگا، اتنے زور سے کہ پھاٹک صاف پھلانگ گیا۔ اس سے پہلے مجھے اندازہ نہ تھا کہ مَیں ہائی جمپ بھی اچھی خاصی کر سکتا ہوں۔

ہف اور دوسرے لڑکے کیمپ سے واپس آگئے۔ انُوپم مجھ سے ملا اور بڑا خفا ہوا کہ تمہاری تو یہ ایک شرارت ٹھہری اور میرا بنا بنایا کام بگڑ گیا ہے۔ راج مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی۔ موڈی کی سفارش پر مَیں نے وعدہ کیا کہ مَیں آج ہی راج سے لڑنے کی کوشش کروں گا۔ چنانچہ شام کو مَیں راج سے ملا۔ اس نے صرف جولی کی باتیں کیں۔ خوب طعنے دیے۔ منہ چڑایا۔ مَیں نے کہا بھی کہ جولی نے کتنی مرتبہ مجھے تمہارے ساتھ دیکھا ہے۔ لیکن اسکے بارے

میں اس نے ایک لفظ تک نہیں کہا۔

بولی "یہ منطق میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ آپ بالکل ہری چُگ ہیں"۔۔۔۔ خوب لڑائی ہوئی۔

اگلے ڈانس کے لیے ٹورنمنٹ شروع ہو چکا تھا۔ ہم برج کھیل رہے تھے۔ یکایک بل نے چلّا کر کہا "یہ موڈی اور لینکی بے ایمانی کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے پتے دیکھ رہے ہیں۔ ان کے سیاہ چشموں میں پتّوں کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے"۔ بڑا شور مچا! ویسے بل سچا تھا، ہم ایک دوسرے کے پتے دیکھ رہے تھے۔ پچھلے ٹورنمنٹ میں بھی یہی کیا تھا لیکن ہم نے اقبالِ جرم نہیں کیا۔ موڈی بولا "اس قسم کا تو ہمیں آج تک خیال ہی نہیں آیا"۔

سب نے کہا کہ یہ بے ایمانی ہے لہٰذا ٹورنامنٹ بھی ختم! موڈی بولا "اچھا اس ڈانس کے لئے ٹاس کیے لیتے ہیں"۔ سب رضامند ہو گئے۔ موڈی نے میرے کان میں سرگوشی کی "اس دفعہ میری باری ہے"۔ ٹاس شروع ہوا اور آخر میں موڈی جیت گیا۔

اگلے ڈانس کے لیے ہمیں بنا بنایا ٹورنمنٹ مل گیا۔ ٹونی کے بنگلے میں ایک بہت بڑا درخت تھا جس میں چھُپ کر رات کو کوئی اُلّو بولتا تھا۔ پہلے تو کبھی کبھار یوں ہوتا تھا لیکن ہفتے بھر سے اُلّو نہایت باقاعدگی سے بول رہا تھا۔ مسز ٹونی اُلّو کی آواز سے بہت ڈرتی تھیں۔ انہیں شگونوں پر اعتقاد تھا اور وہ کچھ وہمی بھی تھیں۔ ٹونی نے اندھیرے میں اُلّو پر کئی مرتبہ بندوق چلائی لیکن کچھ نہ بنا۔ پھر انہوں نے ہمیں بتایا۔ موڈی نے فیصلہ کیا۔ "ہم ساتوں باری باری کوشش کریں گے۔ ہر رات صرف ایک لڑکا گولی چلائے گا ہر ایک کو تین کارتوس ملیں گے"۔

پہلی رات موڈی نے گولی چلائی۔ اُلّو کا کچھ پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ اس لیے اسے گولی لگنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لیکن اِدھر گولی چلی، اُدھر آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹا۔

موڈی چلّا کر بولا "دیکھا تم نے، بخدا کیا نشانہ ہے۔ اور مَیں نے اچھی طرح شست بھی نہیں لی تھی"۔ مَیں نے اپنی باری آخیر میں رکھی، مجھے پورے چاند کا انتظار تھا آخر چودھویں کا چاند نکلا۔ بل نے پوچھا "اگر لینکی بھی ناکامیاب رہا تو پھر فیصلہ کیونکر ہوگا؟" موڈی بولا۔ "پھر کچھ اور سوچیں گے"۔

چاند جب اُونچا ہو گیا اور درخت کے پیچھے چلا گیا تو مَیں نے اِدھر اُدھر گھوم کر وہ شاخ تلاش کی جس پر اُلّو بول رہا تھا۔ آخر ایک ایسی جگہ مل گئی جہاں چاند بالکل اُلّو کے پیچھے آگیا اور اُلّو صاف نظر آرہا تھا۔ اب شست لینے کی مصیبت پڑی، کیونکہ مَیں سائے میں تھا۔ موڈی نے مشورہ دیا کہ بندوق کی مکھی پر چاک لگالو۔ چاک لگایا۔ چاک کے نشان، اُلّو اور چاند کو سیدھ میں لے کر مَیں نے بندوق داغ دی۔ پتّوں اور ٹہنیوں میں اُلجھتا ہوا اُلّو نیچے گرا اور مَیں نے جولی کو ایک اور رقص کے لیے جیت لیا۔

ہمارے ہاں ڈرنک پارٹی تھی اور اس کے بعد ڈنر۔ ڈرنک پارٹی پر ایک بہت بڑے افسر آرہے تھے۔ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ پوزی نے پینا شروع کر دیا۔ جب ان صاحب کے آنے کا وقت ہوا تو پوزی اُونگھنے لگا۔ ہم اسے اس کے کمرے میں لے جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ کسی نے کہا وہ آگئے ہیں۔ جلدی سے ہم نے پوزی کو ایک صوفے پر لٹایا اور اس کے اُوپر اخبار ڈال دیے۔ عین جب مہمان خصوصی کا جامِ صحت پیا جا رہا تھا، تو ان کی نظر صوفے پر جا پڑی جہاں اخبار ہل رہے تھے۔ موڈی فوراً بولا۔ "اُفوہ ہوا بڑی تیز ہے کھڑکی بند کر دینا ذرا"۔ موڈی کے اشارے پر ہم کئی لڑکے صوفے کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور پوزی اور اخباروں کو چھپا لیا۔ اتنے میں پوزی نے لیٹے لیٹے ایک تان لگائی۔ موڈی نے جلدی سے کہا۔ "یہ ریڈیو کون بجا رہا ہے؟"

جب وہ حضرت چلے گئے تو سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر آٹھ بجے ڈنر کے لیے مہمان آنے شروع ہوتے۔ انہوں نے جب ہمارے مئیس کے کتے، بلّیاں اور پرندے دیکھے تو کوئی بولا "بھئی یہ تو اچھا خاصا چڑیا گھر ہے۔"

"چڑیا گھر تھا تو نہیں۔ آٹھ بجے کے بعد بن گیا ہے۔" مُوڈی نے مؤدبانہ جواب دیا۔

کچھ حضرت سکندرِ اعظم کا ذکر کرنے لگے، کیونکہ مشہور تھا کہ اس جگہ سے کبھی سکندرِ اعظم گزرا تھا۔

بچ نے پوچھا "موڈی تمہیں وہ سکندرِ اعظم اور اس کے والد کا جھگڑا یاد ہے نا؟"

موڈی بولا "جی نہیں مَیں اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔"

ایک صاحب اپنے بنگلے کا ذکر کر رہے تھے جو پہاڑ کے عین نیچے تھا۔ انہوں نے موڈی سے پوچھا "کبھی سامنے والی پہاڑی پر بھی چڑھے ہو؟"

موڈی بڑے عجز سے بولا "جی نہیں ہم یہیں خوش ہیں۔"

"عنقریب اس پہاڑ پر برف پڑے گی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اگلے مہینے تک برف میرے بنگلے تک نہ آجائے۔"

"تو کیوں نہ وہاں پہرہ لگوا دیا جائے کہ سنتری برف کو نیچے نہ آنے دیں۔"

"ویسے یہاں کی آب و ہوا بہت اچھی ہے۔" بچ نے کہا۔

"یہاں کی آب و ہوا مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔"

"یہاں میری صحت اتنی اچھی ہو گئی ہے کہ مَیں صبح دو میل پیدل سیر کرتا ہوں۔"

"اچھی صحت کی پہلی نشانی یہ ہے کہ انسان کا بلاوجہ ہر کسی سے لڑ پڑنے کو جی چاہتا ہے۔" موڈی بولا۔

اب کوئلوں کا ذکر چھڑ گیا۔ بچ بولے "شکر ہے کہ یہاں کافی کوئلہ مل جاتا ہے۔"

"لیکن اس کم بخت کوئلے کا زیادہ حصہ تو دھواں بن کر اُڑ جاتا ہے۔" موڈی نے بتایا۔

سندرم کوئلے سے چلنے والی مشینوں کا ذکر کرنے لگے۔ پھر برقی طاقت کا ذکر آیا۔

موڈی بولا "حضرات! آپ بتا سکتے ہیں کہ دنیا کی سب سے بڑی آبی طاقت کون سی ہے؟"

کسی نے کہا ہائیڈرو الیکٹرک، کسی نے کچھ بتایا۔ موڈی نے کہا۔ "نہیں حضرات نہیں، دُنیا کی سب سے بڑی آبی طاقت ہے عورت کے آنسو۔"

اب عورتوں کا ذکر شروع ہو گیا۔ ایک صاحب بولے "کئی سال کا ذکر ہے کہ مَیں نے ایک خاتون سے کچھ کہہ دیا۔ وہ فرمانے لگیں "یہی الفاظ ایک مرتبہ پھر دوہراؤ اور مَیں عمر بھر کے لیے تمہاری ہو جاؤں گی۔"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

مَیں نے کہا "خبردار کر دینے کا شکریہ۔"

بچ اپنے گھوڑے کا ذکر کر رہے تھے کہ مَیں ہر روز اتنے میل سواری کرتا ہوں۔ گھوڑا ناشتے میں یہ کھاتا ہے اور شام کو یہ۔ ہفتے بھر میں اس پر اتنا خرچ ہوتا ہے۔ بل نے بڑی معصومیت سے پوچھا "تو جناب یہ گھوڑا فی گیلن کتنے میل کر لیتا ہوگا؟"

بچ نے اب اپنا محبوب موضوع یعنی شکار شروع کر دیا۔ پہلے تو سب چپ چاپ سنتے رہے۔ پھر ٹوکا ٹوکی شروع ہو گئی۔ وہ سنا رہے تھے "جب مَیں نیوزی لینڈ میں تھا تو وہاں خوب بندروں کا شکار کھیلا کرتا تھا۔"

"لیکن غالباً نیوزی لینڈ میں بندر نہیں ہوتے۔" ایک طرف سے آواز آئی۔

"اب کہاں رہے ہوں گے؛ سارے کے سارے انہوں نے ختم جو کر دیے تھے۔" موڈی بولا۔

"اور جب مَیں افریقہ میں تھا تو خوب کنگرو کا شکار کھیلا کرتا تھا۔"

"لیکن شاید افریقہ میں کنگرو نہیں ہوتے۔" کسی نے کہا۔

"تم لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ مَیں آج سے چالیس سال پہلے کا ذکر کر رہا ہوں۔" بچ بولے۔

اب موڈی نے اپنے شکار کا قصہ شروع کیا۔"مَیں نے بھی ایک دفعہ شکار کھیلا تھا۔ ایک بطخ مجھ سے آٹھ دس گز کے فاصلے پر بیٹھی تھی۔ مَیں نے فائر کیا، کچھ نہ بنا، پھر فائر کیا، پھر کچھ نہ ہوا۔ پندرہ فائر کیے، لیکن بطخ جوں کی توں محفوظ تھی اور وہیں بیٹھی تھی۔ آخر وہ خود میرے پاس چل کر آئی اور ایک شلنگ میرے ہاتھ میں دے کر بولی ۔۔"جاؤ اس کا کچھ لے لینا۔"

شکار کے بعد مصوّری کا ذکر چھڑ گیا۔ ایک صاحب نے بتایا"مَیں نے کل قطبِ شمالی کے برفانی نظارے کی تصویر بنائی۔ جب تصویر مکمل ہوئی تو اس قدر سردی محسوس ہوئی کہ مجھے زکام ہو گیا اور پاس رکھے ہوئے تھرمامیٹر کا پارہ بالکل نیچے چلا گیا۔"

"اور مَیں نے شعلوں کی تصویر بنائی تھی۔" ایک طرف سے آواز آئی"وہ تصویر ابھی نامکمل تھی، مگر اتنی آنچ ہو گئی کہ کاغذ جل گیا۔" موڈی کی باری آئی تو اس نے بتایا"حضرات! مَیں نے پچھلے ہفتے چارلی چپلن کی نہایت اعلیٰ تصویر بنائی تھی ۔۔۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجیے۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

سب نے پوچھا"کیوں؟ کہاں چلے؟"

موڈی بولا"ہر شام کو تصویر کی داڑھی اُگ آتی ہے اور مجھے شیو بنانا پڑتا ہے۔ مَیں اس کا شیو بنانے جا رہا ہوں۔"

موڈی کو اور مجھے باہر بھیج دیا گیا۔ دُور دُور کیمپ تھے۔ کچھ تو بے پناہ سردی اور کچھ تنہائی، وقت گزارنا مشکل ہو گیا۔ پھر برفباری شروع ہو گئی۔ جھکڑ چلے، طوفان آئے اور آسمان زمین سب سفید ہو گئے۔ چند ہفتے گزار کر جب مَیں واپس آیا تو یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کئی برس گزر گئے ہوں۔

موڈی بھی چند دنوں کے بعد آ گیا۔ پھر مَیس میں چاء پر کنبوں کو بلایا گیا۔ جولی بھی آئی۔ اس سے بس رسمی طور پر دو تین باتیں ہو سکیں۔ راج بھی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ اور بھی کئی لڑکیاں آئی تھیں۔ مَیں ایک کونے میں انگیٹھی کے پاس بیٹھا تھا۔ دوسرے کونے میں لڑکیوں کا جھرمٹ تھا۔

موڈی کہہ رہا تھا"کیمپ کی ڈیوٹی سے بالکل مُرجھا گیا ہے لڑکا۔ آج کوئی بھی لڑکی اس کی طرف نہیں دیکھ رہی ہے۔ برف کی وجہ سے تیرنے کا پروگرام بھی بند ہو چکا ہے۔ چچ چچ بے چارہ لینکی۔"

دوسرے لڑکے بھی شامل ہو گئے اور انہوں نے بھی اسی قسم کی باتیں شروع کر دیں۔ آخر مَیں تنگ آ کر اُٹھا۔ لڑکیوں کے جھرمٹ میں گیا اور ان کی پامسٹری شروع کر دی۔ باری باری ہر ایک کی ہتھیلی دیکھتا اور جب قسمت بتاتا تو ان کے چہرے سرخ ہو جاتے۔ فیٹی اور بل وغیرہ ایک طرف کھڑے جل بھُن رہے تھے۔

راج رُوٹھی ہوئی تھی اس لیے ایک طرف لے جا کر اس کی ہتھیلی دیکھی اور کہا"اسی سال تمہیں وہ شخص مل جائے گا جس کا تمہیں اتنے دنوں سے انتظار ہے۔ وہ شخص تمہاری آنکھوں سے یوں مسحور ہو کر رہ جائے گا کہ عمر بھر اس سحر سے نہ نکل سکے گا۔ راج تمہیں کسی نے تمہاری آنکھوں کے متعلق بھی بتایا؟ تمہاری ہتھیلی کی لکیریں کہتی ہیں کہ تم نہایت عقلمند لڑکی ہو۔ جوں جوں دن گزرتے جائیں گے تم اور بھی عقلمند ہوتی جاؤ گی۔ حتّٰی کہ۔"

"وہ تو درست ہے۔ بھلا تم میری آنکھوں کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟"

"اور اگر وہ شخص تمہیں اس اتوار تک نہ ملے تو اتوار کی شام کو مَیں کچھ نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے بُلا لینا۔"

وہ بولی"لیکن ابھی تم نے میری آنکھوں کا ذکر کیا تھا؟"

جولی علیحدہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس کی ہتھیلی اپنے ہاتھ میں لے کر مَیں نے اسے بتایا۔

"یہ لکیریں کہہ رہی ہیں کہ تم جتنی حسین ہو اتنی ہی تمہاری قسمت بھی حسین ہے۔ یہ لکیر کہتی ہے کہ تمہاری آنکھیں ایسی ہیں جیسے خواب دیکھ رہی ہوں۔ اور اس لکیر سے صاف عیاں ہے کہ تمہارے چہرے پر وقار ہے۔ تمکنت ہے۔ یہ دو لکیریں جو ایک دوسرے سے مل رہی ہیں۔ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ کل سہ پہر کوئی تم سے ملے گا اور تم اس سے ملنے ندی کے پُل تک جاؤ گی، جہاں درختوں کا جُھنڈ ہے وہاں۔"

"مگر وہ تو بہت دُور ہے اور پھر گھر سے ایسے موسم میں مجھے نکلنے کون دے گا؟"

"مگر یہ لکیریں کہہ رہی ہیں کہ گھر سے تم کوئی بہانہ کر کے چلو گی۔ اگر تم نہ گئیں تو وہ بے حد اداس ہو جائے گا۔ وہ پہلے ہی بہت اداس ہے۔ اتنے دنوں سے اس نے تمہیں اچھی طرح نہیں دیکھا۔ وہ تمہیں یاد کرتا رہا ہے۔"

اگلے روز مَیں ندی کے پُل کے پاس درختوں کے جھنڈ میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ آسمان پر گھٹا تُلی کھڑی تھی۔ جہاں تک نظر جاتی برف ہی برف دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے بالکل یقین نہ تھا کہ جولی ایسے موسم میں اتنی دُور آئے گی کہ یکایک ایک سُرخ سی چیز افق پر نمودار ہوئی اور نزدیک آتی گئی۔ یہ جولی تھی۔ سُرخ لباس پہنے۔ سُرخ کوٹ، سُرخ سویٹر، سُرخ دستانے، سُرخ فراک، سُرخ گال، سُرخ ہونٹ۔ ایک پتھر سے برف ہٹا کر مَیں نے اوورکوٹ بچھایا اور ہم دونوں بیٹھ گئے۔

"تم بہت تنگ کرتے ہو۔ مَیں بالکل نہ آتی اگر مجھے تمہارے غمگین ہو جانے کا خیال نہ ستاتا۔ کل بھی تم اداس تھے۔ آج دوپہر تک میرا آنے کا ارادہ بالکل نہ تھا۔ بھلا اتنی دُور اس برف میں ملنے میں کیا تُک ہے۔ مَیں بھی نری بیوقوف ہوں۔"

"مگر تمہاری ہتھیلی کی لکیریں۔"

"اچھا لاؤ مَیں تمہاری ہتھیلی دیکھوں۔" اس نے میری ہتھیلی اپنے ہاتھوں میں لے لی۔

"یہ لکیر کہتی ہے کہ جس لڑکی سے تم یہ کہتے رہتے ہو کہ تم اسے چاہتے ہو، اسے بڑا افسوس ہے کہ وہ تمہیں نہیں چاہتی۔ اس لیے نہیں کہ تم اچھے نہیں ہو، بلکہ اس لیے کہ اس کی پسند مختلف ہے۔ اسے شوخ اور شرارتی لڑکے نہیں، بلکہ مدبّر اور سنجیدہ شخص پسند ہیں۔ یہ دوسری لکیر کہتی ہے کہ وہ تمہیں محض ایک اچّھا لڑکا سمجھتی ہے اور ایک اچّھا دوست، بس!"

"اب مَیں تمہاری ہتھیلی دیکھوں گا۔ یہ لکیر جو مڑ گئی ہے پوچھتی ہے کہ کیا وہ شخص تمہاری زندگی میں آگیا ہے جسے تم چاہتی ہو؟"

وہ میری ہتھیلی دیکھ کر بولی۔ "وہ کبھی کا آچکا ہے۔ جیسا کہ اس چھوٹی سی لکیر سے ظاہر ہے۔ وہ اس لڑکی کا منگیتر ہے۔"

مَیں نے اس کی ہتھیلی دیکھ کر کہا۔ "تو وہ لڑکی منگنی کی انگوٹھی کیوں نہیں پہنتی، تاکہ کسی کو غلط فہمی نہ ہو سکے۔"

وہ میری ہتھیلی دیکھ کر بولی۔ "آج کل اچھی انگوٹھیاں ملتی کہاں ہیں۔ عنقریب سمندر پار سے اس کا منگیتر آجائے گا اور پھر ان کی شادی ہو جائے گی۔"

مَیں نے منہ بنا کر پوچھا۔ "یہ ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا گیا؟"

وہ شرارت آمیز مسکراہٹ سے بولی۔ "بس پامسٹری ختم؟"

مَیں رُوٹھ کر ایک طرف جا بیٹھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی، پھر جُولی سرک کر میرے پاس آگئی۔

"رُوٹھ گئے؟"

مَیں چُپ تھا۔

"یہ رُوٹھنا تم نے کب سے سیکھا ہے؟ مَیں نے کہا تو ہے کہ تمہیں پسند کرتی ہوں۔"

مَیں پھر بھی یونہی بیٹھا رہا۔

"خدایا! تم کتنا ستاتے ہو۔ اگر تم اور ستاؤ گے تو میرے آنسو نکل آئیں گے۔"
اب مجھے منانا پڑا۔

برف کے چھوٹے چھوٹے گالے آہستہ آہستہ گر رہے تھے۔ سب کچھ سفید تھا۔ برفباری نے آس پاس کی ساری چیزیں اوجھل کر دی تھیں۔ ہم ملائم برف پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ برفباری تیز ہوتی جا رہی تھی۔ جھکڑ شروع ہو گئے تھے۔

مَیس میں ہم تازہ گرے ہوئے برف کی گیندوں سے خوب کھیلتے۔ دوپہر اور رات کے کھانے کے بعد اکثر یہ کھیل ہوتا اور ایک دوسرے کو خوب پیٹا جاتا۔ برف کا انسانی وضع کا مجسمہ بھی بنایا جاتا۔ جب مجسمہ بن چکتا تو اس کے گلے میں ایک مفلر لپیٹتے، سر پر ہیٹ رکھتے اور منہ میں پائپ دے دیتے۔ ادھر بِل کو نہ جانے کیا ضد تھی، ہم ذرا اِدھر اُدھر ہو جاتے تو وہ برف کے مجسمے کے ایک لات لگاتا، پھر دوسری، پھر تیسری۔ آناً فاناً میں اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا۔ اسے ہم نے متنبہ بھی کیا، کئی مرتبہ مجسمے کا پہرہ بھی دیا لیکن وہ سب کی نظر بچا کر رات کو کسی وقت توڑ جاتا اور بعد میں کہتا کہ مَیں اپنی عادت سے مجبور ہوں، مجھ سے برف کا انسانی مجسمہ دیکھا نہیں جاتا۔

شدید برفباری کے بعد ایک شام کو ہم نے نہایت نفیس مجسمہ بنایا۔ ڈنر کے بعد سیکنڈ شو دیکھنے کا پروگرام بنا، لیکن موڈی نے معذرت چاہی۔ ہم نے اسے معاف کر دیا۔ رات گئے ہم واپس مَیس پہنچے۔ بِل آنکھ بچا کر سیدھا برف کے مجسمے کی طرف گیا اور آگے بڑھ کر اسے لات لگائی۔ اُدھر مجسمے نے تڑپ کر ایک دھپ دیا بِل کے منہ پر۔ پھر دوسرا، تیسرا، چوتھا۔ اب بِل ہے کہ بُت بنا کھڑا ہے اور مجسمہ اسے پیٹ رہا ہے۔ پھر بِل بھاگا اور اپنے کمرے میں گھس گیا۔ رات بھر بِل کانپتا رہا۔ صبح اسے پتہ چلا کہ رات جس نے اس کی مرمت

کی تھی، وہ برف کا مجسمہ نہیں تھا۔ موڈی تھا جو مجسمے کی جگہ کھڑا تھا۔ ایک سفید چادر اوڑھ کر، اپنے اُوپر بہت سی برف ڈال کر، منہ میں پائپ دبا کر اور سر پر ہیٹ پہن کر۔

کلب میں ڈانس تھا اور مَیں پرانے ٹورنمنٹ کی بنا پر جُولی کے ساتھ رقص کر رہا تھا۔ جُولی نے جگ مگ جگ مگ کرتا ہوا لباس پہن رکھا تھا۔ مَیں اسے وہ مشہور نغمہ سنا رہا تھا۔ "جُب تم میرے ساتھ ہو تو مَیں آسمان کی طرف نہیں دیکھتا، کیونکہ تارے تمہاری آنکھوں میں ہیں، چاندنی تمہارے چہرے سے جھلکتی ہے۔" ہم رقص کرتے کرتے باہر آ گئے۔ آسمان صاف تھا اور چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ درختوں پر، پودوں پر، مکانوں پر برف ہی برف تھی۔ اور چاندنی میں برف اتنی چمک رہی تھی کہ آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ دھیمی دھیمی موسیقی کی صدائیں آ رہی تھیں۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ رقص کر رہے تھے۔ مَیں کہہ رہا تھا "اس چہرے پر وہ جلا ہے جو صبح صبح آسمان پر پھیل جاتی ہے۔ ان گالوں پر وہ دمک ہے جو سورج ڈوبتے وقت بادلوں میں چھوڑ جاتا ہے۔ یہ ہونٹ گلاب کی دو پنکھڑیاں ہیں۔ تمہارے گلے کے ہار میں یہ جو دل کی شکل کا یاقوت ہے۔ دراصل یہ میرا دل ہے۔"

"توبہ توبہ۔ کتنے جھوٹے ہو تم! باتیں بنانا کوئی تم سے سیکھے۔"

پھر وہ میری ٹائی درست کرتے ہوئے بولی "مجھے ڈر ہے کہ اگر اسی طرح چند مہینے اور گزر گئے تو کہیں مَیں تمہیں زیادہ پسند نہ کرنے لگوں۔ اب میرے منگیتر کو آ جانا چاہیے۔"

اور اس کا منگیتر آ گیا۔ مَیں کیمپ میں تھا، وہاں مجھے یہ خبر پہنچی۔ ساتھ ہی یہ خبر بھی کہ اس کے ساتھ سارا کنبہ جا رہا ہے۔ شادی کسی اور جگہ ہو گی۔ اور یہ کہ ہیف نے سب کو

بتا دیا ہے کہ وہ جُولی پر بُری طرح فریفتہ ہے۔

کیمپ سے واپس آکر مَیں نے کلب میں جولی کے منگیتر کو دیکھا جو چالیس پینتالیس برس کا سنجیدہ اور ہم سے سینئر افسر تھا۔ جُولی کے کنبے کا پرانا واقف تھا۔ جولی نے میرا تعارف کرایا۔ مَیں نے ان دونوں کو مبارکباد دی اور اس کے منگیتر سے کہا کہ وہ دُنیا کا سب سے خوش قسمت شخص ہے۔

مراج بھی ملی۔ اس نے حسبِ معمول طعنوں کی بوچھاڑ کر دی "شکر ہے کہ جُولیٹ صاحبہ اپنے کسی پرانے رومیو کے ساتھ جا رہی ہیں۔ اب تو آپ ہمارے ہاں آیا کریں گے نا؟"

لیکن ہف کا بہت بُرا حال تھا۔ بس یہ پچھتاوا اسے مارے ڈالتا تھا کہ جولی سے ایک دفعہ سب کچھ کہہ کیوں نہ دیا اور یہ کہ اسے ایک مرتبہ ضرور کوشش کرنی چاہیے تھی۔

جس شام کو ٹونی کا کنبہ جا رہا تھا، اس روز ہم نے خوب سوگ منایا۔ صبح سے بستروں میں منہ چھپا کر لیٹے رہے۔ سہ پہر کو موڈی آیا اور اس نے ہم سب کو بستروں سے نکالا۔ ایک جگہ جمع کر کے خوب جھاڑا "تم لڑکوں کے آداب کہاں گئے؛ تم کس قسم کے سپورٹس مین ہو؟ تمہیں اس وقت سٹیشن پر ہونا چاہیے تھا، الوداع کہنے کے لیے۔ جس لڑکی نے تمہیں اس قدر مسرتیں دی ہیں اور جس کے دم سے ایسے ہونق مقام پر بھی زندگی میں کچھ ہلچل مچی رہی، اس کے جانے پر تمہیں بجائے بسُورنے کے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"

اس نے سگریٹ کا ٹکڑا زمین پر پھینکا اور پاؤں سے کچل دیا۔ "ایسے چھوٹے موٹے عارضی رومانوں کو یوں بھول جایا کرو جیسے سگریٹ کے بیکار ٹکڑے کو پھینک کر بھول جاتے ہو۔ تم مجھے سنگدل کہو گے لیکن مَیں زندگی بھر کے تجربے کا نچوڑ بتا رہا ہوں۔ اور پھر کون جانتا ہے کہ کل کوئی اور آجائے۔ آنے والا کل انسان کے لیے سب سے بڑا تحفہ ہے۔ چلو سٹیشن چلتے ہیں۔"

ہم میں سے ایک دو پھر بھی نہ مانے۔ آخر تنگ آکر موڈی نے کہا کہ ٹاس کر لو۔ ٹاس کیا گیا۔ حسبِ معمول موڈی جیتا۔ ذراسی دیر میں ہم سب سٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ برفباری کی وجہ سے سائیکلیں بے کار تھیں اور ہم سب پیدل چل رہے تھے۔ ہمارے ساتھ موڈی کا وہ اونچا سا کتا بھی منہ میں پائپ دباتے چل رہا تھا۔

ہف اپنے اوپر جھنجھلا رہا تھا "مَیں اتنا بزدل یونہی بنا رہا۔ اب یہ بوجھ ہمیشہ میرے سینے پر رہے گا۔ مَیں نے جُولی سے کیوں نہ کہہ دیا؛ کم از کم ایک دفعہ ہی کہہ دیتا۔ اگر اب کہہ دوں تو؛ سٹیشن پر ٹیکسی ضرور مل جائے گی۔ بڑی آسانی سے مَیں ٹرین کو اگلے سٹیشن پر جا پکڑوں گا۔ اگلے جنکشن تک جولی کے ساتھ جاؤں گا اور موقع پا کر اسے سب کچھ بتا دوں گا۔"

لیکن موڈی اسے منع کر رہا تھا۔ جب ہم سٹیشن کے چوک کے قریب پہنچے تو ہف بولا "مَیں ضرور کہوں گا۔" بڑی بحث شروع ہوئی۔ آخر طے پایا کہ ٹاس کیا جائے۔ ٹاس ہوا چھن سے سکہ سڑک پر گرا اور موڈی جیت گیا۔ ہف نے بسورنا شروع کر دیا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ سٹیشن سے سنو وائٹ اپنی جیپ میں آ رہا ہے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ گاڑی جا چکی ہے۔ اس نے ہمیں اپنے ساتھ چلنے کی دعوت بھی دی۔ صرف موڈی واپس جانے پر رضامند ہوا اور وہ دونوں چلے گئے۔

ہم کچھ دیر چوک میں کھڑے رہے۔ پھر یکایک شارٹی نے وہ سکہ سڑک سے اُٹھا لیا جسے موڈی جلدی میں بھول گیا تھا۔ شارٹی نے ایک چیخ ماری اور سکہ سب کے سامنے کر دیا۔ سکے کے ایک طرف چہرہ تھا اور دوسری طرف بھی چہرہ تھا۔ یہ جعلی سکہ تھا!

ذراسی دیر میں لوزی اور فیٹی لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوئے موڈی کی اچھی طرح خبر لینے مَیس کی طرف جا رہے تھے۔ ہف ٹیکسی کی تلاش میں دوسری طرف جا رہا تھا اور چوک

میں کھڑا سر کھجا رہا تھا۔ اس کے پاس ہی مُوڈی کا کتا منہ میں پائپ دبائے کچھ سوچ رہا تھا۔ مَیں اور شارٹی چائے پینے سٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔

سٹیشن پر پہنچ کر دیکھا کہ ٹرین گئی نہیں ابھی تک وہیں ہے۔ آنے والی ٹرین لیٹ تھی، اس کا انتظار ہو رہا تھا۔ ٹونی کے کنبے سے ملاقات ہوئی۔ پلیٹ فارم پر بچ ملے۔ وہ اپنے کنبے کو لینے آئے تھے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے دوسری ٹرین آگئی۔ ٹرین سے ان کی بیوی اُتری، پھر دو بچے اور پھر ایک بے حد حسین لڑکی۔ ہُوبہُو جُولی کی تصویر۔ بالکل ویسی ہی۔

ٹونی اور بچ باتیں کر رہے تھے۔ ایک اپنے کنبے کو لینے آیا تھا تو دوسرا رخصت کرنے۔ میری نگاہیں کبھی جولی کی طرف جاتی تھیں اور کبھی اس نووارد لڑکی کی طرف جس سے بچ نے ابھی ابھی میرا تعارف کرایا تھا اور اس کی دُزدیدہ نگاہیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔

مَیں بار بار ان دونوں چہروں کی طرف دیکھ رہا تھا، جو بالکل ایک جیسے تھے۔ دونوں پر وہی شوخی تھی ۔۔ وہی جاذبیت ۔۔ وہی دلآویزی ۔۔ وہی جگمگاتی ہوئی مسکراہٹ۔

اور شارٹی بڑے غور سے موڈی کے اس سکّے کو دیکھ رہا تھا جس کے دونوں طرف چہرے تھے۔

قصّہ پروفیسر علی بابا کا

جس کو یکّہ تازِ میدانِ فصاحت، شہسوارِ عرصۂ بلاغت، سخن گوئے شیریں کلام محمد خالد بی، ایس سی انجینئرنگ حال مقیم انگلستان، نے باوجود ہزارہا وعدوں کے ترتیب دینے سے انکار کر دیا، چنانچہ ہیچمدان، ناچیز، کمترین مصنف عفی عنہٗ کو بقلم خود اکیلے ہی بزبانِ اُردو زیورِ نظم و نثر سے مثلِ عروس مرصّع کرنا پڑا اور کوزے کو دریا میں بند کرنا پڑا۔

اور از راہِ عالی ہمتی، رئیس والاشان، جوہر شناس اہلِ کمال، طاقت نظام، زرّیں رقم، منشی کرشن چندر صاحب ایم اے، ایل ایل بی نے اپنے مجموعۂ فیض مرجع میں اس کے طبع کا حکم صادر فرمایا تاکہ ہر خاص و عام اس قصّۂ نصیحت و فضیحت آموز سے مستفیض ہو سکے۔

جاگے سب سنسار سوئے پروردگار! اے صاحبو! راویانِ روایات، حاکیانِ حکایات، شاہد دلربائے حسن اور لعبتِ شیریں ادائے افسانہائے کہن کو یوں ہفت آرائش سے مزیّن کرتے ہیں کہ شہر بغداد جہاں ہر فرد و بشر کو شعر و شاعری کا ذوق تھا عشق و محبت کا شوق تھا جہاں ہر رات عید تھی اور ہر دن شبِ برات۔ کہیں فوارے جاری اور کہیں ساون بھادوں کی تیاری۔ سبز زمرّد گوں، گلہائے معنبر کے ایوانِ بوقلموں، صحن وسیع، چھتیں رفیع، ہاتھی دانت کے تخت پہ مہذب و مطلا گردپوش، زر و اطلس کا گاؤ تکیہ

بڑے دام کا، اس پر بھاری کار رَد پہلے کام کا۔ سنگِ مرمر کے حوضِ لطافت بار، پانی جواہر خیز و گوہر بار، شہر بغداد جہاں —— لیکن ٹھہریے! یہ قصّہ شہر بغداد کا نہیں ہے، کہیں اور کا ہے۔

تو صاحبو! قصّہ یوں چلتا ہے کہ شہر بغداد سے دُور کسی جگہ ایک علی بابا رہتا تھا۔ یوں تو آس پاس کئی اور علی بابے بھی رہتے تھے، لیکن وہ ان سب میں نمایاں و ممتاز تھا۔

علی بابا خوش وقت، خوش نصیب، خوش طبیعت و خوش خوراک تھا۔ خدا نے اس کے والد کو بہت سارے چھپّر پھاڑ کر دولت عطا فرمائی تھی، کیونکہ وہ شہر کا سب سے بڑا اور کامیاب فوجی ٹھیکیدار تھا اس لیے بے فکری اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔

ایسے صحت افزا حالات میں علی بابا کا محبوب ترین مشغلہ وہی تھا جو اس قسم کے انسانوں کا ہوتا ہے یعنی صبح سے شام تک سیاسیات۔ وہ سیاسیات پر عاشق تھا اور اس کا خیال تھا کہ سیاسیات اس پر عاشق ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کسی خاص فرقے یا گروہ کا مدّاح تھا۔ نہیں! وہ ہر پارٹی کا طرفدار بھی تھا اور مخالف بھی۔ صبح جس فرقے کی طرفداری میں لڑتا، شام کو اسی کے خلاف جھگڑتا۔ جب وہ سیاسیات پر بحث کرتے کرتے تھک جاتا تو پھر بحث شروع کر دیتا۔ جب بحث کر چکتا تو پھر بحث کرتا۔ اس کی زندگی کے بہترین لمحے اسی قسم کے بحث مباحثوں اور گالی گلوچ میں گزرے تھے۔ خبریں سنتے سنتے وجد میں آکر اس نے کئی ریڈیو توڑ ڈالے تھے۔ اپنا بلڈ پریشر بڑھا لیا تھا۔ جس روز وہ اس سلسلے میں کسی کو کچھ سنا نہ لیتا اور کسی سے کچھ سن نہ لیتا، اس روز اسے سکونِ قلب میسّر نہ ہوتا اور یہی خیال ستاتا کہ دن یونہی ضائع ہوا ہے۔

ایک رات علی بابا ایک جلسے سے دیر سے لوٹا۔ سونے کا قصد کیا ہی تھا کہ پڑوس سے باتوں کی آواز آئی۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو کچھ جانوروں کو تھان پر باتیں کرتے پایا۔

علی بابا نہ حیران ہوا نہ پریشان، کیونکہ اس نے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ صدیوں پہلے جانور بڑی مسجّع اور مقفّٰی زبان میں کھلم کھلا باتیں کیا کرتے تھے۔ پرانی کتابوں میں جانوروں کے مکالمے بھی درج ہیں۔ علی بابا نے کان لگا کر باتیں سُنیں۔ دنیا کی سیاسی حالت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ سب جانور اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔

گدھا کہہ رہا تھا "حضرات! انسانوں کی طرح اپنا وقت ضائع مت کیجیے۔ خدا کے لیے کوئی مفید بات کیجیے۔ یہ کیا بیہودہ موضوع لے بیٹھے ہیں آپ؟"

اونٹ بولا۔ "بھائی صاحب! مَیں آپ سے متفق ہوں۔ آپ ہمیشہ عقل مندی کی بات کیا کرتے ہیں۔"

گدھے نے مسکرا کر کہا۔ شُتراں چہ عجب گر بنوازند گدھا را۔ میرے خیال میں دنیا کا سب سے فرسودہ موضوع سیاسیات ہے۔ کچھ ہو رہا ہے، کہیں ہو رہا ہے، کوئی کر رہا ہے، نہ آپ اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہیں نہ مَیں۔ پھر مفت میں تلملانے کی کیا ضرورت ہے۔"

بکرا بولا "موسم کو نہ آپ بدل سکتے ہیں نہ مَیں، پھر ہم موسم کے متعلق اتنی باتیں کیوں کیا کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ سیاسیات سے بے بہرہ ہوں۔"

گدھے نے جھلّا کر کہا "حضرت آپ کے اس فقرے نے میری پوزیشن کس قدر آکورڈ کر دی ہے، دیکھیے ——"

علی بابا اپنے تئیں سیاست کی بے حرمتی نہ دیکھ سکا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ پہلے قصد کیا کہ چشم زدن میں اس مردود گدھے کا سر تن سے جدا کر دے۔ پھر سوچا کہ آخر کو گدھا ہے، موقع پا کر اس نابکار کو زدوکوب کر دینا ہی کافی ہو گا۔

اتنے میں لنگور گویا ہوا "آج مَیں نے اس دوشیزۂ جادو جمال، پری تمثال، سرو بلند اقبال، مشتری خصال ——"

"کیا کہا، مستری خصال؟" گدھے نے بات کاٹی "آپ اسی لڑکی کا ذکر تو نہیں کر رہے"

جو پڑوس میں رہتی ہے۔"

"ہاں۔ چاند اس کے آگے ماند تھا۔ آفتابِ عالمتاب بلا خیرگیٔ نگاہ تابِ نظارہ حسنِ گلو سوز نہ لا سکتا تھا۔ وہ سیمیں بدن، غنچہ دہن، ذنِ یوسف لقا، گلگوں قبا، جادو نگاہ، تین عدد یکتائے روزگار، پری پیکر، رشکِ قمر، گلعذار و طرحدار لڑکیوں کے ساتھ ٹینس کھیل رہی تھی۔"

"سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ لیڈیز ڈبلز ہو رہے تھے۔" گدھا بولا۔

"آہ ؎ حسینوں سے فقط صاحب سلامت دُور کی اچھی
نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دوستی اچھی"

لنگور آہِ سرد کھینچ کر بولا۔

"کیا بیہودگی ہے؟" گدھا جھلّا اُٹھا۔

"گدھے صاحب، بعض اوقات تو میرا آپ کو فی النّار و السّقر کر دینے کا پختہ ارادہ ہو جاتا ہے۔" لنگور بھی جھلّا اُٹھا۔

"یعنی؟"

"یعنی جی چاہتا ہے کہ آپ کو اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون کر دوں۔"

"بھائی جان! اس قسم کی گفتگو سے پرہیز کیجیے۔" اونٹ نے کہا۔

"یہ جو اپنے پڑوس میں ایک جوانِ شمشاد قد رہتا ہے۔ کیا اُس نے اس نازنین کو نہیں دیکھا؟"

"غالباً تمہارا مطلب علی بابا سے ہے۔ وہ لڑکی اس کے ہاتھ آنے سے رہی۔"

"تو کیا اس کے لیے کوئی آسمان سے اُترے گا؟"

"اور کھجور میں اٹکے گا؟" لنگور نے لقمہ دیا۔

"لڑکیوں کے معاملے میں ہر ایک کو ذرا سوشلسٹ ہونا چاہیے۔" بیل بولا۔

"میرے خیال میں علی بابا اتنا بُرا بھی نہیں ہے۔ اسے چاہیے کہ اس لڑکی کو اپنی کزن مشہور کر دے۔ آج کل یہ حربہ عام ہے۔ کسی لڑکی کو کہیں لیے پھرو، کوئی پوچھے تو کہہ دو کہ میری کزن ہے، کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

"کیا خوب سودا نقد ہے۔ اس ہاتھ دے اُس ہاتھ دے۔" لنگور بولا۔ لنگور اکثر بے تُکی باتیں کرتا تھا۔

ایک دم علی بابا کے دل میں خیال گزرا کہ دنیا ناپائیدار گذاشتنی و گذشتنی ہے، زندگی کا بھروسہ نہیں۔ دمِ مستعار پر کسی کا اجارہ نہیں۔ ابھی سانس چلتی ہے اور ابھی باتیں کرتے کرتے جان نکلتی ہے۔ حیف ہے کہ ایسی پستہ دہن زلیخا پڑوس میں رہتی ہو اور زندگی بغیر عشق و عاشقی کٹے۔ یہ سنہری موقع ہے۔ چنانچہ اس نے اللہ کا نام لیا اور عاشق ہونے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

اگلی صبح جانا علی بابا کا اور دیکھنا نازنین کو کھیلتے ٹینس اور ہونا عاشق ہزار جان سے۔ دیکھنا حسینہ نازنین کا ایک نوجوانِ خوب صورت، عمدہ لباس پہنے، مصروفِ تاک جھانک ہے۔ ہونا چار آنکھوں کا۔ ہونا انکشاف علی بابا پر کہ نام اس بُتِ طنّاز کا مس مرجانا ہے۔

ابھی علی بابا کو عاشق ہوئے چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ اس کا چچا زاد بھائی قاسم آ دھمکا۔ قاسم ان ہشیار آدمیوں میں سے تھا جو شارٹ کٹ کو بھی شارٹ کٹ کرنے سے نہیں چُوکتے۔ اس کے چہرے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بے حد حسّاس اور جذباتی

انسان ہے۔ لیکن قصور اس کے احساسات یا جذبات کا نہیں تھا، قصور اس کے جگر کا تھا جو ہمیشہ خراب رہتا تھا۔ قاسم، علی بابا کو ہمیشہ شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا اور رشک و حسد کرتا۔

علی بابا نے پوچھا: "اے جانِ برادر! یہ چہرے پر اداسی و پشیمانی کے آثار کیوں ہیں؟"

"پچھتا رہا ہوں۔"

"کس بات پر؟"

"ابھی کوئی ایسی بات تو نہیں ہوئی، البتہ مجھے ان دنوں فرصت ہے، سوچا کہ پیشگی پچھتا لوں۔"

"یا اخی، تھوڑی دیر گزری مَیں ایک مصیبت کے جنگل میں گرفتار ہو گیا تھا۔"

"ہاں مَیں نے بھی دیکھا تھا۔ تم اسے دیکھ رہے تھے اور وہ کہیں اور دیکھ رہی تھی۔"

اے برادرِ عزیز ایک بات پوچھوں؟

"اے برادرِ عبدالعزیز، ضرور پوچھیے۔" علی بابا بولا۔

"یہ عشق اکیلے ہی اکیلے؟ ہمیں اطلاع تک نہ دی۔"

"اس غلام کو معاف فرمائیے، اس بات کو از راہِ نوازشِ بزرگانہ بہت نہ بڑھائیے۔ خموشی اور پردہ پوشی ہی مقتضائے وقت اور قرینِ مصلحت ہے اور یہی خرد بین کی ہدایت ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"یعنی صبر کیجیے۔"

"کاش کہ مَیں منشی فاضل ہوتا تاکہ اسی قسم کی عبارت میں جواب دیتا۔ اے برادر میرا جی چاہتا ہے کہ تجھ سے اسی طرح پیش آؤں جیسے مولانا شیخ چلی ایک پہاڑی ریچھ کے ساتھ پیش آتے تھے۔"

"اور میرا ابھی ارادہ ہے کہ تجھ سے بعینہٖ وہ سلوک کروں جو نانا فرنویس نے ایک جنگلی کبوتر سے کیا تھا۔ مَیں مولانا شیخ چلی والا قصّہ ضرور سنتا۔ لیکن اس وقت مجھے بالکل فرصت نہیں۔"

"مجھے بھی نانا فرنویس والا قصّہ سننے سے معذور سمجھو، لیکن یہ بتاؤ کہ تم اکیلے اکیلے کیوں عاشق ہوتے ہو؟ مجھے جب کبھی اس قسم کا واقعہ پیش آیا مَیں نے ہمیشہ پہلے تم سے مشورہ لیا پھر واقعے کو پیش آنے دیا۔ کیا ہم دونوں ایک جیسے نہیں؟ تمہاری شکل بھی تو مجھ سے ملتی ہے۔"

"برادرِ مشفق۔ میری شکل تم سے اتنی نہیں ملتی جتنی تمہاری شکل مجھ سے ملتی ہے، یہاں تک کہ مَیں صبح صبح آئینے کی جگہ تمہاری تصویر رکھ کر شیو کیا کرتا ہوں۔"

"برادرِ من! صد حیف کہ تم نے ہمیشہ احسان فراموشی سے کام لیا۔"

"چہ خوب۔ احسان فراموش مَیں ہوں یا کوئی اور۔ چار مہینے کا ذکر ہے کہ گھڑ دوڑ اور برج میں ہار کر تم نے ابا جان کے حساب سے رقم نکلوائی مَیں جانتا تھا پھر بھی خاموش رہا۔ تین مہینے ہوتے تم بھنگ پی کر اتنے بدمست ہوئے کہ ایک عبادت گاہ میں جا کر دُعا مانگنے لگے۔ وہاں سے تمہیں کون اُٹھا کر لایا؟ مَیں! دو مہینے ہوئے جب تم نے خودکشی کا قصد کر کے ٹاؤن ہال کا رُخ کیا تب مَیں ہی تھا جو تمہیں سمجھا بجھا کر واپس لایا۔ پچھلے مہینے تمہیں کبوتر، کتے اور کالا سوٹ خریدنے کے لیے روپے کی ضرورت تھی وہ ——"

"ہاں ہاں وہ سب درست ہے، لیکن اس ماہ تم نے میرے لیے کیا کیا ہے؟"

"اچھا، اگر مَیں یہ کہوں کہ یہ عاشق ہونے کی اطلاع تمہیں غلط پہنچی ہے، تو پھر؟"

"تو پھر مَیں ہرگز یقین نہیں کروں گا —— مجھے معتبر نامہ نگار کی معرفت یہ خبر ملی ہے۔"

"تمہارے معتبر ذرائع بالکل غلط ہیں۔"

"سچ مچ؟"

"ہاں سچ مچ۔"

لیکن تیر نشانے پر بیٹھ چکا تھا۔ علی بابا گھائل ہو چکا تھا۔ آہستہ آہستہ بٹیر بازی، شعر و شاعری، سیاسیات، پتنگ بازی۔ غرضیکہ سارے مفید مشاغل ترک ہو گئے۔ دن کو اختر شماری ہوتی اور رات کو آہ و زاری۔ پہلے پہل تو اختر شماری میں دقت محسوس ہوئی پھر ایک دوست سے جو کالج میں ستاروں کا علم پڑھتا تھا، ایک آلہ لے آیا جس کی مدد سے ایک دو گھنٹے میں سارے ستاروں کا اندازہ لگا لیتا۔ ایک روز یونہی اسے خیال آیا کہ تارے اُتنے کے اُتنے ہیں، ہر مرتبہ میزان کرنے پر جواب تقریباً وہی آتا ہے۔ تب سے اس نے اختر شماری چھوڑ دی اور گولف کھیلنا شروع کر دیا۔

ایک رات اس نے پھر جانوروں کو مصروفِ گفتگو پایا۔ گدھا کہہ رہا تھا "یہ پڑوس میں جو علی بابا رہتا ہے، اس قدر آہ و بکا کرتا ہے کہ دن کو جاگنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

اونٹ بولا "بھائی صاحب۔ یار رایاری بود از یار یار اندیشہ کن۔ میرا تو بہت جی چاہتا ہے کہ کسی طرح اس جوانِ بزدل و نیم قد کے کام آؤں۔"

بیل کہنے لگا "حضرات! مَیں تو یہی کہوں گا کہ ایسے معاملوں میں ذرا سوشلسٹ بن جانا چاہیے۔ مَیں نے سُنا ہے کہ اس مہ لقا کے والد بڑے وسیع خیالات کے انسان ہیں۔ اگر یہ حاجی بابا۔"

"علی بابا۔" اونٹ نے لقمہ دیا۔

"معاف فرمائیے۔ اگر یہ علی بابا براہ راست ان سے ملے تو یقیناً اس کی مراد بر آئے گی۔"

علی بابا نے جو یہ مژدہ طرب انگیز سنا تو بکمال شاداں و فرحاں ہوا۔

اگلے روز جب سپیدۂ طلعت، نشانِ سحر نمودار ہُوا اور قلندرِ فلک کاسۂ خورشید لے کر گدائی کو نکلا۔ یعنی جب صبح ہوئی تو وہ سیدھا مرجانا کے ابا سے ملا اور عقد کا قصد ظاہر کیا (مرجانا سے)۔

وہ بولے "اے نوجوان! تجھے چار ابرُو کا صفایا کرانا منظور ہے یا منہ پر سیاہی لگوا کر گدھے کی سواری مرغوب ہے جو ایسی جسارت کا مرتکب ہوتا ہے؟"

علی بابا نے کمرِ ہمّت خوب کس کے باندھ رکھی تھی۔ اسے پیٹی چبھ بھی رہی تھی۔ کہنے لگا "گستاخی معاف، مرجانا لڑکی ہے۔ اسے آپ فریجیڈیئر میں بند کر کے رکھنے سے تو رہے کہیں نہ کہیں تو اس کی شادی ہو گی ہی۔ دن گزرتے جا رہے ہیں اور مرجانا کی عمر گھٹتی نہیں جا رہی۔"

بزرگ مارے غصّے کے کانپنے لگے۔ پہلے تو ویسے ہی کانپتے رہے۔ پھر باقاعدہ تھر تھر کانپنا شروع کر دیا۔ بولے "اے مردِ گستاخ پہلے یہ بتا کہ تو میرے پاس براہ راست کیوں آیا ہے۔ یہ کارروائی تو نے باقاعدہ اور باضابطہ کیوں نہیں کی جیسا کہ اس ملک میں رواج ہے۔ پہلے اپنے والدین سے کہا ہوتا، وہ مجھ سے درخواست کرتے۔ مَیں پہلے تو عارضی طور پر انکار کر دیتا۔ پھر درخواست پر غور کرتا۔ اگر انکار مقصود ہوتا تو کہہ دیتا کہ لڑکی کی عمر ابھی چھوٹی ہے۔ چند سال اور انتظار کرنے کا ارادہ ہے۔ اور اگر اقرار منظور ہوتا تو کافی عرصے تک تم لوگوں کو جھوٹے سچے وعدوں پر لگائے رکھتا۔ اچھی طرح خراب کر کے پھر ہاں کرتا۔"

"جناب بیاہ شادی کے معاملے میں صرف خواہش ظاہر کی جاتی ہے۔ اگر کوئی چھپے ہوئے فارم ہوتے ہوں تو دے دیجیے، بھر کے دستخط کر دوں گا، بلکہ ٹکٹ چپکا کر انگوٹھا لگا دوں گا۔"

اس مرتبہ جو بزرگ نے کانپنا شروع کیا ہے تو پہلے تھر تھر کانپتے رہے۔ پھر صرف کانپنے لگے۔ علی بابا اتنی دیر سگریٹ پیتا رہا۔ آخر بزرگ نے پوچھا "اچھا یہ بتا کہ تُو شادی کیوں کرنا چاہتا ہے؟ عشق وِشق کا ذکر ہرگز زبان پر مت لائیو۔"

"اس لیے کہ بچّوں کے بغیر زندگی نامکمل ہے۔ بچّے بڑھاپے کا سہارا ہوتے ہیں۔"

"اور بچّے بڑھاپا جلد از جلد لانے میں پوری مدد دیتے ہیں۔" بزرگ نے لقمہ دیا لیکن علی بابا نے کوئی لقمہ نہ لیا۔

"آپ مرجانا سے بھی تو پوچھیے۔"

"لڑکی سے پوچھنے کا میں قائل نہیں۔ یہ محبت وغیرہ کی تھیوری بہت پرانی ہو چکی ہے ان دنوں ملک میں لڑکیوں کی تربیت اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ صرف اسی سے محبت کرتی ہیں جس سے شادی ہونے کا امکان ہو۔ اور مرجانا تو بڑے ناز و نعم میں پلی ہے۔"

"جہاں تک میں جانتا ہوں سب والدین حسبِ توفیق لڑکیوں کو ناز و نعم میں پالتے ہیں۔ نہ صرف پالتے ہیں، بلکہ پوستے بھی ہیں۔"

"تمہاری آمدنی کیا ہے؟"

"جی میرے ابّا شہر کے سب سے مالدار آرمی کنٹریکٹر ہیں۔"

"یعنی فوجی ٹھیکیدار ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"مگر تم کیا کماتے ہو؟"

"بھلا میں ابھی کیا کما سکتا ہوں۔ ابھی تو میں جوان ہوں۔ سب نوجوان شروع میں ایسے ہی ہوتے ہیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ دولت بھی بڑھتی جاتی ہے۔"

"لیکن صاحب زادے، بہت سے نوجوان ایسے بھی ہوتے ہیں جو شروع میں جیسے تھے ہمیشہ ویسے ہی رہتے ہیں۔"

"قبلہ آپ بھولتے ہیں، ہمارے ہاں اس قدر دولت ہے کہ ہم کام کرنا عار سمجھتے ہیں۔ یہ دیکھیے میرے والد صاحب کے پاس اتنی جائداد ہے۔" اس نے جیب سے فہرست نکال کر ایک ایک چیز گنوادی۔

"تم نے اپنے والد کا نام کیا بتایا تھا؟" علی بابا نے دوبارہ نام بتایا۔ بزرگ اندر تشریف لے گئے اور ایک اور بزرگ خوش صفات خجستہ اوقات کو لے آئے۔

"تم سچ بول رہے ہو نا؟"

"جناب میں خدا کو واحد حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ بالکل سچ بول رہا ہوں۔"

"ذرا پھر سے پڑھنا وہ فہرست۔"

علی بابا پڑھتا جاتا تھا وہ نوٹ کرتے جاتے تھے۔ دونوں نے آپس میں کھسر پھسر کی، اس کے بعد پھسر کھسر کی۔ پھر کہنے لگے "خبردار۔ یعنی برخوردار! تمہارے ابّا بہت کم انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی نصف آمدنی بھی نہیں لکھوائی۔ اب ان سے پورا ٹیکس وصول کیا جائے گا۔ باقی رہے تم۔ سو پہلے اپنے آپ کو کسی قابل بنالو پھر درخواست کرنا۔" بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بزرگ انکم ٹیکس کے محکمے میں تھے۔

اگلے روز جب ظلمتِ شب رخصت ہو رہی تھی اور آفتاب شعاعوں کا تاج پہنے تختِ فلک پر جلوہ افروز ہونے ہی والا تھا کہ قاسم نے علی بابا کو آ پکڑا اور پوچھا۔ تم اس زہرہ جبیں کے ابّا سے ملنے گئے تھے؟ علی بابا نے انکار کیا، قاسم نے اصرار کیا۔ بحث نے طول پکڑا۔ آخر علی بابا کو یقین ہو گیا کہ ضرور کوئی مخبرِ بے ایمان ہے جو دس دس کی ایک ایک لگاتا ہے۔ بڑی دیر تک سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ گھر میں قلندر حبشی ہی ایسا مرد نامعقول ہے جس سے یہ توقع ہو سکتی ہے۔ سوچا کہ اگر والد بزرگوار کو خوش کر لوں تو نہ صرف شفقتِ پدرانہ سے مستفیض ہوں بلکہ منہ مانگا انعام پاؤں اور بعد ازیں اس بے ایمان قلندر حبشی کی ساری مستی و قلندری کافور کر دوں۔

والد کو خوش کرنے کا خیال پہلی مرتبہ اس کے دل میں آیا تھا۔ اُس نے اللہ کا نام لیا

اور والد کے لیے حقّے بھرنے شروع کر دیے۔ ہر آدھ گھنٹے کے بعد وہ چلم بھرتا حقّہ تازہ کرتا اور سامنے جا رکھتا۔ بعض اوقات تو وہ زبردستی حقّہ پلاتا۔ چند ہی دنوں میں اس نے حقّہ پلا پلا کر اپنے والد کو اس قدر تنگ کر دیا کہ وہ اس سے خوش ہو گئے اور بولے۔ "بول بچّہ کیا مانگتا ہے؟" اس نے مدعا ظاہر کیا اور قلندر حبشی اسے مل گیا۔

قلندر حبشی جنوبی ہند کا رہنے والا تھا اور بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ ایک حبشی کو ہونا چاہیے تھا۔ اگر اس کے کپڑوں کو سیاہی لگ جاتی تو لوگ سمجھتے کہ پسینہ آگیا ہوگا۔ بازار سے گزرتے وقت وہ اکثر چلاّتا "ہٹ جاؤ ورنہ کپڑے سیاہ ہو جائیں گے۔" اور لوگ دُور دُور ہٹ جاتے۔ وہ مطبخ میں کام کیا کرتا۔ کبھی کبھی اس سے باز پرس کی جاتی کہ دوپہر کو بھی وہی سالن ہوتا ہے اور شام کو بھی وہی۔ وہ کہتا کہ حضور ایک جیسا تو نہیں ہوتا۔ ایک دفعہ گوبھی گوشت ہوتا ہے اور دوسری دفعہ گوشت گوبھی۔

ایک دن نہایت ہی بوسیدہ اور فرسودہ مچھلیاں لایا جن کی بُو سے مجبور ہو کر کسی نے پوچھا کہ کیا مچھلیاں تازہ ہیں؟ تس پہ وہ مردِ سیاہ بولا۔ تازہ ہیں؟ (پھر مچھلیوں سے،) کم بختو بلومت، چپ چاپ پڑی رہو۔

اس نے علی بابا کو بتایا کہ اس کے دو بھائی ہیں۔ ایک ادیب ہے۔ دوسرا بھی بے کار ہے۔ علی بابا کو اس قسم کے انسان قطعاً اچھے نہیں لگتے تھے۔ ایک رات قوالی ہوئی۔ دو بج گئے۔ سب جمائیاں لے رہے تھے اور قوال تھا کہ خاموش ہونے میں نہ آتا تھا۔ قلندر حبشی نے یکایک ایک نعرہ لگایا اور مٹکنے لگا۔ سب سمجھے وجد میں آگیا ہے۔ پھر جھومتے جھومتے آہستہ آہستہ سرکتا ہوا قوال کے قریب ہوتا گیا۔ دیکھتے دیکھتے اس نے 'یاحق' کا نعرہ لگا کر ایسا دوہتڑ دیا قوال کے سینے پر کہ وہ قلابازی کھا گیا۔

ایک روز بغیر تخلیہ کیے وہ علی بابا سے یوں گویا ہوا۔ "اے میرے آقا! مَیں ایک شخص پر دعویٰ کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے میری ہتک کی ہے اور مجھے گینڈا کہا ہے۔"

"یہ کب کا ذکر ہے؟"

"پانچ سال کا ذکر ہے۔"

"تو اب تمہیں کیونکر خیال آگیا؟"

"آج مَیں نے پہلی مرتبہ چڑیا گھر میں گینڈے کو دیکھا ہے۔"

علی بابا اپنے بختِ نارسا کو کوسنے لگا کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا مصیبت مول لے لی۔

رات کو جانوروں نے باتیں شروع کیں۔ علی بابا دیر سے منتظر تھا۔ فوراً کھڑکی سے سر نکال کر سُننے لگا۔

گدھا کہہ رہا تھا۔ "اونٹ صاحب، ہم تو اسی انتظار میں ہیں کہ آپ کس کروٹ بیٹھتے ہیں۔"

لنگور بولا۔ "ایک مرتبہ ایک خدا رسیدہ بزرگ مجھ سے خوش ہو کر مجھے دعا کے زور سے انسان بنانے لگے تھے۔ مَیں نے ہاتھ جوڑ دیے اور معذرت چاہی کہ ان دنوں انسان ہونے سے تو مَیں لنگور ہی بہتر ہوں۔ آپ پہلے آدمیوں کو تو انسان بنائیے۔"

بیل لمبا سانس لے کر بولا۔ "آج مَیں تھک گیا ہوں۔ یہ کم بخت سٹیشن شہر سے اتنی دُور کیوں ہے؟"

"اس لیے کہ ریل والے چاہتے تھے کہ سٹیشن ریلوے لائن کے قریب ہی رہے۔"

"بھائی صاحب کوئی آپ بیتی سنائیے۔" اونٹ نے کہا۔

"پچھلے ہفتے میرا مالک مجھ پر سوار ہو کر شکار کھیلنے گیا۔" گھوڑا بولا۔ "اس کے ساتھ اس کا دوست تھا جو ایک اور گھوڑے پر سوار تھا۔"

"لیکن۔" لنگور نے بات کاٹی۔ مگر گھوڑے نے بات کٹنے نہ دی۔

"ہاں، تو ایک جگہ دیکھا کہ پولیس کا کنسٹیبل ہماری طرف آرہا ہے، شکار کا لائسنس دیکھنے۔ میرے مالک نے ایڑ لگائی۔ میں سرپٹ بھاگا۔ کانسٹیبل جو گھوڑے پر سوار تھا، اس نے تعاقب کیا۔ مشکلوں سے بڑی دیر کے بعد اُس نے میرے مالک کو آلیا اور لائسنس مانگا۔ میرے مالک نے لائسنس دکھایا۔ وہ بے حد متعجب ہوا اور بولا۔ اے مردِ دلیر اگر لائسنس جیب میں تھا تو پھر بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟ تس پر میرے آقا نے جواب دیا "میرے پاس تو ہے، لیکن میرے دوست کے پاس نہیں تھا۔"

ابھی گھوڑے نے بات پوری نہیں کی تھی کہ گدھا بولا "یہ قصہ میں نے پہلے کئی مرتبہ سنا ہے، لیجیے میں آپ کو اپنا خواب سناتا ہوں۔ رات میں نے خواب دیکھا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ ایک نہایت ملائم بستر بچھا ہوا ہے۔ میں نے شب خوابی کا لباس پہنا، دانتوں کو برش کیا، ریڈیو بند کیا اور روشنی بجھادی۔ آنکھ لگتے ہی مجھے خواب دکھائی دیا کہ پڑوس میں وہی علی بابا اپنے محبوب کی فرقت میں آہ و بکا کر رہا ہے۔"

"میں ایک بھینس کو جانتا ہوں جس کا نام فرقت ہے۔" لنگور نے پھر بےتکی بات کی۔

"آتے ہاتے۔" اونٹ نے آہِ سرد بھر کے کہا۔ "با سایہ ترا نمے پسندم۔ عشق است و ہزار بدگمانی۔ کاش کہ میں اس عاشقِ دلفگار و مردِ بیکار کی کچھ مدد کر سکتا۔ اگر وہ کہیں سُن رہا ہو، اور مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور سُن رہا ہے، تو اُسے چاہیے کہ فوراً ایک اعلیٰ درجے کی سیاسی تقریر لکھوالے، ایسی تقریر جو کسی پارٹی کی طرف سے کی جا سکے۔ ویسے اکثر سیاسی تقریریں ایسی ہی ہوتی ہیں کہ محض چند الفاظ کے ہیر پھیر سے وہ کہیں بھی کی جا سکتی ہیں۔ اس کے بعد اللہ مالک ہے۔"

یہ سُن کر علی بابا کا دل باغیچہ باغیچہ ہو گیا۔ اسی خوشی میں اس نے حمام کیا۔ عاشق ہونے کے بعد اس نے پہلی مرتبہ حمام کیا تھا۔ فواکہاتِ لذیذ نوش کیے۔ ایک چھوٹا پیگ چڑھایا اور قلندر حبشی کو ساتھ لیے تمباکو نوشی کرتا ہوا سیکنڈ شو دیکھنے چلا گیا۔ سینما ہال میں بچے

رو رہے تھے۔ حبشی بولا "حضور یہ اچھی پکچر کی پہلی نشانی ہے۔ پکچر جتنی اچھی ہوگی اتنے ہی زیادہ بچے روئیں گے۔"

سامنے کی قطار میں ایک صاحب بڑا سا ہیٹ پہنے بیٹھے تھے۔ حبشی نے کئی مرتبہ ان سے التجا کی لیکن انہوں نے ہیٹ نہ اتارا۔ آخر پوچھا کہ یہ ہیٹ کہاں سے لیا تھا اور کتنے کا لیا تھا؟ ذرا سی دیر میں قیمت طے کر کے حبشی نے ہیٹ خرید لیا اور پکچر کا حظ اٹھایا۔

علی بابا بہت مسرور تھا۔ واپسی پر وہ اپنے ایک دوست کو ساتھ لے آیا جو ایک روزانہ اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ سوچا کہ کچھ پینے پلانے کا شغل بھی ہوگا اور تقریر بھی مرتب ہو جائے گی۔ اس قسم کی سیاسی تقریر ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر کے سوا اور کون تخلیق کر سکتا ہے۔

جب قلندر حبشی شراب کی بوتلیں ٹھنڈی کرنے جا رہا تھا تو ایڈیٹر گویا ہوا "تمہارا ملازم پہلے کی نسبت سمجھ دار ہو گیا ہے۔"

"ایں؟" حبشی نے پیچھے مڑ کے کہا اور بوتلیں ہاتھ سے چھوڑ دیں۔ علی بابا نے اپنا اور ایڈیٹر کا سر پیٹ لیا۔ مجبوراً انہیں ٹھیکہ شراب ولیسی جانا پڑا۔ جہاں جلی الفاظ میں لکھا تھا "یہاں شرفا بیٹھ کے پی سکتے ہیں۔"

ہونا رات کا اور آنا نقاب پوشوں کا۔ باندھنا پٹی آنکھوں پر علی بابا کی۔ بتانا کہ لے جا رہے ہیں وہ اسے بیچ ایک جلسے کے، جہاں ہوں گی تقریریں۔

علی بابا ساتھ ہو لیا۔ سڑک پر پہنچ کر ایک نقاب پوش بولا "کھُل ٹم ٹم"۔ دھڑام سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ سب ایک موٹر میں بیٹھ گئے۔

"چل ٹم ٹم"۔ کوئی بولا۔ موٹر چل دی مگر اس طرح کہ جیسے زلزلہ آگیا کبھی علی بابا کے

کے پاؤں موٹر کی چھت سے ٹکراتے تو کبھی سر فرش سے لگتا۔ نقاب پوش راستے بھر کار کے متعلق باتیں کرتے رہے کہ یہ پچیس میل فی گیلن کرتی ہے۔ اس میں صرف ایک چیز تبدیل کرانی ہے۔ مڈگارڈ۔ اور پرزوں کے ڈبے میں ایک سکریو ڈرائیور ہونا چاہیے بس یہ ایک نقاب پوش جو کار کا مالک معلوم ہوتا تھا بولا میں نے پہلے ہی ایک ڈرائیور رکھا ہے اور ایک کلینر۔ یہ تیسرا اسکریو ڈرائیور میں ہرگز نہیں رکھ سکتا۔

علی بابا اپنے تئیں موٹر کو کوس رہا تھا۔ اس کے خیال میں یہ موٹر پچیس گیلن فی میل کرتی تھی اور اس میں دو چیزوں کو تبدیل کرنے کی سخت ضرورت تھی ـــ ایک انجن اور دوسری باڈی۔

ایک جگہ آواز آئی "ٹرک ٹم ٹم"۔ موٹر رک گئی اور علی بابا کی پٹی کھول دی گئی۔ سامنے عظیم الشان جلسہ ہو رہا تھا۔ علی بابا کو بھی موقعہ دیا گیا۔ اس نے جیب سے کاغذ نکالا اور وہ دھواں دھار تقریر کی کہ مجمع عش عش کر اٹھا اور دیر تک عش عش کرتا رہا۔ حالانکہ نہ اسے موضوع کا علم تھا، نہ یہ پتہ تھا کہ وہ کس پارٹی کی طرف سے بول رہا ہے۔ اس کی تقریر میں زندہ باد، مردہ باد اور مرادآباد بار بار آتے تھے۔ وہ بار بار کہتا تھا کہ فلاں چیز خطرے میں ہے فلاں چیز خطرے سے باہر ہے۔ تقریر کے اختتام پر لوگوں نے صرف تالیاں ہی نہیں بجائیں بلکہ ونس مور بھی کہا۔ صدر صاحب جو اچھے خاصے قبر رسیدہ بزرگ تھے بولے "ہم تجھ سے بہت خوش ہوئے۔ جب تیرا جی چاہے اپنے پڑوس کے گیراج میں چلا جائیو، وہاں تجھے یہی موٹر کھڑی ملے گی۔ وہی الفاظ دوہرائیو جو تو نے آتے وقت سنے ہیں پھر سٹارٹ کر کے سیدھا یہاں آجائیو۔ اگر جلسہ ہو رہا ہو تو تقریر کیجیو، ورنہ خالی پنڈال میں ریہرسل کر لیجیو۔ اچھا بول تو کیا مانگتا ہے؟"

علی بابا شرما کر بولا "میرے والد ٹھیکیدار ہیں اس لیے خدا کا دیا سب کچھ ہے۔"

"اچھا ہم تیری تین خواہشیں پوری کریں گے۔ اپنی پہلی خواہش بتا۔"

"جی پہلی خواہش یہ ہے کہ مجھے محبت میں کامیابی نصیب ہو اور میں کامرانی کے قدم چوموں۔"

"منظور ہے۔ اور بقیہ دو خواہشیں؟"

"وہ سوچ کر بتاؤں گا۔"

سب آپس میں بغلگیر ہو کر رخصت ہوئے۔ بعض تو غلطی سے آپس میں دو دو مرتبہ بغل گیر ہو گئے۔

واپسی میں نقاب پوش پھر علی بابا کی آنکھوں پر پٹی باندھنے لگے تھے کہ وہ چمک کر بولا۔ "اب پٹی کی کیا ضرورت ہے۔ اب تو میں یہاں اکثر آیا کروں گا۔ بلکہ آپ بھی اپنے نقاب اتار دیں۔"

آنا اگلے روز نقاب پوشوں کا بغیر نقاب کے اور لکھوانا عرضی علی بابا سے واسطے پروفیسری کے اور کروانا دستخط۔ آنا احکامات کا بعد چند دنوں کے اور مقرر کیا جانا علی بابا کا پروفیسر بیچ کالج لڑکیوں کے۔ شکر بجا لانا علی بابا کا۔

خدا کا کرنا کیا ہوا کہ جو کلاس علی بابا کو ملی اس میں چالیس لڑکیاں تھیں اور سب کی سب شرارتی اور شوخ و شنگ۔ وہ پہلی مرتبہ شرماتا جھجکتا کلاس روم میں داخل ہوا تو اس کی نظر مرجانا پر پڑی۔ وہ گلبن رعنائی، معشوقہ سیمیں بر، نونہالانِ چمن کو نہال اور جلووں سے دلوں کو پائمال کر رہی تھی۔ یہ نظارہ دیکھ کر اس پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ چکر پر چکر آنے لگا۔ افتاں و خیزاں، حیران و پریشان رہ کر ہوش میں آیا تو از بس خراب و خستہ، بیمار و افسردہ اپنے تئیں پایا۔

لڑکیاں تیار بیٹھی تھیں۔ علی بابا نے آیۃ الکرسی پڑھی اور اللہ کو یاد کرنے لگا۔

ایک لڑکی نے سوال کیا۔"پروفیسر صاحب بلاؤ اور اُودبلاؤ میں کیا فرق ہے؟"

"وہی جو بلّے اور باگڑ بلّے میں ہے۔" علی بابا نے جواب دیا۔

"پروفیسر صاحب عورتیں سال بھر کیا کرتی رہتی ہیں؟" ایک طرف سے آواز آئی۔

"نٹنگ کرتی رہتی ہیں۔"

"اور کالر کا ناپ لیتے وقت درزی کیا کرتا ہے؟"

"گردن ناپتا ہے۔"

"جناب ٹرین پکڑنے کا بہترین طریقہ کون سا ہے؟"

"یہی کہ اس سے پہلے کی ٹرین مِس کر دی جائے۔"

پھر لیکچر ہوا جس کے بعد علی بابا نے مرجانا سے ایک سوال پوچھا۔ وہ سب سے آخر میں بیٹھی تھی۔ بولی "میں اتنی دُور بیٹھی ہوں کہ اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے، میرے لیے کسی افواہ سے کم نہ تھا۔"

"تو یہاں آجاؤ۔ آئندہ سے میرے سامنے بیٹھا کرو۔ جلدی کرو میرے پاس صرف تیس منٹ ہیں۔"

مرجانا اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ گھڑی دیکھ کر بولا "میرے پاس صرف پون گھنٹہ ہے۔"

اگلے روز قاسم طیش میں بھرا ہوا آیا اور خوب آگ بگولا ہُوا کہ یہ پروفیسری بھی اکیلے ہی اکیلے، خاص طور پر جب مرجانا کے ہر روز درشن ہوا کریں گے۔ علی بابا نے لاکھ کوشش کی کہ اس کو کسی طرح ٹالے، کسی بہانے نکالے، مگر وہ خرانٹ گرگِ باراں دیدہ بلکہ تیرہ دیدہ تاڑ گیا اور بولا "آپ مجھے چکمے سے نکالا چاہتے ہیں۔ خواہ مخواہ ٹالا چاہتے ہیں۔ یہ خیال رکھنا مبادا کسی آفت میں مبتلا ہو جاؤ اور اس ضد کی سزا پاؤ۔"

اس قسم کی جلی بھُنی گفتگو کر کے وہ بغیر بغل گیر ہوتے رخصت ہوا۔ علی بابا نے تہیّہ کر لیا کہ اس نابکار حبشی کو ضرور نکال دوں گا اور نکالنے سے پہلے بدلہ لوں گا۔

علی الصبح اُٹھ کر کیا دیکھتا ہے کہ گلیوں میں شور مچا ہوا ہے۔ لوگ انگلیاں اٹھا رہے تھے۔ ایک کار دیوانہ وار اِدھر اُدھر گھوم رہی ہے۔ اس میں قاسم بیٹھا ہے۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ علی بابا فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ نزدیک جا کر چلّایا "یا برادر کہو کہ رُک ٹم ٹم۔ اور چابی نکال لو۔" قاسم کا یہ کہنا تھا کہ کار رُک گئی۔ معلوم ہوا کہ رات کو چوری چھُپے قاسم گیراج میں داخل ہوا۔ کھل ٹم ٹم کہہ کر کار میں جا بیٹھا۔ چل ٹم ٹم سے آگے کے الفاظ بھول گیا۔ مفت میں اپنی ہنسی اُڑوائی اور رات بھر خراب ہوا اور کار کا راز بھی افشا کر دیا کہ اس کی بریکیں خراب ہیں اور بجلی کے تار شارٹ ہیں۔

اس سانحہ کے بعد قاسم نے علی بابا کی جان عذاب میں ڈال دی۔ روز آ کر بیٹھ جاتا اور علی بابا کے بڑھیا سگریٹ پھونکنے لگتا۔ بار بار یہ فقرہ زبان پر لاتا کہ مجھے بھی پروفیسر لگوا دو۔ جب علی بابا کو سگرٹوں کے بے تحاشا خرچ کا احساس ہُوا تو وہ بزرگ قبر رسیدہ سے جا کر ملا اور اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے چند پتے لکھوائے اور فرمایا:

"یہ سب حضرات بارسوخ، وضیع و شریف اور اہلِ علم ہیں، ان میں ہر ایک ذی فہم و صاحبِ مذاق ہے۔ شرافت و اہلیت میں شہرہ آفاق ہے۔ بظاہر تو اس اتحاد و ارتباط میں کوئی عیب نہیں، یوں گو انسان عالم الغیب نہیں، قاسم خود جائے اور قسمت آزمائی کرے۔"

چنانچہ قاسم روانہ ہوا۔ سب سے پہلے وہ ایک رائے بہادر صاحب کے پاس گیا اور مدعا ظاہر کیا۔ وہ بولے "مَیں بورڈ کا ممبر نہیں ہوں، لیکن میرے چچیرے بھائی کی خلیری بہن کے خسر اس کام کو بخوبی کر سکیں گے۔ آپ ان سے ملیے اور میرا نام لے دیجیے۔"

قاسم ان سے ملا۔ کچھ تحفے تحائف بھی لے گیا۔ وہ بولے "اے مردِ معقول مَیں سفارش ضرور کروں گا، لیکن بورڈ کے صدر تک رسائی لازم ہے میرے ایک دوست سردار صاحب

جے سنگھ سے ان کے تعلقات ضرورت سے زیادہ خوشگوار ہیں، ان سے ملیو۔"

قاسم وہاں گیا۔ انہوں نے کہا "مَیں ذکر کر دوں گا لیکن خان صاحب چنگیز خاں نے صدر صاحب کے ساتھ بیس سال ملازمت کی ہے۔ اکثر دونوں لنگوٹ باندھ کر اکٹھے پھرا کرتے ہیں، یعنی لنگوٹیے دوست ہیں۔ اگر تم حاجی قطب الدین صاحب سے ملو تو وہ خان صاحب کو لکھ دیں گے کہ تمہیں صدر صاحب سے ملا دیں۔" قاسم حاجی صاحب سے ملا۔ وہ مسکرا کر بولے "جناب مَیں تو بیچارہ ایک حقیر انسان ہوں مَیں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔ آپ کسی سے ذکر مت کریں، ان دنوں ان سے میرے تعلقات بھی کشیدہ ہیں۔ غلطی ان کی تھی۔ یہ قصّہ کبھی پھر آپ کو بتاؤں گا۔ آپ صاحبِ صدر کے ہم گیسو یعنی میرا مطلب ہے ہم زلف سے کیوں نہیں ملتے؛ وہ بھی خان بہادر ہیں اور خانگی باتیں کرتے کرتے موقعہ پا کر ذکر کر دیں گے۔"

خوش قسمتی سے وہ صاحب بہت دور رہتے تھے۔ قاسم نے یک لیل و یک نہار ٹرین میں صرف کیے۔ علی الصبح نہاری کھا کر نکلا، لیکن دفعتہً اسے محسوس ہوا کہ وہ ان صاحب کا نام بھول گیا ہے کیونکہ ان دنوں اسے ہر روز کئی کئی نام اور پتے یاد کرنے پڑتے تھے۔

چنانچہ اس نے علی بابا کو تار دیا کہ خان بہادر صاحب کا پورا نام کیا ہے؛

علی بابا پہلے ہی تنگ آیا ہوا تھا۔ اس نے تار کا جواب تار سے دیا، لکھا "خان بہادر صاحب کا پورا نام خان بہادر بُلبُل نواز خاں ہے اور تمہارا پورا نام قاسم خاں ہے۔"

قصّہ طویل، قاسم کو دنیا بھر کی خوشامدیں کرنی پڑیں۔ ایسے ایسے عجیب و غریب انسانوں سے واسطہ پڑا کہ اس کی صحت اور دماغ پر بڑا ناخوشگوار اثر پڑا۔

پہلی جنوری کو اس نے اخبار خریدا۔ ویسے وہ اخبار خرید کر پڑھنے کا قائل نہیں تھا۔ اس روز صرف خطابات کی فہرست دیکھنے کی غرض سے اُس نے اپنا اصول توڑا۔ جو دیکھتا ہے تو علی بابا کا نام خان صاحبوں میں تھا۔ فوراً واپس پہنچا اور طیش میں آکر یوں گویا ہوا۔

"کیوں عزیز تم کو زندگانی پسند ہے یا مرگِ ناگہانی اور عالمِ جاودانی؟"

علی بابا نے جواب دیا "زندگی پر انسان عاشقِ زار ہوتا ہے۔ اجل کے نام سے حال زار ہوتا ہے۔"

الغرض قاسم نے علی بابا کو اس خود غرضی پر بہت ڈرایا دھمکایا کہ اب یہ خطاب بھی اکیلے ہی اکیلے لے لیا لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر قاسم آہِ گرم کھینچ کر بولا۔

"ملکِ خدا تنگ است ــ پائے گدا لنگ است"

تس پہ علی بابا نے ایک نئی فہرست بنا کر دی، جس میں نئے پتے درج تھے اور قسمت آزمائی کرنے کو کہا۔ سب سے پہلا نام صدر صاحب کے چچا کی بھانجی کے ماموں کا تھا اور دوسرا ان کے ماموں کی بھانجی کے چچا کا۔

چند ماہ بعد علی بابا کو اطلاع ملی کہ قاسم شفاخانۂ انسانات میں ہے۔ جا کر دیکھا تو اسے دماغی طور پر علیل پایا۔ یعنی بالفاظِ دیگر اس کا دماغ چل گیا تھا اور وہ ہر وقت زیرِ لب کچھ بڑبڑاتا رہتا تھا۔ بار بار وہ اس قسم کے الفاظ زبان پہ لاتا۔ سردار صاحب کی پوتی کے خسر کا بھائی بھائی کے خسر کی پوتی کے سردار صاحب۔ نواسی کی ساس کے بھائی کا سالا۔ سالے کے بھائی کی نواسی کی ساس۔ چچا کے خان بہادر کے چچا کے چچا۔ خان بہادر کے خان بہادر کے خان بہادر۔

بڑے طویل علاج کے بعد قاسم رُوبصحت ہُوا لیکن اس نے غسلِ صحت کرنے سے انکار کر دیا، کیونکہ اس دن سردی بہت تھی۔

ترس آنا علی بابا کو قاسم پہ، شامل کر لینا اس کو بیچ خواہش اپنی کے اور پانا مراد منہ مانگی علی بابا کا۔

دراصل علی بابا بڑی شاگردی سے کام لیتا تھا۔ پہلی اور دوسری خواہشیں مانگ کر تیسری

خواہش یہ مانگتا کہ تین خواہشیں اور منظور ہو جائیں۔ جب دو مزید خواہشیں پوری ہو جاتیں تو تیسری پر تین اور مانگ لیتا۔

چنانچہ قاسم ایڈیشنل آنریری سب اسسٹنٹ پروفیسر لگ گیا۔ لیکن اس گرلز کالج میں نہیں، ایک اور گرلز کالج میں۔ علی بابا احمق نہیں تھا۔

مہینے گزرتے گئے۔ پھر پہلی جنوری کو قاسم نے بادلِ نخواستہ اخبار خریدا۔ خطابات کی فہرست پڑھی تو آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ علی بابا خان بہادر ہو گیا تھا۔ اس مرتبہ قاسم نے آہنسا کے فلسفے سے کام لیا اور جاکر مبارکباد دی۔ پھر باتوں باتوں میں بڑی ملائمت سے پوچھا۔

"اے جانِ برادر! یہ خطاب آپ کو کیونکر مل جاتے ہیں؟"

علی بابا نے جواب دیا۔ "پتہ نہیں کیونکر مل جاتے ہیں، مَیں خود حیران ہوں۔"

"پھر بھی آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے۔"

"قسم ہے اس پروردگار کی کہ جس نے چرند پرند یہاں تک کہ درند تک کو قوتِ نشامہ بخشی، مجھے اس سلسلے میں کوئی علم نہیں ہے۔"

"پھر بھی، ذرا دماغ پر زور ڈالیے۔ آپ نے کچھ نہ کچھ تو کیا ہوگا۔"

"کوئی خاص کارنامہ تو نہیں کیا، البتہ۔"

"ہاں ہاں ــــ البتہ کیا؟"

"البتہ مَیں الیکشنوں میں ضرور حصّہ لیا کرتا ہوں۔"

"کس پارٹی کی طرف سے؟"

"مَیں کسی خاص پارٹی کا طرفدار نہیں۔ جو برسرِ اقتدار ہو، اس کے لیے کام کرتا ہوں۔ مَیں پارٹیاں بدلتا رہتا ہوں۔ وہ آپ نے نہیں سُنا؟ کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی۔"

قاسم بڑے عجز و انکسار کے ساتھ ملتجی ہوا کہ اسے بھی سیاست سے دلچسپی ہے اس لیے اسے بھی موقعہ دیا جائے۔ علی بابا پھر چچازاد بھائی تھا۔ محبتِ برادرانہ نے جوش مارا۔ اگلے جلسے میں وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا اور اسی ایڈیٹر سے ایک تقریر لکھوا کر پڑھوا دی۔ بزرگ قبر رسیدہ بڑے خوش ہوئے۔ بولے "بول کیا مانگتا ہے؟"

"تین خواہشوں کی تکمیل۔" قاسم نے فوراً جواب دیا۔

"منظور ہے! پہلی خواہش بتا۔"

قاسم بوکھلا گیا۔ وہ اس خوشخبری کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر جیب پر ہاتھ مار کر بولا "ایک روپے کی ریزگاری عنایت فرمائیے۔"

بزرگ نے اظہارِ تاسّف کرتے ہوئے کہا "نوجوان ان دنوں ریزگاری کہاں؟ کچھ اور مانگ۔"

"تو پھر ایک ماچس عطا فرمائیے۔"

"اے مردِ دلیر مجھے آزمائش میں مت ڈال۔ ہیرے مانگ جواہر مانگ، مگر ایسی نایاب اور کمیاب چیزیں مت مانگ، اور پھر جنگ کے دنوں میں جبکہ سُنا جاتا ہے کہ کوئلے کی کمی کی وجہ سے دوزخ بھی عارضی طور پر بند کر دی گئی ہے۔ اچھا مَیں ماچس کے لیے بلیک مارکٹ سے کوشش کروں گا۔ اپنی دوسری خواہش بیان کر۔"

"یا بزرگِ مشفق مجھے تھوڑا سا خالص گھی درکار ہے۔ مدّتوں سے نہیں چکھا۔ بناسپتی کھا کھا کر تنگ آچکا ہوں۔"

"اور اگر میں یہ کہوں کہ یہ شے عنقا ہے تو پھر؟"

"تو پھر بے لاگ اور حقیقی محبت درکار ہے۔"

"اے نوجوان تو نے وہ شعر نہیں سُنا؟ ؎

محبت بے لگاوٹ اور خالص مِل نہیں سکتی
جہاں میں آج کل یہ چیز بھی گھی ہوتی جاتی ہے

اب تیسری خواہش زبان پر لا۔"

اس پر مارنا آنکھ علی بابا کا اور کرنا اشارہ قاسم کو۔ بھانپ لینا قاسم کا اور کرنا احتراز تیسری خواہش سے۔ رخصت ہونا بزرگ قبر رسیدہ سے بلا بغل گیر ہوئے۔

قاسم نے علی بابا کے ساتھ بڑے جوش و خروش کے ساتھ سیاسی کام شروع کر دیا۔ علی بابا زیادہ کام قاسم سے کرواتا۔ دن گزرتے گئے۔ پھر علی بابا نے ایک انجنیئر دوست کی مدد سے گھر کے ریڈیو میں ایک چیز کا اضافہ کرا لیا۔ اس خوبی سے ایک چھوٹا سا لاؤڈ سپیکر اندر چھپایا اور ایسے کنکشن لگائے کہ جب چاہتا دوسرے کمرے سے ریڈیو کی خبروں میں کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ کر دیتا۔ ریڈیو کا کنکشن بند کر کے لاؤڈ سپیکر کا کنکشن جوڑ لیتا اور خود بولتا۔ اس انداز سے کہ بالکل ریڈیو کی خبریں معلوم ہوتیں۔ ہفتے میں ایک دو مرتبہ وہ پیچھا چھڑانے کی غرض سے قاسم کی ریڈیو پر تعریف کر دیتا اور قاسم بالکل مطمئن تھا۔

ایک روز علی بابا کو شک گزرا۔ قلندر حبشی ریڈیو کا طواف کر رہا تھا۔ وجہ پوچھی تو حبشی موصوف گویا ہوا کہ وہ ان دنوں طبلہ سیکھ رہا ہے۔ چونکہ کوئی موزوں استاد نہیں مل سکا اس لیے اپنی طبلوں کی جوڑی کو ریڈیو کی موسیقی سے ہم آہنگ کرنے میں مشغول رہتا ہے۔

لیکن جس بات کا خدشہ تھا وہی ہو کر رہی۔ رات کو دونوں بھائی ریڈیو پر ریکارڈ سن رہے تھے۔ ایک ریکارڈ ختم ہوا تو آواز آئی "یہ ریکارڈ خوب تھا، اسے پھر سنیئے۔" ریکارڈ پھر بجا۔ پھر آواز آئی "سبحان اللہ کیا لاجواب ریکارڈ ہے۔ جی چاہتا ہے اسے ایک بار اور بجایا جائے۔"

دونوں بھائی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ جب ریکارڈ چوتھی مرتبہ بجنے لگا تو قاسم سے نہ رہا گیا۔ اس نے پہلے تو ریڈیو کا معائنہ کیا پھر لاؤڈ سپیکر کا کنکشن دیکھ کر حبشی کو جا پکڑا جو دوسرے کمرے میں گراموفون لیے بیٹھا تھا۔ اس نے حبشی کو تو کچھ نہ کہا۔ چچا زاد بھائی پر برس پڑا اور علی بابا کو اقبالِ جرم کرنا پڑا۔

شام کو علی بابا کا ایڈیٹر دوست آیا تو اسے سارا واقعہ سنایا۔ وہ کہنے لگا کہ تم نے اس مردود

کو خواہ مخواہ سر چڑھا رکھا ہے۔ نکال کر ایک طرف کرو کم بخت کو۔

علی بابا بولا "میں اس سے بدلہ لے رہا ہوں، بس تھوڑے سے دن اور رہ گئے ہیں۔"

اتنے میں حبشی آ گیا اور ہنسنے لگا "جناب آج میں نے صبح سے جو پینا شروع کی ہے تو اب تک پیتا رہا ہوں۔ صبح خود پی۔ دوپہر ایک دوست نے پلائی۔ سہ پہر کو مفت مل گئی۔ شام کو پینے گیا تو۔"

"دیسی تھی یا انگریزی؟"

"لسّی تھی، دہی کی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔"

علی بابا نے پہلے سگریٹ مانگے، پھر بولا "اچھا تم رہنے دو میں خود لے لوں گا۔" اور اُٹھ کر لے لیے۔ تھوڑی دیر کے بعد پانی مانگا، ابھی حبشی اٹھا نہیں تھا کہ علی بابا نے جلدی سے کہا۔ "چلو رہنے دو، ناحق تکلیف ہو گی تمہیں۔ میں خود اُٹھ کر پیے لیتا ہوں۔" غرضیکہ کئی مرتبہ اسی طرح ہوا۔ یعنی علی بابا پہلے اسے کام بتاتا، پھر خود ہی وہ کام کر لیتا۔

ایڈیٹر تخلیہ پا کر بولا "اے دوستِ صادق، یارِ غار یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا اسی طرح بدلہ لیا جاتا ہے؟"

علی بابا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "سال بھر سے اسی طرح ہو رہا ہے۔ میں نے اس ناہنجار کی عادتیں اس قدر خراب کر دی ہیں، اسے اس قدر کاہل اور گستاخ بنا دیا ہے کہ اب یہ ہمیشہ کے لیے بیکار ہو گیا ہے۔ اب یہ عمر بھر کہیں بھی ملازمت نہیں کر سکتا۔ کیا یہ بدلہ نہیں؟"

مدتوں تک قاسم سیاسی کام کرتا رہا اور ہر پہلی جنوری کو اخبار خرید کر پڑھتا رہا لیکن غنچۂ امید نہ کھلا اور اسے کچھ نہ ملا۔ آخر کو پیمانۂ صبر لبریز ہوا اور وہ علی بابا سے مل کر نغمہ ریز ہوا۔

"اے برادر میں نے بہت دنوں سے نہ شکوہ کیا ہے نہ شکایت۔ تجھے خان بہادری کے بعد ممبر آف جی پی اد کا خطاب ملا تو میں خاموش رہا۔ تجھے آرڈر آف پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا تمغہ ملا اور میں نے کچھ نہ کہا — اب میں سنتا ہوں کہ تو SIR بننے والا ہے۔ اِدھر میں ہوں کہ ابھی تک خان بہادر تک نہیں بن سکا۔"

"یا برادر تجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ بزرگِ قبر رسیدہ نے تیرے لیے خان صاحب کے خطاب کی سفارش کرادی ہے۔"

"خان صاحب بھی کوئی خطاب ہے؛ قاسم خاں صاحب تو میں پہلے ہی ہوں۔ کچھ اور ملنا چاہیئے۔"

"اچھا، تو پھر بہادر خان کا خطاب دلوا دوں؟"

"نہیں خان بہادر کا خطاب مطلوب ہے۔"

"بہادر خان اور خان بہادر میں کیا فرق ہے؟"

"اچھا یوں کرو کہ تم بھی اپنے خطاب لوٹا دو۔ میں بھی خان صاحبی سے انکار کردوں گا۔"

"میں اپنے خطاب محض اس لیے کیوں لوٹاؤں کہ تمہیں کوئی خطاب نہیں مل سکا — خصوصاً جب مجھے سَر بننے کی امید ہے۔ رہ گیا خان صاحب کا خطاب، سو تم اپنے نام کو خان صاحب قاسم خان صاحب کی بجائے یوں لکھ لیا کرنا "قاسم × خان صاحب × خان صاحب = قاسم (خان صاحب)^2 —"

اس پر قاسم بڑا خوش ہوا اور بغلیں بجاتا ہوا لوٹا۔

اگلے جلسے میں بزرگِ قبر رسیدہ نے علی بابا سے محبت میں کامیابی کے متعلق سرسری طور پر ذکر کیا۔ اُس نے جواب دیا کہ یا پیر و مرشد ابھی تک شادی تو ہوئی نہیں۔

"محبت میں کامیابی اور چیز ہے اور شادی اور چیز۔ اگر شادی منظور ہے تو صاف

صاف بیان کر۔"

اس رات کو علی بابا کا بڑا جی چاہا کہ کسی طرح پڑوس کے جانور اس کے متعلق باتیں کریں لیکن ان میں چند خود پسند جانوروں کا اضافہ ہو گیا تھا جو سوائے اپنے اور کسی کا ذکر ہی نہیں کرتے تھے۔ البتہ بیل نے باتوں باتوں میں مختصراً کہا کہ کلب میں ٹینس ٹورنمنٹ ہونے والا ہے جس میں مرجانا بھی کھیلے گی۔

علی بابا کو ٹینس کا بلّا تک پکڑنا نہ آتا تھا لیکن اس نے اپنا نام دے دیا اور خواہش کی کہ کسی طرح مرجانا کا پارٹنر بن کر فائنلز تک پہنچ جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ کبھی مخالف بیمار ہو گئے۔ کبھی وہ وقت پر نہ پہنچ سکے۔ کبھی کسی کے پاؤں میں موچ آگئی۔ غرضیکہ وہ دونوں فائنلز میں پہنچ گئے۔ اب ایک بہت بڑے ہجوم کے سامنے آخری میچ ہونے والا تھا جسے دیکھنے مرجانا کے والدین بھی آرہے تھے اور چند ایسے معزز حضرات بھی جو علی بابا کو سَر بنوانے میں مدد دے سکتے تھے۔

علی بابا اور چالیس لڑکیوں نے ایک خاص پروگرام بنایا۔ میچ سے پہلے چائے کا انتظام کیا گیا تھا۔ چالیس کی چالیس لڑکیاں خوب بن سنور کر آئیں، بڑی زرق برق پوشاک پہن کر۔ ہر میز پر ایک لڑکی بٹھائی گئی تاکہ آس پاس بیٹھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ رکھے۔ بعد میں رقص کرنا ایک لڑکی کا، اور کرنا نغمہ سرائی علی بابا کا۔ اور گانا چھایا نٹ، بول شروع کے تھے جس کے۔ جھَن جھَن جھَن جھَن پائل موری باجے۔ بُت بن جانا ہجوم کا۔ داؤ کھیل جانا لڑکیوں کا اور ملانا بھنگ کا چار کی پیالیوں میں۔

کچھ دیر کے بعد قلندر حبشی گلا توڑ مروڑ کے ایک مدراسی نغمہ گانے لگا جس پر ایک لڑکی مدراسی رقص کرنے لگی۔ سب ان کی طرف دیکھنے لگے اور پیالیوں میں مزید بھنگ ڈالی گئی۔

کچھ دیر میں مجمعے پر نشے کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔ کوئی کچھ ہانک رہا تھا کوئی کچھ۔ اور اس قسم کی آوازیں آنے لگیں۔

"دہلے پر آپ نے نہلا کیوں ڈالا ہے؟"

"آپ کا دل کیوں ڈہلا جاتا ہے؟"

"ہماری شادی ہونے والی ہے۔"

"تم سب کی؟"

"چھٹی سے واپس آتے وقت ٹرین میں ایک عجیب انسان سے واسطہ پڑا۔ صبح وہ آہیں بھر رہا تھا۔ دوپہر کو بسورنے لگا۔ رات کو تو زار و قطار رو رہا تھا۔ مَیں نے وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا کہ مَیں روؤں نہ تو اور کیا کروں؟ مجھ جیسا بدنصیب تو زمانے میں نہ ہوگا۔ مَیں کل شام سے غلط ٹرین میں ہوں، جو وہاں ہرگز نہیں جائے گی جہاں مَیں جانا چاہتا ہوں۔"

"خاموش! خاموش! اب ٹورنمنٹ کے سیکرٹری ایڈریس پڑھ کر سنائیں گے۔"

"خواتین و حضرات! میرا ایڈریس یہ ہے۔ نمبر پانچ زیبرا روڈ۔ ہاتھی محلہ۔"

جب لوگ اور بھی الٹی سیدھی ہانکنے لگے تو علی بابا نے اشارہ کیا اور میچ شروع ہوا۔ مخالف بھی بھنگ کی کافی مقدار پی چکے تھے، وہ اتنی بُری طرح کھیلے کہ علی بابا اور مرجانا میچ مجبوراً جیت گئے۔ علی بابا نے فوٹوگرافر کو آنکھ ماری جو اس کے نہیں لگی۔ پھر باقاعدہ اشارہ کیا گیا، تب وہ کیمرہ سنبھالے ہجوم سے نکلا۔ علی بابا اور مرجانا کو اکٹھے کھڑا کر کے بہت سی تصویریں کھینچی گئیں۔

تخلیہ پا کر علی بابا نے پری پیکر کی جانب مخاطب ہو کر دست بستہ عرض کی: "اے شاہ خوباں جہاں مَیں علی بابا ہوں، اور تیرے حسن و جمال کا اس درجہ دلدادہ ہوں کہ خودکشی پر آمادہ ہوں۔ تیرے لیے اس قدر خراب و خوار ہوا کہ ہر نعمت سے دست بردار ہوا۔ اب اگر تم میرے حالِ زار پر رحم کھاؤ تو زیادہ نہ ترساؤ اور مجھے درم ناخریدہ غلام بناؤ۔"

بس پہ مرجانا نے مسکرا کر کہا۔ "اچھا سوچیں گے۔"

اگلے روز اخباروں میں ان دونوں کی یک جا کھنچی ہوئی تصویریں چھپیں۔ نیچے لکھا تھا۔ مکسڈ فائنلز کے جیتنے والے، جو ایک دوسرے کے کزن بھی ہیں۔

اس کے بعد رسالوں میں بھی تصویریں نکلیں۔ یہ چال کامیاب رہی اور خوب پبلسٹی ہوئی۔

مرجانا کے والد نے علی بابا کو بلا کر بہت دھمکایا چمکایا، لیکن وہ بولا۔ مَیں بندۂ شاطر ہوں، یہ نہیں چاہتا کہ بارِ خاطر ہوں۔ بہتری اسی میں ہے کہ ضد سے باز آئیے اور مان جائیے۔"

آخر انہوں نے سر ہلا دیا اور بولے۔ "لیکن شادی کا پیغام باقاعدہ اور باضابطہ مجھے پہنچنا چاہیے اور درخواست تمہارے والدین کی طرف سے ہونی چاہیے۔"

اگلے ہفتے دونوں کی منگنی ہو گئی۔

یہ خبر بجلی کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی کہ علی بابا نے قلندر حبشی کو نکال دیا ہے۔

دوست احباب آ آ کر علی بابا سے بازپرس کرنے لگے کہ یہ حرکت کیوں کی؟

"کیا وہ رفیقِ دیرینہ نافرماں بردار تھا؟ کیا وہ دروغ گو تھا؟"

"نہیں۔"

"کیا وہ گستاخ تھا؟ کیا وہ چور تھا؟"

"نہیں۔"

"تو پھر اسے نکالا کیوں؟"

علی بابا نے اپنا بوٹ اتار کر دوستوں کو دکھایا اور پوچھا۔ "یہ بوٹ بھدّا ہے یا اس کی ساخت خراب ہے؟"

"نہیں تو۔"

"کیا یہ کہیں سے پھٹا ہوا ہے؟"

"نہیں۔"

"کیا اس میں کوئی اور نقص نظر آتا ہے؟"

"نہیں۔"

"لیکن یہ صرف مجھ ہی کو علم ہے کہ یہ مجھے کہاں چبھتا ہے۔"

پھر قاسم نے بڑی غلطی کی۔ چند ترقی پسند شاعروں سے مل کر مرجانا پر آزاد نظمیں رسالوں میں چھپوانی شروع کر دیں اور مرجانا کو خط بھی لکھے جو اس نے ملک کی دیرینہ روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے والد کو پیش کر دیے۔ وہ بے حد خفا ہوئے اور قاسم کو فون کیا۔ گویا ہوئے: "اے بزدل نوجوان یہ کیا بیہودگی ہے کہ چُپ چُپ کر رُسوا کرتا ہے، اگر ہمّت ہے تو سامنے آ کر بات کر۔ اور یہ کہ مجھے آزاد نظموں سے سخت نفرت ہے تو غزلیں کیوں نہیں لکھواتا؟"

علی بابا نے بھی کہا: "اے برادر! اب تو ہم دونوں کی منگنی ہو چکی ہے۔ اب تو یہ کیا کر رہا ہے؟"

قاسم بولا: "اے برادر زیادہ سے زیادہ وہ تمہاری منگیتر ہی ہے نا! لیکن اس سے میرا جوش کم نہیں ہو سکتا۔"

قاسم نے تیسری خواہش یوں بیان کی کہ مرجانا اس کے خطوط کا جواب دے۔ چنانچہ اسے مرجانا کا خط ملا جس میں لکھا تھا کہ میری تو منگنی ہو چکی ہے، اب میری چھوٹی بہن کی باری ہے۔ لہٰذا میں نے آپ کے خطوط چھوٹی بہن کو دے دیے ہیں اور اس سلسلے میں مزید خط و کتابت براہ راست اسی سے کی جائے۔

قاسم نے چھوٹی بہن کو لکھنا شروع کر دیا۔ پہلے خط میں تصویر کے لیے لکھا — جواب آیا تو اس میں ایک تصویر بھی تھی۔ ایک خاتون نے سیاہ رنگ کا خوشنما برقعہ پہن رکھا تھا۔ غالباً چاند جیسا چہرہ مکمل طور پر برقعے میں چھپا ہوا تھا۔ ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ میں دسویں کا امتحان دے رہی ہوں اس لیے لازمی طور پر پردہ کرنا پڑتا ہے۔ کوئی دنوں کی بات ہے۔ کالج پہنچتے ہی پردہ وردہ ایک طرف ہو گا۔

اس پر قاسم بڑا مایوس ہوا اور بزرگ قبر رسیدہ سے فریادی ہوا۔ انہوں نے ترس کھاتے ہوئے رعایتاً ایک اور خواہش طلب کرنے کی منظوری دے دی۔

علی بابا قاسم سے ملا اور بولا: "اے برادر! تو نے دوسری بہن کو دیکھا تک نہیں اور

عاشق یونہی ہو گیا۔"

"اے برادر! اب مجھے عشق نہیں، ضد ہے۔"

"تو پھر کسی امپیریل سروس میں آ جا۔ کل میں تیرے لیے اس کے ابا سے ملا تھا انہوں نے فرمایا کہ شادی کے لیے صرف یہی ایک شرط ہے۔ یعنی امپیریل سروس!"

قاسم کی آخری خواہش باقی تھی۔ اس نے امپیریل سروس مانگی اور بزرگ نے وعدہ فرمایا۔

چند دنوں کے بعد اخباروں میں نکلا کہ ساری امپیریل سروسز ختم کر دی گئی ہیں۔

قاسم کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

جوں جوں شادی کی تاریخ نزدیک آتی جاتی تھی، علی بابا اور مرجانا کے والدین کے درمیان اختلاف بڑھتا جاتا تھا۔ وہ مہر زیادہ لکھوانا چاہتے تھے۔ علی بابا کہتا تھا کہ آپ جتنا مہر زیادہ لکھوائیں گے اتنا ہی آپ کو شادی کے نیک انجام پر شبہ ہو گا۔ اگر آپ کو مجھ پر بھروسہ ہے تو کچھ مت لکھوائیے۔ بلکہ کچھ مجھے ہی عطا فرمائیے۔

لیکن وہ باز نہ آئے، ادھر علی بابا بھی باز نہ آیا۔

علی بابا نے دعوتی رقعوں پر بھی اعتراض کیا کہ ان کی عبارت ایسی عجیب و غریب تھی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ کہاں ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟ اور جسے رقعہ بھیجا جا رہا ہے وہ کیا کرے؟ یہ دعوت نامہ کچھ یوں شروع ہوتا تھا۔

ھُوالشافی

ع الٰہی غنچۂ اُمید بکشا

ع للّٰہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آمد آخر زپسِ پردۂ تقدیر پدید

اور ختم اس فقرے پر ہوتا ہے۔ سردی کے موسم کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ازراہِ کرم

اپنا بستر ہمراہ لائیں اور اگر ہو سکے تو اپنا ملازم اور راشن کارڈ بھی۔

علی بابا اور ہونے والے خسر کا آپس میں کافی لڑائی جھگڑا ہوا۔ ستیہ گرہ ہوئی۔ علی بابا کی طرف سے بھوک ہڑتال ہوئی اور سول نافرمانی کی گئی۔ پھر مطالبات پیش کئے گئے آخرکار طے ہوا کہ بجائے CIVIL MARRIAGE کے سول اینڈ ملٹری میرج کی جائے۔

قاسم ہر روز بلاناغہ اپنے سینے پر مونگ دلتا۔ وہ اب تک خان صاحب بننے کی اُمید پر زندہ تھا۔ اس نے دفتر والوں سے مل ملا کر پتہ چلا لیا تھا کہ اس کا خطاب منظور ہو چکا ہے۔ ایک ایک دن گن گن کر اکتیس دسمبر آیا۔۔۔ اور پھر پہلی جنوری۔

اس نے علی الصبح اخبار خریدا۔ جو پڑھتا ہے تو سر پر رنج والم کا پہاڑ بلکہ سارا سلسلۂ کوہ ٹوٹ پڑا۔ حکومت نے اعلان کیا تھا کہ خان بہادر اور خان صاحب وغیرہ کی قسم کے سب خطابات ختم کر دیے گئے ہیں اور آئندہ اس قسم کی کوئی چیز نہیں ملا کرے گی۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ جانوروں نے علی بابا پر کون سے مزید تبصرے کیے؟ کیا قاسم مرجانا کی تیسری بہن سے شادی کرنے میں کامیاب ہو سکا؟ کیا علی بابا اور مسز علی بابا سَر اور لیڈی علی بابا بن سکے؟

اس کا ذکر کبھی آئندہ سرمۂ چشم نظارہ گیاں با تمکین ہو گا۔ ہر سخن سنج ذی فہم اس کا شائق ہو گا اور یہ کلام بلاغت نظام پسندیدۂ خلائق ہو گا۔ عجب دل کش و دل آویز تحریر و تقریر ہو گی جو اپنی خوبیوں میں اپنی آپ ہی نظیر ہو گی کہ اب تک چشمِ فلک نے باایں پیرانہ سالی عینکِ مہر و ماہ لگا کر بھی نہ دیکھی ہو گی۔ زیادہ مدحت طرازی فضول ہے۔ خود ستائی پر محمول ہے۔ ع

حاجتِ مشاطہ نیست روئے دلآرام را

❖